

# تیرے نام کی شہرت

سنا زبیر چودھری



Chand



فہرست

3	تیرے نام کی شہرت
79	میں نے شام ہاری ہے
159	چلو زندگی کو محبت بنا دیں
205	دل ٹھہر جانے کا موسم

## تیرے نام کی شہرت

### جملہ حقوق محفوظ ہیں

”نئے کپڑے پہن کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے!  
 ادھی کس کے لیے  
 ہاں جی کس کے لیے

بار اول ..... 2007ء

ناشرین ..... خواتین ڈائجسٹ

پرنٹ لائن ..... پرنٹ لائن

قیمت ..... ~~100~~

سول ایجنٹ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی

”ہینا! اوہنا۔ اللہ کی بندی کبھی تو پہلی آواز پر بھی سن لیا کر۔“

دادی ماں جب بیرونی دروازہ بجا بجا کر ہار گئیں تو اونچی آواز میں پکارنے لگی تھیں۔ وہ جو  
 برآمدے اور صحن کو ڈھیروں پانی سے بھگوئے خود بھی تر بہر نہایت تندہی سے واپس کے ساتھ جتی ہوئی تھی  
 دادی کی پکار پر اپنے سر تال کا گلابا کر باہر کے دروازے کی طرف لگی۔

”ارے دادی بیل بجا دیتیں۔۔ اب میں مصروف تھی کیسے سنتی۔“ دروازہ کھول کر دادی کے ہاتھ  
 سے سبزی اور فروٹ کے تھیلے لیتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی تاک چڑھا کر۔

’موٹی بکلی جھٹی ہوئی ہے۔ نیکل کہاں سے بچے گی۔ ہائے ہائے‘ سانس پھول گیا بری طرح۔“  
دادی ماں تھک کر باہر بچے تخت پر بے دم سی ہو کر گر گئی تھیں۔ وہ سبزی کے تھیلے کچن میں رکھ کر ان کے لیے پانی کا گلاس لے آئی۔

”یہ تو نے کیا“ ہلڑ“ چایا ہوا ہے ادھر ادھر۔“ دادی یہاں وہاں بکھرے پانی پر نظر کرتے ہوئے ناک سکیڑ کر بولی تھیں۔

”صفائی سترائی کر رہی تھی۔“ اس نے بڑے ناز اور فخر سے بتایا۔ ”آپ کو جو شکایت رہتی ہے کہ گھر کا دھیان نہیں رکھتی۔ میں نے سوچا‘ آج چھٹی ہے‘ چلو آپ کو خوش ہی کر لیتے ہیں۔“ وہ لاڈ سے دادی کی گود میں مٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”چل پرے ہٹ بڑی آئی دادی کی ہمدرد۔“ دادی نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔ ”اتنا خیال ہے دادی کا تو بات کیوں نہ مان لیتی۔“

”کون سی والی بات شادی والی!“ اس نے سراٹھا کر نہایت معصومیت سے پوچھا تھا۔ پھر دادی کی متوقع ”جوابی کارروائی“ یعنی دو ہنڑ سے بچنے کے لیے بہ سرعت پھلانگ لگا کر پرے ہٹ گئی تھی۔

”ہاں“ جیسے پہلے تو ساری باتیں مان لی ہیں جو یہ مان لے گی۔ ارے وہ تو شاید تو نے ضد لگا رکھی ہے کہ تب ہی کرے گی جب دادی منوں مٹی تلے سو جائے گی۔ میں تو نوکری کا کہہ رہی تھی۔ بھلا کیا رکھا ہے اس میں سارا دن مغز کھپائی کرو اتنی مصیبت کر کے آؤ جاؤ۔ اچھا بھلا گزارا تو ہو رہا ہے گھر بیٹھے ہم کون سا کوئی دس بیس کا کنبہ ہیں۔ ایک تو ہے یا میں ہوں۔ دونوں کے لیے بہتر ہے جو تمہارے مرحوم باپ نے چھوڑ رکھا ہے۔“

”کہاں بہتر ہے دادی پیاری۔“ اس نے منہ لٹکایا۔ ”اگر ہوتا تو میں ٹھاٹھ سے گاڑی کی مالک ہوتی۔ برائنڈیو گاڑی کی آبا کیا شان ہوتی ہے بھی۔ ذاتی گاڑی چلانے کا تو مزہ ہی اور ہے۔“ ارے

نے نہایت حسرت و یاس اور اشتیاق کے طے جملے عالم میں کہا۔ پھر ایک دم پر جوش ہو کر بولی۔ ”بس پھر جو آپ کہیں جس طرح کہیں گی اسی طرح شریف بیبیوں کی طرح کیا کروں گی۔“

”لو سنو ذرا اس کی باتیں۔“ دادی پوچھے منہ سے ہنس نہیں۔ ”بھلا ساری زندگی تو کسی شے کی حرص کی نہیں اور اب اگر دل چلا ہے تو وہ بھی گاڑی کے لیے۔“

”اوہ دادی!“ وہ مٹھیاں سمجھ کر جوش سے بولی۔ ”کو کیا پتا کیا لطف آتا ہے اپنی ذاتی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اپنی مرضی سے سڑک

پر ہواؤں کی طرح اڑتے پھرنے میں۔“

”بکلی ہے تو تو۔“ دادی سر جھٹک کر سبزی صاف کرنے میں لگ گئیں۔

”کیا پتا نا ہے شام کو دادی۔“ وہ دائرہ کا کام پٹنا کر گیلے فرش پر پرانا کپڑا پھیر کر اپنے گیلے کپڑے بدل کر نہا دھو کر اپنے اور دادی کے لیے چائے بنا کر دوبارہ مچن کی سمت آئی تھی۔ اسی اثناء میں دادی کافی ساری سبزی صاف کر چکی تھیں۔

”اے دیکھو پوچھتی تو یوں ہے جیسے خود بناتی ہے روز۔“ دادی نے ناک پھلا کر کہا تھا وہ ہنس پڑی۔ ”ہماری شاہی چھٹی ہے اسی خوشی میں ہم اپنی دادی حضور کو شاہی مطبخ سے رخصت عطا کرتے ہیں۔ ماہ بدولت آج خود عشا یہ تیار کریں گے۔ یعنی کہ۔ یعنی کہ بھلا کیا پکائیں دادی حضور!“

”یعنی کہ شلجم اور میتھی۔“ دادی نے کھٹ سے جواب دیا۔ اس نے برا سامنہ بنالیا۔ ”جی نہیں یعنی کہ چکن روسٹ!“

”یعنی کہ آلو پالک۔“ دادی نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”آف آف۔“ اس نے سر پیٹ لیا۔ کیا خنجر ساما رہے دل پہ۔ یعنی کہ بریانی۔ یعنی کہ کوفتے یعنی کہ تورم۔ آہا۔“ اس کے منہ میں پانی بھرا آیا تھا۔ ”ویسے دادی۔“ وہ پلٹا کھا کر دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”کیا خیال ہے کہ آج باہر ڈرنہ کریں۔ چائینیز میں۔ تنخواہ بھی تازہ تازہ ملی ہے مبلغ ساڑھے پانچ ہزار۔“

اس کی باتوں پر دادی کو کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی۔ اس کا اسٹائل سمجھتی تھیں اسی لیے اسی کے انداز میں جوابی کارروائی کرتی تھیں۔ اس وقت بھی پالک چھتے ہوئے مصروف سے انداز میں گویا ہوئیں۔

”اچھا باہر کھانے کا پروگرام ہے اور جانا کس پر ہے بکلی کا پٹر پریا چاند گاڑی پر۔“ دادی کے استفسار پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”میرا خیال ہے کہ ہم ریل گاڑی پر چلتے ہیں۔ ذرا سستی پڑے گی وہ۔“ کافی غور و خوض کے بعد وہ بولی۔

”ابھی دراصل اہم اتنے امیر نہیں ہوئے نا۔ ہائے دادی ویسے سنجیدگی سے سوچیں اگر ہمارے پاس ذاتی کار ہوتی اس وقت تو آنے جانے کی مصیبت تو نہ پڑتی۔ ٹھاٹھ سے اپنی گاڑی پر چائینیز جاتے۔“ اس کی سوئی پھر گاڑی پر ہی آ کر ٹکی تھی۔

”انٹوار اور پر چھت سے کپڑے اتار کر لاؤ۔ سوکھ گئے ہوں گے۔“ دادی سبزی اٹھا کر کچن کی



جانب بڑھی تھیں۔

وہ بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔

”اتنی دیر میں کیا گاڑی ملنے کے چانسز بن جائیں گے۔“ میٹرھیاں چڑھنے سے پہلے اس نے نہایت سنجیدگی سے پر خیال نظروں سے دادی کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ہاں شاید کہا جاسکتا ہے۔“ دادی نے اس سے زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ تسلی آمیز انداز میں سر ہلاتی میٹرھیاں چڑھ گئی تھی۔ پھر میسر پر آ کر خود بخود ہنس دی۔

”دادی بھی آخر میری دادی ہیں۔“

اس کے امی ابو چند سال پہلے ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے ایسے میں دادی نے ہی اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ دادا ابوکا بنایا ہوا ذاتی مکان تھا۔ ابوکا بینک بینکس اور کچھ پراپرٹی تھی۔ ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو جاتا تھا۔ اس نے انگریزی میں ایم اے کے بعد قریبی پرائیویٹ ہائی اسکول میں جاب کر لی تھی۔ جس پر دادی کو اختلاف رہتا تھا۔ گو بینک میں اتنا تو تھا کہ ایک چھوٹی سی برانڈ نیوسوز کی خریدی جاسکتی تھی۔ لیکن دادی اس سلسلے میں ہمیشہ مزاحم ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں زمین کو گاڑی کی حرص یا شدید حسرت نہیں تھی۔ بس ایک خواہش ایک شوق تھا اور وہ چاہتیں تو اسے پورا کر سکتی تھیں۔ ظاہری بات ہے وہی تو ایک ان کی کل کائنات تھی۔ اس کے وجود کی کھلکھلاہٹوں سے تو دادی کی زندگی کی سانسیں بندھی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ خود ہی اس کی فرمائش کو پورا کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتی تھیں۔

”میرا دل تو ویسے ہی ہولتا رہتا ہے جب تم گھر سے باہر ہوتی ہو گاڑی چلائی شروع کر دی تو اور وہم ستانے لگیں گے۔ تمہارا مزاج تو پہلے ہی اتنا اتالا ہے۔ ارد گرد کا کچھ دھیان نہیں ہوتا۔ اندھا دند میٹرھیاں چڑھتی ہو۔ آنکھیں بند کر کے حشر مچا کر کام کرتی ہو۔ اللہ نہ کرے کوئی حادثہ ہو گیا تو۔“ اگر کبھی وہ بہت اصرار کرتی تو کہتیں۔

”بھئی وہ پیسے تو تمہاری شادی کے لیے رکھے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے پھر میں اپنی ذاتی محنت و مشقت اور کاوش سے پیسے کما کر گاڑی خریدوں گی۔“

دادی بے تحاشا ہنس دیتی اور پھر ناک پر انگلی رکھ کر کہتیں۔

”اے لو۔ پانچ کا پانچ تو اُڑ دیتی ہو ہر ماہ۔ الٹے تلووں میں اور کھانے پینے کی چیزوں پر اور خریدنی ہے گاڑی۔“

کبھی موج میں ہوتیں تو اسے چھیڑتیں۔

”چل یوں کرتے ہیں تیری شادی کے لیے کوئی گاڑی والا بندہ تھلا کر لیتے ہیں۔“

”ہیں دادی ج! وہ مسرت سے چیختی۔ پھر ان سے لپٹ کر منمنانے ہوئے کہتی۔“ پھر جلدی

کر رہاں دادی۔“ اور پھر دونوں بے تحاشا قہقہے لگانے لگتیں۔

زندگی۔ بہت آسان نہیں تھی تو ایسی مشکل بھی نہیں تھی۔ دادی نے اس کی تربیت ایسے کی تھی کہ کوئی محرومی یا سیت اور حرص و طمع کا خلا اس میں پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ گاڑی کی خواہش بھی بس شوق ہی تھا۔ ادی جانتی تھیں، بس ایسے ہی جیسے فضاؤں میں اُڑتے بادلوں اور پرندوں کو دیکھ کر ان کے سنگ اُڑنے کو جی مچلے بلکہ یونہی چھیڑی بنائی تھی اس نے دادی کی۔

حجرت پر سے کپڑے اتارتے ہوئے یوں ہی اسے ایک نامعلوم سا احساس ہوا تو اس نے سر اٹھا کر دھرا دھر دیکھا۔ دائیں طرف پانچ گھر چھوڑ کر پرے گھر کے میسر پر ایک لڑکا دوڑتے ہوئے اس کی لطف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن آمیز تحیر در آیا۔

دور سے لڑکے کا چہرہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا تاہم قد و قامت اور ڈیل ڈول سے سولہ سترہ سال سے کچھ زیادہ نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بڑا دیکھا بھالا سا لگ رہا تھا۔

”کون ہو سکتا ہے؟“ اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں بچھ گئی تھیں اس کے متوجہ ہونے کے بعد وہ درمیان آنکھوں سے ہٹا کر ادھر ادھر ٹپکنے لگا۔

زمین نے غیر محسوس انداز میں دوبارہ اس نوجوان لڑکے کی سمت نظریں دوڑائیں۔ چند ثانیے غور کرنے کے بعد معا جیسے اس کے ذہن میں کونسا سا لپکا۔

”اوہ!“ اس نے گہری طویل سانس لیتے ہوئے جیسے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑا۔ یہ لڑکا نعمان پیرزادہ کے ساتھ اکثر زمین نے دیکھا تھا۔ تھا تو ایسی کے اسکول کا مگر اس کا سیکشن الگ تھا۔

نعمان پیرزادہ تا کچھ کلاس کا اسٹوڈنٹ تھا نہایت بد تمیز اکھڑ مزاج شرارتی اور سرکش۔ اس کے ماتھے یا سر نوید اور جزہ بھی زمین کے اسٹوڈنٹ تھے۔ پورے کا پورا ناول نہایت گستاخ تھا دو سال سے مسلسل قیل ہوتا آ رہا تھا۔ دوسرے لڑکوں خصوصاً لڑکیوں کو تنگ کرنا اساتذہ کو اپنی شرارتوں سے عاجز کرنا اور اسکول کی انتظامیہ کے لیے روزنت نئے مسائل پیدا کرنا اس گروپ کے پسندیدہ ترین شغل میں شمار ہوتا تھا۔ خصوصاً اس گروپ کا سرغنہ نعمان پیرزادہ تو اساتذہ کے کہنے میں بھی نہیں آتا غا۔ زمین سے البتہ خاصا دبتا تھا۔ مگر بالکل اسی طرح جیسے بند بجنرے میں۔ بھوکا شیر کسی مصلحت کے



تحت اپنی چنگھاڑیں بند کر دے اور جب اسے مطمئن دیکھ کر بنجرہ کھول دیا جائے تو کھولنے والے کو آغا ناچیر ڈالے۔

دراصل اس کا تعلق نہ فیملی سے تھا۔ اس کے چچا حکمران پارٹی کی پسندیدہ شخصیات میں شمار ہوتے تھے سو چچا کی مسرے اور باپ کی بے پناہ امارت نے اس کی چال اور مزاج میں خود بخود غرور، تکبر اور گستاخی کے عناصر شامل کر دیے تھے۔

ابھی پچھلے ہفتے دسمبر میٹ کے رزلٹ کے بارے میں بتاتے ہوئے زمین نے نعمان پیرزادہ سمیت پورے گروپ کو ہر مضمون میں فیل ہونے پر بری طرح سخت ست کہا تھا۔ اور سزا کے طور پر دو پریڈ تک مسلسل کھڑا رہنے کا حکم دیا تھا۔ طوباً و کرہ باقی تو اٹھ کھڑے ہوئے مگر نعمان پیرزادہ لیت و لعل سے کام لینے لگا۔ زمین کے ترش اور تند انداز پر وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی اور اس نے غصے سے ایلٹے ہوئے زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ پھر انگلی اٹھا کر غیض سے کانپتے ہوئے کہا تھا۔

”گیٹ آؤٹ۔ بی آف فرام ہیئر ودان سیکنڈز۔“ اور وہ لال سرخ چہرہ لیے سامنے کی کرسی کو ٹھوکر مارتا ہوا باہر نکل گیا تھا زمین نے ساری بات اپنے پرنسپل کو جا کر بتائی۔

پرنسپل نے نعمان پیرزادہ کی اچھی خاصی کلاس لی اس کو آئندہ اس قسم کے رویے سے اجتناب کرنے کی سرزنش کی۔ اور زمین سے سواری کروانے کے بعد دوبارہ کلاس میں جانے کی اجازت دے دی۔

یہ معاملہ ابھی دبا نہیں تھا کہ ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہو گیا۔

کلاس میں ایک نئی لڑکی کراچی سے مائیکریٹ ہو کر آئی تھی۔ اس کا نام مریم تھا اس کا باپ ایک گورنمنٹ کے ادارے میں ہیڈ کلرک تھا۔ مریم کا تعلق تو سفید پوش طبقے سے تھا مگر اس کا بے پناہ حسن اس کا سانچے میں ڈھلاؤ خیز و شاداب سراپا اس کا شگفتگی سے سجا معصوم چہرہ بتاتا تھا گویا بے مثال تھی کچھ ہی عرصے میں اس نے اساتذہ کی توجہ اپنی سمت مبذول کروالی۔ اس کی سادہ و شفاف مسکراہٹ اس کا خوش اخلاق لہجہ اور محتاط طرز عمل اپنے اندر کچھ ایسی کشش لیے ہوئے تھا کہ بہت کم عرصے میں وہ دوسرے کلاس فیلوز کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔

اس دن جمعرات تھی۔ زمین کی کوشش ہوتی تھی کہ جمعرات کو جلدی گھر پہنچے آخری پریڈ چل رہا تھا۔ زمین کا یہ پریڈ فری تھا سو وہ وقت گزاری کے لیے شہلی ہوئی اسٹاف روم سے باہر گھاس کے قطعے کی

سمت آگئی۔ اسکول کی باؤنڈری کے ساتھ ساتھ پہلے پھولوں کی گھنی باڑھ ایک تسلسل سے بڑھی چلی گئی تھی۔ وہ اسکول گیٹ کے عین سامنے والی روش پر کسی خیال میں مگن ٹھہر گئی۔ جب اس نے اڑے اڑے حواس اور بے ترتیب سے ٹھٹھا حال حلیے میں مریم کو گیٹ سے لے کر باہر نکالا۔ اس کی چال میں لڑکھاہٹ اور لرزش نمایاں تھی۔

”مریم!“ زمین کا دل دھک سے رہ گیا۔

”تم اس وقت اس حلیے میں۔ کہاں سے آرہی ہو۔“

چوکیدار شاید ادھر ادھر کہیں مصروف تھا ورنہ اسے باہر ہی روک لیتا۔

”میڈم!“ وہ پھولی نکھری سانسوں سمیت اس کی بانہوں میں آ کر ڈھیر ہو گئی۔

”مریم! مریم! ہوش کرو بھی۔“ زمین کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے تھے اسے اس حال میں دیکھ کر۔

ایک انجانے سے احساس نے اس کے رویں روئیں کو جیسے خوف و ہراس سے ٹھٹھا کا کر رکھ دیا۔

غیبت تھا کہ تمام بچے اپنی اپنی کلاسوں میں تھے۔ ادھر کوئی متوجہ نہیں تھا۔ وہ بدقت تمام مریم کے نیم بے ہوش وجود کو سہارا دے کر اسٹاف روم میں لے آئی اس کو پانی پلایا پکھلے کے نیچے بٹھایا اور بال درست کرتے ہوئے اس کے حواس بحال کرنے کی جگ دو دو کرنے لگی۔

ہوش میں آتے ہی مریم گھٹی گھٹی چیخوں سمیت اس سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

زمین کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

”مریم! خدا کے واسطے خود کو سنبھالو۔ ہوش کرو کوئی ادھر آ گیا تو تمہیں اس حلیے میں دیکھ کر کیا کہے گا۔ جاؤ پہلے ادھر ٹوائٹ میں جا کر اپنا حلیہ درست کرو۔“ وہ اسے پکڑ کر واش روم میں لے آئی۔ چہرہ دھلایا لباس درست کرایا۔ اس کی ظاہری حالت قابل قبول بنا کر ابھی باہر نکلی ہی تھی کہ چھٹی کی بیل بج اٹھی۔

اب یہاں بیٹھ کر سوال جواب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”تم فی الحال میرے ساتھ میرے گھر چلو یہاں سے پیدل کا راستہ ہے۔ وہاں چل کر سکون سے ساری بات بتانا۔“ وہ اسے گھر لے آئی۔

”دادی۔ یہ میری اسٹوڈنٹ ہے اسے کچھ سمجھا ہے مجھ سے ہم ادھر کمرے میں ہیں۔ ذرا اچھی سی چائے بھجوا دیں۔“

”چائے کا یہ کون سا نام ہے۔ کھانا تیار ہے بالکل بس لگانے کی دیر ہے۔ بیٹھو بچی ادھر کھا کر پھر

پڑھنا شروع کرنا۔ ابھی اسکول میں مغز ماری کر کے آئی ہو۔“ دادی نے حق میزبانی نبھاتے ہوئے مریم کو ادھر ڈانٹنگ ٹیبل کے پاس ہی بٹھالیا تھا۔

کھانا کھا کر وہ مریم کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ اور دروازہ بند کر کے اسے اطمینان سے بیڈ پر بٹھا کر پوچھنے لگی۔

”ہاں اب بتاؤ۔“ نجبانے کیوں زمین کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ پچھلے پورے وقت میں مسلسل اس کی کیفیات نوٹ کرتی رہی تھی جو پکار پکار کر کسی ہولناک داستان کا راز منکشف کر رہی تھیں اس کے پھول جیسے معصوم و حسین بکھڑے پر خوف و ہراس اور بے بسی ولا چاری کے ایسے رنگ ثبت تھے جس نے زمین کو اندر ہی اندر دہلا کر رکھ دیا تھا۔

مریم لرزتے کانپتے مومی ہاتھوں کو اضطرابی انداز میں مسل رہی تھی۔ آنکھوں کے کنارے دھیرے دھیرے بھیجنے لگے تھے۔

”میں آج صبح جب آ رہی تھی ناں گھر سے۔“ وہ رندھے ہوئے انداز میں کہنے لگی۔

”ہاں۔ ہاں پھر کیا ہوا؟“ زمین کا رواں رواں اس کی سمت متوجہ تھا اس کا تجسس انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔

”کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ دو موٹر بائیک سواروں نے راستہ روک لیا۔ یہ نعمان پیرزادہ کا گروپ تھا۔ پہلے تو اسکول میں ہی تنگ کرتے تھے مگر آج اسی دوران ایک پجرا وادھر آئی۔ اس میں سے تین مسلح آدمی اترے اور رانگلوی زد میں لے کر زبردستی اندر بٹھالیا۔ پھر.....“ مریم کا سانس پھولنے لگا تھا۔ اس کا لہجہ بری طرح مرتعش ہو رہا تھا۔

وہ ایک ٹک بغیر پلک جھپکے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی بے چینی کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔

”پھر وہ مجھے ایک عالیشان بنگلے میں لے گئے۔ اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ دو گھنٹے تک میں یونہی اکیلی اس کمرے میں بند رہی۔ پھر دروازہ کے پاس قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک بار عبسی دنگ سی آواز میں کوئی بولا۔

”ہاں بھئی جوان کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟ ہمارے بندے پہنچ گئے تھے ناں؟“

”پچھا جان کے ہوتے ہوئے کیا مسئلہ درپیش ہونا تھا۔“ نعمان پیرزادہ نے چمک کر جواب دیا تھا۔

”چل بھئی پھر عیش لوٹ۔ شیر جوان یہی تو چار دن ہوتے ہیں۔“ پچانے جیتے کی پیٹھ جھکی تھی۔

پھر چاروں طرف سے قہقہے گویا برسنے لگے تھے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ خوف سے

سانس لینا محال محسوس ہو رہا تھا۔ پھر آوازیں آہستہ آہستہ مدہم پڑتی گئیں۔ ایسا لگا جیسے کوئی جیپ اشارت ہو رہی ہو۔ اسی دوران ملازمہ لاک کھول کر کھانے کی ٹرے سمیت کمرے میں داخل ہوئی۔ میرے لیے یہی موقع تھا۔ ملازمہ نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے پکڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹرے میز پر رکھتی میں نے چھلانگ لگا کر نشست چھوڑی اور دروازے کی سمت لپکی۔ آگے راہداری تھی۔ اس سے قبل کہ وہ عبور کرتی دفعتاً نعمان پیرزادہ دوسری سمت سے ادھر آ گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ٹھٹھک کر لپکا اور میری کلائی پکڑ کر اندر کی سمت گھسیٹنے لگا۔ مجھ میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی میں نے بھر پور مزاحمت کی مگر بہر حال وہ مجھ سے زیادہ طاقتور اور مضبوط جسامت کا تھا۔ کوئی چارہ۔۔۔ نہ پا کر میں نے اس کی کلائی پر دانت گاڑ دیے۔ وہ درد سے بلبلاتا اٹھا اور۔۔۔ مجھے چھوڑ کر اپنا بازو پکڑ کر بیٹھ رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ حملہ آور ہوتا میں سر پٹ بھاگ اٹھی۔ اور اندھا دھند کوشش کی دیوار سے باہر چھلانگ لگا کر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی آوازیں پیچھے سے سنائی دینے لگیں۔

میں انہیں کسی نہ کسی طرح جھانسا دے کر اسکول تک پہنچ گئی۔“

زمین دم بخود مریم کو تنگ رہی تھی۔ جو اضطرابی کیفیت میں دونوں ہاتھ کی انگلیاں جٹھا رہی تھی اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ زمین نے شدید غیض کے عالم میں منٹھیاں بھیجنے لیں۔ اس کا خون بری طرح کھول رہا تھا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نعمان پیرزادہ اس حد تک دلیری بھی دکھا سکتا ہے۔ خیر یہ سب کچھ اس نے اپنے باپ کی دولت اور اپنے چچا کے اثر و رسوخ کے بل بوتے پہ کیا ہے۔ میں کل ہی سر نیازی سے بات کرتی ہوں۔ اب ان لڑکوں کا اسکول میں مزید رہنا خطرناک ہوگا۔“

اس نے اگلے دن جا کر پہلی فرصت میں پرنسپل نیازی کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ پوری تفصیل سن کر انہیں غصہ ہی آ گیا۔

”مس زمین! آپ اس بد تمیز اور گستاخ گروپ کے ساتھ جو بھی سلوک کرنا چاہتی ہیں آپ کو مکمل اختیار ہے۔“

چنانچہ دوسرے روز ان چاروں لڑکوں کے والدین کو بلا کر ان کے۔۔۔ کر تو توں کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا۔

”آپ کے بچے اغوا جس بے جا اور جبری زیادتی جیسے سنگین جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اگر اس بچی کے والدین چاہیں تو با آسانی آپ کے بچوں پر کیس بن سکتا ہے، لیکن ہم اپنے ادارے اور

ادارے کے لئے ہر ایک نامی کی وجہ سے بہت آگے نہیں بڑھا رہا ہے۔ صرف آپ کے بچوں کو اسکول سے خارج کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کی سرگرمیاں نقص امن کا باعث بن سکتی ہیں۔“  
ان چاروں لڑکوں کے اسکول سے اخراج پر اسٹوڈنٹس انتظامیہ دونوں نے سکون کا سانس لیا۔



دادی! یہ چائے ہے یا پائے جو بن کر ہی نہیں دے رہی۔“ وہ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھی جھنجھلا کر کہہ رہی تھی۔

”اری صبر تو کرو۔ اتنا ولی کیوں ہو رہی ہے۔ لا رہی ہوں۔“ دادی بچن میں کھڑ پڑ کر تے ہوئے قدرے جھلا کر بولی تھیں۔

”اور یہ پراٹھا تو جوں کا توں سجا کے رکھا ہے تو نے۔۔ پلیٹ میں۔“ دادی چائے کا گگ تھامے نکل آئی تھیں۔ ”خود بنا کے تو کیا کھانا پکا پکا بھی حلق سے نہیں اترتا نواب زادی کے۔“ وہ خفا خفا سی بڑبڑانے لگی تھیں۔

”اے دو چار نوالے تو لے لو۔“ خفا لاکھ سہی خیال پھر بھی اس کا دل میں رہتا تھا ان کے وہ جواب میں برے برے منہ بنانے لگی۔

”یہ کوئی پراٹھا ہے؟ نہ اس میں کھی نظر آ رہا ہے نہ پراٹھوں کی سی خستگی ہے کھانے میں۔ نہ کوئی شکل نہ کوئی مزا۔ اول ہوں۔ میرا دل نہیں دل چاہ رہا۔“ وہ تانک سکڑ کر ان کے بنائے ہوئے پراٹھے کی مجروح حالت پر تبصرہ کر رہی تھی۔

دادی نے خفگی سے گھورا۔ ”اے لو جب خوب کھی لگا کر کرارے کرارے بناتی ہوں تو پھر چیختی ہو کہ سارے کا سارا کھی میں نہلا دیا ہے اتنا قلیل ناشتا میں نہیں کر سکتی۔“  
انہوں نے اس کے لہجے کی نقل اتار تے ہوئے کہا۔

”یوں کہو ناں آنا کافی کرنے اور مین میخ نکالنے کی لت پڑ چکی ہے تجھے۔ ہر شے میں سو ہزار کیڑے نکالنا تو تیرا شیوہ ہے۔“

”بس دادی ثابت ہو چلا ہے کہ اب آپ کے ہاتھ میں پہلی سی لذت نہیں رہی۔“ اس نے جیسے بڑے پتے کی بات بتائی تھی انہیں۔

”تو خود سنبھال لو بچن۔ بناؤ اپنے ہاتھوں سے لذت اور مزے دار چیزیں۔“ دادی کو تاؤ آ گیا تھا۔  
”دودن باورچی خانہ چلاؤ گی تو پتا لگ جائے گا۔“

”آئے ہائے دادی۔ کیا بات کرتی ہیں آپ۔“ اس نے اک ادا ہے کہنیاں میز پر نکاتے ہوئے مری تھی۔ ”یہ ہاتھ تو صرف ایک چیز کو سنبھال اور چلا سکتے ہیں یعنی گاڑی کو۔ اسی نے اپنے ہاتھوں بکھا تھا۔

”لے آ جا پھر اسی پچیسے موضوع پر۔ میرا تو دل اوب چلا ہے تیری گاڑی کی رٹ سن سن کر۔“  
بڑا ترن سینٹنے لگی تھیں۔

”ارے تو پھر لے دیں ناں گاڑی اچھی دادی۔“ اس نے ان کے برتنوں سے الجھتے ہاتھ تھام کر کفر فرائش داغ دی۔

”اچھا۔“ دادی نے سکون سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا ”چل تو شادی پر راضی ہو جا۔ تجھے جہیز میں دے گی گاڑی۔“

جواب میں برا سامنہ بنا لیا۔

”کوئی اور ذکر چھیڑیں دل اہل ہو ہے۔“

”میں کہتی ہوں خدا کے واسطے سنجیدگی سے اس معاملے کے بارے میں سوچ لے۔ یہی وقت ہے اں کے نیچے سے گزرا پانی واپس نہیں آیا کرتا۔“

”بس دادی بس۔“ اس نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ”بہت کھا لیا ہے میں نے آپ کا قلعہ ہضم نہیں گا۔“

دادی نے جواباً غصیلی نظروں سے اسے گھورا۔

”آج تو دادی موجود ہے ناز نخرے اٹھانے کے لیے۔ کل کی سوچ جب تیرے ارد گرد تنہائی اور موٹی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔“

”اللہ جی! آج میرا یوم آخرت تو نہیں۔“ اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر نہایت سنجیدگی سے یافت کیا تھا۔

تھوڑی دیر دادی سے چہلمیں کرنے کے بعد وہ بیک کا ندھے پر ڈال کر باہر نکل آئی تھی۔ اپنے خصوص مانوس راستے پر چلتے ہوئے اسے ایک ناموس سا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہو۔ اس نے قدم روک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ وہ الجھے الجھے سے انداز میں رجھک کر آگے بڑھ گئی۔

لیکن چند قدم چل کر پھر اسے جیسے کوئی احساس ستانے لگا۔



”آخر مسئلہ کیا ہے۔“ وہ تحیر کے عالم میں خود سے سوال کر رہی تھی۔ کافی دیر ادھر ادھر نظر دوڑانے کے باوجود جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پھر وہ چل پڑی۔ مگر اس کی چال میں پہلی والی رو اعتاد اور تسلسل نہیں رہا تھا۔

کچھ دیر بعد پھر اسے رکتا پڑا لیکن اس بار رکنے کی وجہ تیز رفتاری سے فٹ پاتھ کے بالکل ساتھ ایک دھچکے سے کھڑی ہو جانے والی پجارو تھی۔ کھٹاک سے فرنٹ کا ڈور کھلا اور اگلے ہی لمحے لمبے لمبے چوڑے ڈیل ڈول والا پینتیس چھتیس سال کا بارعب سا آدمی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”جی۔“ ایک لمحے کو وہ بے اوسان سی تو ضرور ہوئی تھی۔ مگر ظاہر کیے بغیر بڑی تسلی سے استفہا! انداز میں اس کا سر دو سنگین تاثرات سے سجا چہرہ دیکھا اور سکون سے بولی۔ پجارو سے کود کے تین چا کلا شکلوں والے بندے آن کھڑے ہوئے تھے۔

”تو تم ہوس زمین احمد!“ بالا خراپنی کڑی نظروں کا حصار توڑتے ہوئے وہ بولا تھا۔ ۱۲ میں بڑا تکبر، تحقیر اور تنفر سا تھا۔

زمین نے انتہا درجے کی ناگواری سمیت اس کی سمت دیکھا تھا۔

”جی ہاں لیکن تعارف کا یہ کون سا انداز ہے۔“

”ابھی تعارف کروایا ہی کہاں ہے محترم۔“ اس کے انداز میں خاصا استہزا تھا۔

”ہم عمر دراز خان پیر زادہ ہیں۔ نعمان پیر زادہ کے چچا۔“

بڑے زعم سے تعارف کروایا گیا تھا۔ یہ وہی پیر زادہ جو حکمران پارٹی کا چہیتا بندہ تھا۔ ایک طاقتور سیاسی شخصیت۔

”تو پھر.....“ وہ بغیر مرحوب ہوئے اسی سکون سے دریافت کر رہی تھی۔

”غالبا آپ نے ہی بچے کی کسی شرارت پر اسے اسکول سے نکلوا یا ہے۔“

”آپ کو غالباً بچے کی اس ”شرارت“ کے بدلے میں علم نہیں ہے۔“ اس نے طنزاً کہا تھا۔

”جانتے ہیں اور ایسی چھوٹی موٹی شوخیاں تو اس عمر کے لڑکوں کا حصہ ہوتی ہیں۔“ اس نے

سے اپنا مغرور سر جھٹکا تھا۔ ”بہر حال بحث مباحثے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ

کرتا ہے کہ پرنسپل سے کہہ کر اس کا ایڈمیشن دوبارہ کروانا ہے اپنی کلاس میں۔ یہ اس کا بڑا اہم سا

اور سالانہ امتحان کو بھی دو تین مہینے رہ گئے ہیں بمشکل۔“

وہ گویا آرڈر کر رہا تھا۔

زمین کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”یہ اسکول کے قوانین اور اصولوں کے خلاف ہے۔“

اس نے یہ کہہ کر غصے سے سر جھٹکتے ہوئے آگے قدم بڑھائے تھے مگر اسی وقت اس کے راستے میں

اشکوفوں والے آگئے۔

”یہ کیا بد تیزی ہے مسٹر عمر دراز خان!“ وہ بھنکا کر اس کی طرف مڑی تھی، جو نہایت اطمینان سے

اں ہاتھ سینے پر باندھے اس کا سراپا جانچ رہا تھا۔

”ویسے ہو خاصی دلکش۔“ وہ خاصی بے باک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

شرم اور غصہ سے اس کا پورا وجود جل اٹھا۔

”اپنے ان پالتو کتوں سے کہو کہ میرے راستے سے ہٹ جائیں۔“ ناک سکڑتے ہوئے وہ غصیناک

ہمو رہی تھی۔

”ہمیں نڈر خود اعتماد اور غصہ ور لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔“ وہ اب بھی بڑی تسلی سے اس کو نظروں کے

میں لیے ہوئے تھا۔

”جی ہو پور سیلف مسٹر عمر دراز خان۔“

کچھ دیر وہ اس کا طیش زدہ انداز ملاحظہ کرتا رہا۔

پھر محظوظ ہونے کے بعد ہاتھ کے اشارے سے اپنے بندوں کو ہٹا دیا اور خود بھی گاڑی میں جا بیٹھا۔

”بہر حال تم سوچ لو۔ نعمان پیر زادہ ہمارا بھتیجا ہے اور اس کا کیریئر ہمیں ہر شے سے

ہے۔ کیوں ایک کلرک کی معمولی سی بیٹی۔ مصیبت مول لے رہی ہو۔“

اس کے بظاہر سرسری انداز میں محسوس کی جانے والی دھمکی تھی۔

”جہنم میں جاؤ۔“ اس نے جواب میں تیوریاں چڑھا کر حساب بے باق کیا تھا۔

”سوچ لو ایک بار پھر لڑکی۔“ اب کی بار اس کا لہجہ بہت سرد تھا۔

”ہم بار بار اپنی بات دہرانے کے عادی نہیں ہیں، تمہیں ہر صورت نعمان کی ایڈمیشن کروانا

ڈوگر نہ تمہاری جان و آبرو کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔“

”بہت دیکھے ہیں ایسے۔ ہونہر۔“ اس نے خاطر میں نہ لاتے ہوئے تیزی سے قدم بڑھا دیے

تہ شاہد اس واقعے کو اتنی اہمیت نہ دیتی مگر دادی سے جب سرسری سا ذکر کیا تو انہوں نے اپنے

ساتھ ساتھ اسے بھی خاصا ہولا دیا۔

”تجھے ساری زندگی عقل نہیں آئے گی۔“ انہوں نے ساری داستان سن کر سر ہٹا لیا تھا۔

”دادی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔“ وہ جھلاہٹ کے عالم میں دای سے برسر پیکار ہو گئی۔

”اب اس میں عقل آنے یا نہ آنے کی کیا تک نفی ہے؟ بھلا کیا اس بچی کی مدد نہ کرتی ہیں۔ ان اوباش لڑکوں کو سبق نہ سکھاتی تو کل ایک مریم کیا پورے اسکول کی لڑکیوں کے سروں سے آچل چھن سکتے تھے۔“

”عزت شیشے کی مانند ہوتی ہے مینا بچے اور اس کی حفاظت گھر کی چار دیواری میں ہی ہوتی ہے۔ باہر نکلے تو بہت پتھر پڑے ہیں۔“ دادی کے چہرے کے متشکر تاثرات اور لہجے کی سنجیدگی اسے بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔

”اللہ اس بچی کی عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔ اس کے باپ کا شہلا اونچا رکھے۔ رب کل کی خیر کرے۔ پر بچے پرانی آگ میں کودنے کا زمانہ نہیں رہا۔ تجھے کیا خبر ویلوں کے بھیس میں کیسے کیسے شیطان چھپے ہوتے ہیں۔“

ابھی دادی درحقیقت ساری کھانسن کر جتنا پریشان ہوئی تھیں اتنا ظاہر نہیں کر رہی تھیں، مگر ان کا دل عجیب واہموں اندیشوں میں ڈول رہا تھا۔

”میری مانگو تو چھوڑ دے یہ نوکری۔ یوں بھی فالتو کی کھکھیز ہے، کیا ضرورت ہے بھلا۔“ دادی کی سوئی بالا خراس نکتے پر آ کر اکتی تھی۔

”افوہ۔“ وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔ ”دادی بھلا فرار اور خود فریبی بھی کبھی مسئلے کا حل ہوا کرتے ہیں۔ زمانہ خراب سہی، مگر اس کے ڈر سے لوگ گھروں سے باہر نکلنا تو نہیں چھوڑ دیتے ناں۔ گھروں میں ڈاکے پڑتے ہیں تو کیا لوگ گھروں کو قیمتی اشیاء سے سجانا چھوڑ دیتے ہیں۔ چوری ہو جانے کے ڈر سے خواتین زیور خریدنا ترک کر دیتی ہیں کیا فراڈ کے ڈر سے سیٹھ لوگ کاروبار کرنا بند کر دیتے ہیں کیا؟ یہ دنیا کے دھندے یوں ہی چلتے رہتے ہیں دادی۔ دنیا میں اچھے برے سبھی لوگ ہوتے ہیں۔ ہر رنگ کے ہر ڈھنگ کے ہر روپ کے لوگ بستے ہیں اس مگر میں۔ کیا برائی کے ڈر سے ہم ارد گرد کے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیتے ہیں؟ ایسا تو نہیں ہوتا ناں۔“

”پرا احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔“

دادی اس کے ریشمی بالوں کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے حد درجہ تفکر سے کہہ رہی تھیں، ان کے

چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ انداز میں مضطربانہ سی بے قراری تھی۔

”او دادی! اچھی دادی بس اب چھوڑیں بھی اس طرح علامہ بن کر بات کرتے ہوئے ذرا بھی میری دادی نہیں لگتیں۔ انھیں ناں ذرا مجھے اپنے ہاتھ کا آلو پر اٹھا تو بنا دیں قسم سے بڑا دل چاہ رہا ہے۔“ اس نے چٹکارہ لے کر گویا اپنی دلچسپی کا عملی اظہار کیا۔

”تجھے تو ہر وقت کھانے پینے کی پڑی رہتی ہے۔“

”اچھا سن۔ آئندہ سے میں تجھے چھوڑنے اور لینے جایا کروں گی۔“

گو کہ زمین نے دادی کا دھیان ہٹانے کو فرمائش داغی تھی مگر دادی بہر حال اس بات کو نہیں بھولی تھیں۔

”دادی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔“ اس کا دل ان سے الجھنے لگا تھا۔



”زمین! بھی تمہارا فون ہے۔“ وہ حسب معمول اپنی کلاس رہی تھی۔ جب اس کی کو لیگ راحیلہ نے آ کر اطلاع دی۔

”میرا فون۔ مگر کس کا؟“ اس کو حد درجہ اچنبھا ہوا۔ بھلا اس کو یہاں اسکول میں کون فون کر سکتا تھا۔

وہ دل ہی دل میں حیران ہوتی ابٹاف روم کے ٹیلی فون اسٹینڈ تک آئی تھی۔

”ہیلو۔؟“ اس کے طرز تخاطب سے استعجاب ٹپک رہا تھا۔

”ہاں جی جناب۔ کیا حال چال ہیں۔“ ایک بھاری آواز اپنے اندر عجب ساتھ ساتھ انداز لیے ہوئے ایئر بیس سے ابھری۔

”کون صاحب بات کر رہے ہیں؟“ اس نے اپنا تعجب دباتے ہوئے رسائیت سے دریافت کیا۔

”دنیا ہمیں عمر دراز خان پیر زادہ کے نام سے جانتی ہے۔“ کیا جارحانہ لب و لہجہ تھا۔ ”اور ہم بات نہیں کرتے، فرماتے ہیں، حکم صادر فرماتے ہیں۔“

لحوں میں زمین کی تمام حیات چوکس ہو گئیں، اس کی شفاف پیشانی پر ناگواری کی واضح سلوٹیں اتر آئیں۔

”مسٹر عمر دراز خان! اگر آپ کو نہیں پتا تو میں بتائے دیتی ہوں کہ مجھے زمین احمد کہتے ہیں، اور میں نے اس سر زمین پر اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کے بعد اور صرف اپنی دادی کا حکم مانا ہے۔ اس

کے علاوہ مجھے کسی کی سننے کی عادت نہیں ہے اپنے احکامات ان پر صادر کیجئے جو بندوں کے بجائے کیزے مکوڑوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں آپ کے سامنے۔“ اس نے زوردار آواز کے ساتھ ریسور کریڈل پر بیٹھ دیا غصہ ناک قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

درز دیدہ نظروں سے چینٹے چلاتے فون پر نظر ڈالی۔ وہ مسلسل بج رہا تھا۔

ایک چور نگاہ دروازے کی سمت کی۔ کوئی اہم فون بھی ہو سکتا تھا طوطاؤں کو ہاں اس نے ریسور دوبارہ اٹھالیا۔

”اگر آپ کو عادت نہیں ہے تو ہم آپ کو عادی بنا دیں گے مس زمین احمد۔“ اس کے ہیلو کہنے پر دوسری طرف سے سرد اور خشک انداز میں کہا گیا تھا۔

”آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی عمر دراز خان پیر زادہ کا فون پٹختے کی۔ آپ کی پوری بات سنے بغیر فون رکھنے کی حرکت نے ہماری برداشت کو خاصا آزما دیا ہے۔“

”آپ چاہتے کیا ہیں آخر۔“ اس کا ضبط انتہا کو چھونے لگا تھا۔ طیش کے عالم میں ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھ لیا۔

جواب میں ایک بے ساختہ قہقہہ ساعتوں میں گونجا تھا۔

”دعوت بہت کرتی ہوں زمین احمد! بس اتنی سی ہی با اختیار تھی خود پر؟ بہت جلد گھبرا کر پسا پکی اختیار کر لی! ہمارے حساب سے تو یہ بات بہت بعد میں آتا تھی اس دن کی ملاقات سے تو یہی اخذ کیا تھا۔ لیکن تم خاصی سمجھدار لگتی ہو چلو اچھا ہوا۔ ہمارے اختیار کی حدیں ناپ کر لائن پر آ گئیں۔ یہ تمہارے حق میں ہی بہتر ہوتا۔ اب بتاؤ میں نعمان پیر زادہ کو تمہارے پاس کب بھیجوں۔ امتحانات خاصے نزدیک ہیں میں چاہتا ہوں وہ دوبارہ سے ایڈ جسٹ ہو کر باقاعدگی سے اسکول جانے لگے۔“

آخر میں لہجہ بڑا دوستانہ سا ہو گیا تھا جیسے پرانی شناسائی رہی ہو۔ کس قدر زعم تھا اسے کہ وہ اس کے رعب و دبدبے اور جاہ و جلال سے خائف ہو کر اس کی بات ماننے پر راضی ہو جائے گی۔ زمین کے تلوؤں سے لگی اور سر پر بھیجی۔

”آپ کس دنیا کا خدا سمجھتے ہیں خود کو مسٹر عمر دراز خان؟“ طنزیہ لہجے میں زمانے بھر کا استہزاء آیا تھا۔ ”فار یور کا سنڈ انفارمیشن۔ میں آپ کی رعایا نہیں ہوں۔ اور جہاں تک نعمان پیر زادہ کے کیس کا تعلق ہے وہ چپٹر کلوز ہو چکا ہے۔ ایسا قیامت تک ممکن نہیں ہے۔ اینڈ ڈس آل۔“

”بڑا مہنگا سودا کیا ہے تم نے اپنی من مانی کا زمین احمد۔“ کچھ توقف کے بعد ایریس پر ایک پراسراری جارحیت لیے سنگین آواز ابھری تھی۔ ”بہر حال اب ہم سے گلہ نہ کرنا۔ ہم عنقریب تمہاری ثابت قدمی کو خراج پیش کریں گے۔ امید ہے آپ کو ہمارا تحفہ پسند آئے گا۔“

”میں منتظر ہوں گی مسٹر عمر دراز خان۔“ اس نے جواباً اتنے ہی زہریلے انداز میں کہا اس کے حرف حرف میں کاٹ تھی۔

دوسری طرف سے ریسور رکھا جا چکا تھا۔

”میری بلا سے۔ اونہ۔“ وہ لا پرواہی سے شانے جھکتی دوبارہ کلاس روم کی سمت بڑھی تھی۔



”پوری رات بارش ہوتی رہی۔ راستے میں پھسلن ہوگی۔ آج میرے ساتھ نہ جائیں دادی!“ تیار ہو کر گھر سے نکلنے وقت اس نے دادی کو روک دیا تھا۔

”اے کچھ نہیں ہوتا چلے چلتی ہوں۔“ دادی اسے اکیلے بھیجنے پر راضی نہیں تھیں۔

”کیا ہے دادی! کوئی بھیڑ یا نہیں اٹھا کے لے جائے گا جنگل میں نہیں رہتی میں۔“ وہ حلق تک جھنجھلائی۔

”انسان کو درندہ بننے کوئی سی دیر لگتی ہے۔“ دادی پر اس کی جھلاہٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ”اس لیے کہتی ہوں چھوڑ دے اب نوکری۔ بہت ہو گیا شوق پورا۔“ دادی موقع دیکھ کر پھر اپنا من پسند موضوع لے بیٹھی تھیں۔

”مجھے سکون سے جانے تو دیا کرو۔“ وہ حقیقتاً زچ ہو گئی تھی۔

”سارا دن اسی ذہنی کوفت میں گزر جاتا ہے آپ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں رہ گئی۔“

”زیادہ اتاولی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ دادی برہم ہو گئیں۔

”تو نے طے کر لیا ہے کسی بزرگ بڑے کی بات نہیں ماننا۔ خود سوا لاد اپنی من مانیوں کا بہت نقصان اٹھاتی ہے۔ تجھے کیا خبر کتنی خراب ہوا ہے زمانے کی۔ بڑی دادی بنی پھرتی ہے میری۔ تو نے دنیا نہیں دیکھی۔ باتیں بنانے، تقریریں جھاڑ لینے اور اپنی منوانے سے زندگی نہیں گزرا کرتی۔“ دادی اچھا خاصا بھنا گئی تھیں۔

”ڈرڈر کے۔“ وہاموں اور نام نہاد اندیشوں کے بیچ بھی زندگی نہیں گزرا کرتی۔“ وہ جل کر بولی۔



”اچھا چل بحث نہ کر اب سویرے سویرے ٹائم نکل رہا ہے، کب نکلے گی تو۔“ دادی اس کے بگڑے موڈ کے پیش نظر مصالحت پر اتر آئیں۔

جب وہ گیٹ سے نکلی تو باہر تک اس کے ساتھ آئیں۔

”دو پہر تک موسم ٹھیک ہو گیا تو میں واپسی پر آ جاؤں گی۔ پانچ مٹ رک کے دیکھ لینا۔“ دادی نے پیچھے سے اطلاع دی تھی۔

”اچھا۔“ اس نے چارونا چار سر ہلادیا اور خدا حافظ کہہ کر نکل کھڑی ہوئی۔ جب تک موڑ نہیں مڑ گئی، دادی گیٹ کے باہر کھڑی دیکھتی رہیں۔

ڈیڑھ بجے چھٹی کی تیل بجی تو وہ راحیلہ کے ساتھ ہی گیٹ تک آئی۔

راحیلہ کا خاندان موٹر بائیک پر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر خاندان کے ہمراہ چلی گئی۔

”پانچ مٹ سے زیادہ ہو گئے ہیں اب کہاں دادی آئیں گی۔ یوں بھی موسم بھی کچھ خراب سا ہو رہا ہے۔“ اس نے پہلے کھڑی کو اور پھر آسمان پر چھائی بدلیوں کو دیکھا اور پھر جانے کے لئے قدم بڑھا دیے۔

اس کا راستہ اکثر و بیشتر سنسان ہی تھا۔ ٹریفک یہاں نہ ہونے کے برابر تھی۔ راہ گیر بھی کبھی کوئی اکا دکا گزر جاتا تھا اور آج اس ایراؤد موسم میں اس کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔

دیکھا جو چہرا تیرا موسم بھی پیارا لگا

وہ یونہی بے خیالی میں گنگنائی روڈ سے کچھ اونچی بنی فٹ پاتھ پر اپنے دھیان میں چل رہی تھی۔ فٹ پاتھ کے ساتھ درختوں کی لمبی لائن تھی۔ کبھی کبھار ایک آدھ گاڑی قریب سے گزر جاتی تھی۔

اسی اثنا میں پیچھے سے آتی ایک وائٹ سوزوکی کا اس سے آگے نکل کر کوئی دو فر لاگ کے فاصلے پر فٹ پاتھ کے ساتھ جیسے جڑ کر کھڑی ہو گئی۔

پھر اس میں سے سفید شرٹ اور براؤن پینٹ میں ملبوس ایک نوجوان باہر نکلا اور گاڑی کی پشت پر آ کر ڈگی کھول کر انجن پر جھک گیا۔

”شاید گاڑی میں کوئی فالٹ ہو گیا ہے۔“

زمین نے یونہی سرسری سی نگاہ ڈال کر سوچا تھا۔ وہ ابھی اس سے کافی فاصلے پر تھی۔

معاذہ نوجوان ڈگی جوں کی توں کھلی چھوڑ کر پچھلی سیٹ کی سمت آیا اور دروازہ کھول کر اندر کی سمت

جھک گیا۔

اسی اثنا میں زمین خاصی قریب آ چکی تھی۔ اپنے فطری تجسس کے زیر اثر اس نے دھیان سے ادھر دیکھا۔

سیاہ برقعے میں ملبوس ایک نقاب پوش خاتون بری طرح غڈال سی کیفیت میں بے ہوشی کی سرحدوں کو چھو رہی تھی۔ بے جان سے انداز میں ادھر ادھر لڑھک رہی تھی اور نوجوان اس کے صحت مند وجود کو سنبھالنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔ آنکھوں کے سوا خاتون کا پورا چہرہ نقاب میں تھا اور اس کی کیفیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اچھی خاصی اذیت میں مبتلا ہے۔

زمین اب گاڑی کے بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔ ایک آخری افسوس زدہ نظر نوجوان اور بیمار خاتون پر ڈال کر اس نے اگلا قدم بڑھایا ہی تھا کہ اسے ٹھنک کر رک جانا پڑا۔

”ایکسیکوی میڈم! کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتی ہیں؟“ نوجوان کی پریشانی اور تقررات میں لپٹی شائستگی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

نقاب پوش خاتون بری طرح بے قراری سے ادھر ادھر سر بٹختی حال سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ نوجوان کے ہاتھوں سے چل چل کر نکل رہی تھی۔

”آپ ذرا ایک سائیڈ کو ہو جائیں۔“ آن کی آن میں جذبہ ہمدردی نے اسے اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ پھرتی سے پچھلی سیٹ کی سمت بڑھی تھی۔ نوجوان بہ سرعت پیچھے ہٹ گیا اور ڈگی کا دروازہ بند کرنے لگا۔

”کیا ہوا“ کیا طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے؟“ وہ کھلے دروازے سے جھک کر خاتون کے قریب سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے ہمدردانہ انداز میں دریافت کر رہی تھی۔ خاتون بدستور تکلیف کے عالم میں دونوں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔

”سیدھی ہو کر بیٹھیں تاکہ کچھ تازہ ہوا لگے۔“ اس نے جھک کر اس کے صحت مند بازو کو تھام کر اسے سیدھا کرنا چاہا۔

اس وقت وہ پوری جی جان سے خاتون کی دلدہی میں مصروف تھی۔ خبر ہی نہ ہوئی کب پیچھے کا دروازہ بند ہوا اور کب اس نوجوان نے فرنٹ سیٹ پر براہمان ہو کر اپنی سائیڈ کا دروازہ بند کر کے انکیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی اشارت ہونے کی آواز پر اس نے بری طرح چونک کر سر اٹھایا تھا مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ نقاب پوش خاتون اس کی ہدایت پر اپنی نشست کا انداز بدل کر

سیدھی ہو گئی تھی اور اسی لمحے بجلی کی سی سرعت سے اپنے دائیں ہاتھ میں دبار و مال زمین کی ناک پر رکھ دیا۔

جبلی طور پر مزاحمت کے لیے اس نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے اور اس کھینچا تانی میں اس خاتون کا تھوڑا سا نقاب سرک گیا۔

بے دم ہو کر شعور سے لاشعور کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے وہ اتنا ہی دیکھ پائی تھی کہ نقاب کے ذرا نیچے اس ”خاتون“ کے شاطرانہ انداز میں مسکراتے ہونٹوں پر گھنی سیاہ مردانہ مونچھیں کچی تھیں۔ اس نے پوری حیات قابو میں لاتے ہوئے ایک آخری کوشش کرنا چاہی مگر ایک ایک کر کے اس کے سارے حواس کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔



جانے گھڑیاں جیتی تھیں کہ صدیاں جب وہ ہوش کی دنیا میں لوٹی۔ ٹھیک طرح سے آنکھیں کھولنے ہوئے آنکھوں کے پونے بہت بوجھل محسوس ہو رہے تھے جیسے ان پر بہت زیادہ وزن آ پڑا ہو۔

”تم نے کمال درجے کی ذہانت کا ثبوت دیا فصیح! دونوں مرتبہ بہت مہارت سے ”شکار“ کھیلایا۔“

سگار کے گہرے کش لگتا وہ بڑے سکون سے اس نوجوان سے مخاطب تھا۔

”سر! من کہ من دامن۔ یہ تو آپ کی تربیت کا اعجاز ہے! آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے۔“

وہ سرخم کر کے بڑے سجاؤ سے اپنی کتری ظاہر کر کے مالک کو خوش کر رہا تھا۔ ”سر! میرے لائق اور کوئی خدمت۔“

”نہیں۔ فی الحال تم آرام کرو۔ ہم پھر تمہیں زحمت دیں گے۔“ اور وہ سعادت مندی سے سر جھکا کر باہر نکل گیا تھا۔

”میرا خیال ہے تم ہوش میں آ چکی ہو زمین احمد! غور سے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھ لو۔ یہ وہی کمر ہے جہاں تمہاری اس شاگردہ رشیدہ مریم کو لایا گیا تھا۔“

اف یہ لہجہ۔ یہ فرعون صفت چہرہ۔ یہ انداز اس کے اعصاب کے بہت قریب جیسے کسی نے ہم پھوڑ دیا تھا۔

”اوغا۔“ یکلخت اس کی سوئی ہوئی ساری حیات چونک کر بیدار ہو گئیں۔ نگاہ خود بخود کلائی پر بندھی گھڑی پر جا پڑی۔ ڈائل کی چمکتی سوئیاں چھ بج رہی تھیں۔

اس کی ڈیڑھ بجے چھٹی ہو جاتی تھی اور حد سے حد ایک بج کر پچاس منٹ پر وہ گھر کا گیٹ پیٹ رہی ہوتی تھی اور اب چھ بج رہے تھے۔

”دادی.....؟“ معا جیسے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ دہل کر اٹھ بیٹھی اور ہر اسان لگا ہوں سے اپنے گرد و پیش میں نگاہ دوڑائی۔

یہ ایک پر قیض کمر تھا۔ وہ کمرے کے بیچوں بیچ عالی شان سی مسٹری پر دراز تھی۔ بالکل سامنے ہلکے نیلے رنگ کا صوفہ سیٹ تھا جس پر وہ شخص بڑے کز و فر سے ناگ پر ناگ رکھے پشت سے ٹیک لگائے براجمان سگار کے کش لے رہا تھا۔ اس کے انداز میں بڑا اطمینان اور سکون تھا جیسے اسے اس وقت کسی بھی بات کی جلدی نہ ہو۔ ایک بازو تمکنت سے صوفے کی پشت کے ساتھ پھیلائے وہ جچی تلی نظروں سے اس کا اور اس کی بے ساختہ حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

”اوہ خدایا! دادی کا تو ہارٹ فیل ہونے والا ہو گیا ہوگا۔“ زمین کے اعصاب جیسے برف ہونے لگے تھے۔

”مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔“ وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کر بستر سے اٹھی اور بڑے نپے تلے قدم اٹھاتی عین اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کرتے ہوئے

وہ عمر دراز خان کو ایک دم بہت بے خوف اور نڈر لگی۔

وہ جانے کیوں دھیسے سے ہنس دیا۔

”عمر دراز خان کے بنگلے میں بیٹھی ہو اور وجہ پوچھتی ہو حالانکہ ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ تمہاری جرأت اور دلیری کو ”خراج“ دینے کے لیے ایک دن تمہیں ضرور زحمت دیں گے۔ کہو کیسا لگایہ ”تختہ“.....“

جواب میں وہ سانپ کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس کے اندر اتنا غصہ جمع ہو گیا تھا کہ قوت گو یائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی ہو۔

”امید ہے اب تمہیں ہماری بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ ہمیں معلوم ہے تم اپنی دادی سے بہت محبت کرتی ہو۔ یقیناً انہیں زیادہ دیر تک تکلیف میں نہ پڑتا نہیں دیکھنا چاہوگی۔ ہمیں بھی جلدی ہے۔ ہزار طرح کے دوسرے دھندے نپانے ہیں۔ کاغذ قلم تمہارے سامنے ٹیبل پر پڑے ہیں۔ ہمیں بس ایک تحریر چاہیے جس میں تمہارے دستخط کے ہمراہ کچھ اس طرح درج ہو کہ نعمان پیرزادہ پر عائد کیے جانے والے الزامات درست نہیں ہیں لہذا اسے دیگر طالب علموں کی طرح امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

باقی عبارت تم خود بنا لوگی ہم سے زیادہ بہتر جانتی ہو۔ تمہاری طرف سے جاری کیا گیا یہ کیریکٹر سرٹیفکیٹ بہت کافی ہوگا کیونکہ اس سلسلے میں پرنسپل نیازی نے سارا معاملہ تم پر چھوڑا ہوا ہے۔“ گویا ”اوپر“ تک پہنچ لڑائی جا چکی تھی۔

گنتی ہی دیر زمین ساکت و صامت کھڑی اپنے بھرے سگتے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ اپنی بات کہہ کر اب اس کی طرف سے عمل درآمد کے لیے منتظر تھا۔

”میں نے پہلے بھی کہا تھا مسٹر عمر دراز خان کہ یہ جیپٹر گلوز ہو چکا ہے۔“ اس نے بالآخر سر اٹھایا۔  
 ”نعمان پیرزادہ جیسے بھیڑیے کو درس گاہ جیسے مقدس مقام میں گھس کر درندگی کا مظاہرہ کرنے کی اجازت کیونکر دے سکتی ہوں۔ میں ایک استاد ہوں، عزت، شرافت، برابری اور توازن کا سبق پڑھانے والی۔ ایک ”مجرم“ کو ”محترم“ کیسے قرار دے سکتی ہوں۔ اس گندی مچھلی کو پاکیزہ جل میں داخل کر کے ساری فضا خراب کر دوں؟ یہ پوری قوم کے بچوں کے مستقبل کا سوال ہے اور اب مجھے یہاں سے جانے دو۔“

اس نے بہت ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے قہقہے سے جواب دیا تھا۔

”بہت بھولی ہون زمین احمد! اتنی معصومیت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ ہم نے بازی ہارنا نہیں سیکھا۔ کھیلنے سے پہلے اپنی جیت کے تمام امکانات سامنے رکھتے ہیں۔ بہت آگے تک جا کر چال چلنے کے پہلو کھنگالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ کیا تم سوچ سکتی ہو رات گئے گھر نہ لوٹنے والی لڑکی کے لواحقین اہل محلہ کی سوا یہ نظروں کا کیا جواب دیتے ہوں گے؟“

دھک۔ اس نے ایک ہی جست میں جیسے اسے آسمان سے زمین پر لانا تھا۔

زمین کے دل کو جیسے پتھر سے لگ گئے ہوں۔ یوں دھڑ دھڑانے لگا جیسے ابھی جسم سے نکل بھاگے گا۔

”مجھے جانے دو عمر دراز خان!“ اس کی ساری طراری پل میں ہوا ہو گئی۔ لہجے میں مصلحت آمیز نرمی درآئی تھی۔

”ہمارا مطالبہ پورا کر دو۔ ڈرائیور ابھی اور اسی وقت خود تمہیں تمہارے دروازے پر چھوڑ آئے گا۔“ اس کا انداز جتنی تھا۔

”اور اگر میں یہ مطالبہ پورا نہ کروں تو؟“ زمین نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔

”تو.....“ عمر دراز خان نے سر سے پیر تک جانچنے والی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

سبز کائٹن کے ڈھیلے ڈھالے اسٹاکش سے لباس میں نازک سراپا متاثر کن تھا۔

اس کا سنہری شفاف و سادہ چہرہ کشش کے خزیں اپنے اندر سیٹھ بٹھے تھا۔

”تو مطالبے کی نوعیت بدل بھی سکتی ہے کہ بہر حال اپرینڈ ہمیں کو حاصل ہے۔“ بالآخر وہ گویا ہوا۔  
 اس کا لہجہ اس کی ریزہ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا گیا۔ وہ اس کی نظروں کی بدلتی کیفیت سے گھبراہٹ مانی تھی۔

اپنی سدا کی بے دھیان فطرت کے باعث اس کے احساسات صورت حال کی گہرائی کی پیمائش کرنے سے قاصر رہے تھے۔ یہ پہلو تو وہ فراموش ہی کر بیٹھی تھی کہ وہ ایک نوجوان لڑکی ہے اور اس وقت ایک بھرپور دہنگ اور طاقت ور مرد کے رحم و کرم پہ ہے۔ عمر دراز خان کو بھی اس سے پہلے اس کی فطری ”کمزوری“ کا سرا نہیں ملا تھا اور اب جیسے اس کے اندر ایک جتنی انداز درآ رہا تھا۔

”تمہارے پاس اس وقت دورا تے ہیں۔ اپنے اصولوں کی قربانی دے دو اور عزت کے ساتھ گھر جاؤ یا پھر عزت لانا دو اور اصولوں کی پوٹلی ہمراہ باندھ کے لے جاؤ۔ ہم تمہیں دو گھنٹے دیتے ہیں سوچنے کے لیے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم دو صدیاں دینے پر قادر ہوتے تو بھی میرا یہی جواب ہوتا تھا۔ میں اصولوں پر کھجوتا کسی قیمت پر نہیں کروں گی اور جہاں تک عزت کا سوال پیدا ہوتا ہے تو مسٹر عمر دراز خان، عزت اور ذلت دینا تمہارے جیسے بیچ فطرت لوگوں کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ خدا کی دین ہوتی ہے۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کرنے والا میرا خدا ہے۔ تم جیسے بھیڑیے اور انسان نما درندے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

اس کے لہجے سے برستی آگ نے غرور و نخوت اور خود پسندی کی مٹی سے بنے اس شخص کو آن کی آن میں سوکھی لکڑی کی طرح جھلسا کر رکھ کر دیا۔

”اور اب ہم تمہیں بتائیں گے کہ ہم کیا ہیں۔ ہم تو نعمان کی استاد ہونے کے ناتے انتہادر ہے کی شرافت اور انسانیت نوازی کا سلوک روار کھے ہوئے تھے۔“

بجلی کی سی سرعت سے اس نے بڑھ کر دروازہ لاک کیا اور خطرناک تیور لیے اس کی سمت جھپٹا تھا۔ ایک لمحے کو زمین کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ فرار کا راستہ مسدود تھا۔ اسے لگا جیسے یہ درندہ لمحوں میں اس کے وجود کو نگل جائے گا۔ اس کے پیروں میں جیسے کسی نے میخیں گاڑ دی تھیں۔

زمین کی سانسیں رکنے لگیں۔ اس نے بے اختیار تڑپ کر کروٹ بدلی اس کے کروٹ بدلنے سے



ایک تکیہ اپنی جگہ سے کھسک گیا اور اس کے نیچے اس کا سیاہ چمک دار چھوٹا سا ریو الور جھلک دکھانے لگا۔ زمین کو یوں محسوس ہوا جیسے مدد خداوندی آن پہنچی ہو، پسلیاں توڑ کر باہر نکلتے دھڑ دھڑاتے دل کو سنبھال کر اس نے پلک جھپکتے میں جھپٹا کر ریو الور اٹھایا اور بے سوچے سمجھے خود سے لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی اس عفریت کی سمت تان کر ٹریگر دبا دیا۔

یہ ایک قطعی غیر ارادی فعل تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اصلی ریو الور نہیں دیکھا تھا کجا کہ اس کو استعمال کرنا۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کو اپنی خفیہ صلاحیتوں کا اندازہ غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنے پر ہی ہوتا ہے۔

وہ کون سا ماہر نشانہ باز تھی، بس اتنا ہی بہت تھا کہ اس کے ہاتھ بچاؤ کے لیے ایک ہتھیار آگیا تھا۔ اس کا مقصد اسے استعمال کرنا نہیں تھا بلکہ اسے آڑ بنا کر عمر دراز کو اس کے مذموم مقاصد میں ناکام کرنا اور یہاں سے فرار ہونا تھا۔

گولی عمر دراز خان کے بائیں بازو کا اوپری گوشت چیرتے ہوئے پار نکل گئی تھی۔ اس نے بس آستین سے چپکتے سرخ لبو پر نظر ڈالی اور تیزی سے بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے خیال سے گولی کے زخم اور اس کے ہاتھ میں تھا۔ ریو الور کے باعث عمر دراز اس کے لیے خطرناک نہیں رہا تھا اسی لیے وہ اطمینان سے بستر سے لڑھک کر سیدھی ہوئی تھی اور یہی اس کی بھول تھی۔

عمر دراز خان جیسے لوگوں کے لیے تو ریو الور کا شگوف جیسے کھلونوں سے کھیلنا معمول کی بات تھی۔ وہ سرخ بھنگی آستین پر ایک نگاہ ڈالنے کی زحمت کیے بغیر جیتے کی سی پھرتی سے اس کی سمت لپکا اور اس سے پیشتر کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر ریو الور اس کی سمت تان کر دروازے کی سمت بڑھتی عمر دراز خان اس کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔

مارشل آرٹ کا استعمال کرتے ہوئے ایک نپاٹلا ہاتھ اس کے ریو الور تھا۔ ہاتھ پر رسید کرتے ہی ریو الور زمین کے ہاتھ سے پکے ہوئے پھل کی طرح زمین پر جا گرا۔

”چٹاخ“ ایک بھر پور مردانہ ہاتھ پانچوں انگلیوں کے نشان اس کے سنہرے گداز گالوں پر چھوڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے وجود کو جھٹکا لگا اور اگلے لمحے عمر دراز نے اسے کسی بے جان کھلونے کی طرح اٹھا کر بے دردی سے دوبارہ مسہری پر بیٹھ دیا۔ اس بار چونکہ بغیر دیکھے بھالے اشتعال کے عالم میں پھینکا گیا تھا اس لیے اس کا سر بری طرح مسہری کی لکڑی کی بنی ہوئی منتش کٹاؤ دار پشت سے ٹکرا گیا۔ اس کی نظروں میں جیسے زمین و آسمان گھوم کر رہ گئے۔ سر کے ساتھ ساتھ پورا جسم بری طرح ڈول

رج مرا کر رہ گیا کہ بے اختیار اس کے ضبط سے بھینچے لبوں سے سسکیاں بلند ہونے لگیں۔ آنکھوں پر آگے جیسے تارے سے ناچ رہے تھے۔

تکلیف کے بے پناہ احساس کے ساتھ اس نے بمشکل تمام پلکیں اٹھا کر سامنے کھڑے اس سفاک مان نما درندے کی سمت دیکھا جس کا چہرہ اپ کر بالکل انگارہ ہو رہا تھا۔ سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھیں۔ آنکھیں بالکل کسی درندے کی طرح سرخ دھونکی ہوئی چنگاریاں بنی ہوئی تھیں۔

صحیح معنوں میں خوف و ہراس کا بے پناہ ریلہ جیسے اس کے اعصاب ٹھٹھرا گیا۔ اپنی جسمانی تکلیف سے قطع نظر اس وقت اسے اپنی عزت کے بچاؤ کے لیے جان کے لالے پڑنے ہوئے تھے۔

خلاف توقع وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا اثر بارنگا ہوں سے اسے گھورتا رہا۔

”یہ خون دیکھ رہی ہوں زمین احمد!“ اس نے اپنی لبو پٹائی آستین کو لپکا سا جھٹکا دے کر اوپر کیا تھا۔

”یہ خون عمر دراز خان کے بدن سے نکل کر مٹی میں مل رہا ہے۔ عمر دراز خان بڑا عالی نسب ہے اور کا لبو اتنا راز اس کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بے وقعت، بے حیثیت اور بے توقیری لڑکی کے ہاتھوں ضائع جائے۔ کسی دشمن کی گولی سے زخم لگتا تو ہم خوش ہوتے کہ اس صورت میں اس بہتے لبو نے ہمارے رانٹام کے الاؤ کو مزید روشن کر دیا تھا۔ ہمیں نئی قوت دی ہے چپکتے ہوئے لبو کے یہ قطرے پھول بن گئے تھے مگر اب صنف نازک ایک معمولی سی کمزوری لڑکی کے ہاتھوں گلنے والے زخم سے چپکتے یہ رے ہمارے لیے انگارے بن گئے ہیں۔ ہماری غیرت اور مردانگی کے لیے کھلا چیلنج بن گئے ہیں۔

جائیک کسی کو عمر دراز خان کی عالی شان ہستی کی اتنی توہین کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ تم نے ہماری ناہماری مردانگی اور عزت نفس پر کوڑے برسائے ہیں۔ اب ہمارا ارادہ بدل گیا ہے۔ ہماری توہین کرنے والا اتنی آسان موت کیسے مر سکتا ہے۔ ہم نے تو بہت مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہیں داریوں سے بچانا چاہا تھا مگر تم نے خود اپنے لیے جیتے جی جہنم کا چناؤ کر لیا ہے۔ ہمارے بازو سے ٹپکتا دھاب تمہاری آنکھ سے بہے گا زمین احمد۔ ہمیشہ۔ میرا زخم تو دو دن میں مندمل ہو جائے گا مگر تمہاری راجاب تا عمر زخمی پرندے کی طرح تمہارے منتخب کردہ زندان میں سڑتی رہے گی۔“

اس کا پراسرار سا بے رحم سفاک لہجہ اسے خوف اور وحشت کے سمندر میں غرق کر گیا۔

”تم مجھے تسخیر نہیں کر سکتے۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ میں تمہیں خود برحاوی نہیں ہونے دوں گی عمر زخان!“ وہ دونوں بازو اپنے وجود کے گرد سیٹھتے ہوئے آنسوؤں میں گھلی خوف زدہ آواز میں بولی۔ جواب میں عمر دراز خان کا اونچا قبہ تہہ اسے سہا گیا۔

”وہ تو پرانی بات تھی۔ وہ دونوں مطالبے تو اب ختم ہو گئے ہیں۔ وہ تو احتراموں میں لیے اندھے تھے۔ اب صورت حال مختلف ہے۔ ہم تو انسانیت برت رہے تھے۔ بہت نرم پڑ گئے تھے۔ اب کھل جاتیں گے کہ عمر دراز خان کس چیز کا نام ہے۔ تم نے تو ابھی دنیا دیکھی ہی نہیں۔ ہم تمہیں عزت اور عزتی کا اصل فرق سمجھائیں گے۔ پوری ”وضاحتوں“ کے ساتھ۔ وہ سبق بھی پڑھائیں گے جس سے ابھی تک نا ملد رہی ہو۔“

اس کا لہجہ سفاکانہ معنی خیزی لیے ہوئے تھا۔

وہ اندر ہی اندر کانپ کر رہ گئی۔ وہ کیا کرنے والا تھا۔

”فصیح! اندر آؤ۔“ اس نے انٹرکام کا بٹن پیش کر کے حکمانہ کہا تھا۔

”جی سر!“ لمحوں میں وہی سفید سوزوکی والا نوجوان اپنے باس کے حضور کھڑا تھا۔

”دیکھو جیب نکالو اور اس ”مہمان“ کو نہایت عزت و احترام سے ہمارے خاص ٹھکانے پر دو۔ مستانی شاہ کو اچھی طرح سمجھا دینا کہ خاص خیال رکھے۔ ہمیں آج ایک انتہائی ضروری کام یہاں شہر میں ہم کل رات کو پہنچیں گے۔ تب تک تم ادھر ہی رہو گے مستانی شاہ کے ساتھ۔“ وہ ہدایہ دے رہا تھا۔

”اور ہاں بینڈ تاج کا سامان پہنچا دینا ذرا۔“

فصیح سر ہلا کر قیصل کے لیے پلٹ رہا تھا کہ اس نے پیچھے سے آواز لگا دی۔ فصیح نے مڑ کر دیکھا پھر اس کی خون سے سرخ بیگی آستین پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹھک گیا۔

”اوہ سر! آپ کا تو بہت خون بہہ گیا۔“ وہ پریشان سا ہو گیا تھا۔

”ہم ایسے زخموں کو سوئی کی نوک کی ہلکی سی جھین سے بھی کم گردانتے ہیں فصیح! اور یہ تم اچھی جانتے ہو۔ زخم کھا کر مخالف پارٹی کو زخم دینے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ زخم سے زیادہ ہماری آن پر ہماری انا اور ہماری غیرت پر لگا ہے۔ خیر اسے دھونے کا فن بھی ہمیں ہے پھر ابھی تو ابتدا ہے۔“ اس نے نہایت لا پرواہی سے سر جھٹک کر اک انکارہ نگاہ زمین پر ڈالی تھی اندر ہی اندر اس کے پراسرار انداز سے پریشان ہوئے جارہی تھی۔

”مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟“

”ایک ایسی جگہ جہاں سے بچ نکلنے کا راستہ صرف ایک ہے۔“ اور اس کے ساتھ ہی اس نے شہ کی انگلی اٹھا کر اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

زمین کے اندر خوف کا ایک بھونچال سا آگیا۔

”میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تمہیں کیا کہا ہے؟ خود ہی مجھے کہتے ہو کہ میں ایک معمولی سے بے نیستی لڑکی ہوں تو پھر مجھ سے ضد باندھنے سے کیا حاصل۔ تمہارا کام میں نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے زرت! اگر تمہیں محسوس ہوا ہے کہ میں نے تمہاری انا اور مردانگی پر ضرب لگائی ہے تو میں اس پر بھی زرت کر لیتی ہوں۔ اس کے سوا اور کیا چاہیے۔ پلیز مجھے جانے دو عمر دراز خان! میری دادی بے منت مر جائے گی۔“

عام حالات میں وہ شاید قیامت تک اس رعونت اور غرور کے لہاوے میں لتھڑے شخص کے آگے بیار نہ ڈالتی مگر اس وقت اتنی سنگین صورت حال میں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مصالحت، معذرت اور نواست کے سے انداز اپنانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”معذرت کرنا اچھی بات ہے مگر وہاں جہاں ضرورت ہو۔ وقت گزر جانے کے بعد اس کا استعمال بہ مصرف بن جاتا ہے اور اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔ جاؤ فصیح! بینڈ تاج ہم خود کر لیں گے۔ تم اب اندھ ہو جاؤ۔ ہم چاہتے ہیں رات گہری پڑنے سے پہلے پہلے تم وہاں پہنچ جاؤ اور ہاں ہماری مہمان سی ٹھک گئی ہیں۔ بہتر ہوگا انہیں کچھ دیر کے لیے آرام کرنے دیا جائے۔“

فصیح اپنے باس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہی پھرتی سے بڑے غیر محسوس انداز میں مسہری کی پشت کی ت ہڑا تھا اور اس سے پہلے کہ زمین کچھ سمجھتی کلور و قام سے بیگہ رومال اس کے نتھنوں کو چھو چکا تھا۔ اس کے بے ہوش وجود کو کچھلی سیٹ پر احتیاط سے ڈال کر فصیح ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور پھر جیب پنے مطلوبہ راستے پر ڈال دی جو آگے جا کر دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ شام کے گھنے سائے اب ت کی تاریکیوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

جیب جانے کتنی دیر تک کپے کپے اونچے اونچے پہاڑی راستوں پر بھاگتی رہی تھی۔



اس نے دوبارہ ہوش وحواس کی سرزمین پر قدم رکھا تو اسے اپنا سر بری طرح درد سے پھٹتا ہوا دس ہو رہا تھا۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

آنکھ کھلتے ہی یہ احساس تو ہو گیا تھا کہ وہ اس وقت کمرے میں تنہا ہے اور باہر کھلنے والا لکڑی کا رلی آہنوی دروازہ سختی سے بند ہے۔

اس نے چاروں طرف طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ کمر اچھا خاصا کھلا تھا۔ ایک طرح کی بیٹھک تھی۔

ہائیں دیوار کے ساتھ پرانے طرز کی بھاری لکڑی کی گدی دار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں آتش دان بنا ہوا تھا۔ فرش پر سبز دیز ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ دائیں دیوار پر قدیم طرز کا صوفہ سر دھرا تھا۔ صوفے کے ساتھ درمیانے سائز کی لکڑی کی میز تھی جس پر شیشے کا پانی سے بھرا جگ اور گلا رکھا ہوا تھا۔

وہ بمشکل تمام اپنے جسم سے اٹھتی ٹیمیں دبا کر اٹھ بیٹھی۔ حلق میں جیسے کانٹے سے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ اب جو پانی دیکھا تو پیاس اور شدت سے بھڑک اٹھی۔

لرزتے ہاتھوں سے پانی گلاس میں اٹھیل کر وہ غناغٹ چڑھا گئی۔ اپنے اوپر غور کیا وہ ایک پرانے طرز کے تخت پر دراز تھی۔ ارد گرد گائیکے بھی تھے۔ کچھ گائیکے قالین اور صوفے پر بھی دھرے ہوئے تھے۔ تخت پر مٹیلیں نرم کبل کی جہیں تھیں۔ اس نے اپنی حالت پر نگاہ کی۔ کندھوں تک لمبے بال پٹیا۔ نکل کر چہرے اور گردن کے گرد پریشان تھے۔ سبز کپڑے بری طرح لٹکے ہوئے تھے۔

”یا خدا! یہ میں کہاں آ گئی ہوں۔“ اس نے اسی بڑے سے بند کمرے سے روشنی کی درز تلا کرنے کے لیے ارد گرد نظر دوڑائی، بالآخر سامنے واحد داخلی دروازے سے کچھ ہٹ کر لکڑی کی چوڑی سی کھڑکی نظر آئی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی سمت لپکی۔

کھڑکی کا کافی مشکل سے کھلی۔ اس کے تختے سخت پڑ گئے تھے۔ شاید بڑی مدت سے انسانی لمس محروم تھے۔ دونوں پٹ کھولنے میں تو کامیاب نہ ہو سکی البتہ ایک پٹ ضرور دھونچا گیا تھا۔ اس نے تجھ اور بے قراری سے سر ڈال کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر جیسے اس کا دل کسی نے منشی میں لے لیا۔

جہاں تک نظر پڑی تھی سنگلاخ بھورے سیاہی مائل سبز فلاک بوس پہاڑی پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ ہوائیں خشک سی تھیں اسے اجنبی دلیں کی طرح بے گانہ اور نامانوس سی لگی تھیں۔

گویا وہ اپنے شہر اپنے ضلع اپنے ڈویژن سے ہی نہیں اپنے صوبے سے بھی نکل آئی تھی۔ حواس باختہ سی نظریں اس نے اپنی گھڑی پر دوڑائیں اور دھک سے روک لی۔

وہ دو تاریخ کی دو پہر کو اغوا ہوئی تھی اور اسی شام سات بجے اسے اس ”مخصوص ٹھکانے“ پر پہنچا کے لیے بے ہوش کر دیا گیا تھا اور اب آج چار تاریخ ہو گئی تھی اور گھڑی شام کے پانچ بج رہی تھی۔

اس نے بے یقین نظروں سے بے اختیار کئی بار گھڑی کی طرف دیکھا۔

”یہ میری تیسری رات ہے گھر سے نکلے ہوئے۔“

اس کے کلیجے میں جیسے کوئی برے سے چھید کیے دے رہا تھا۔

”دادی۔ پیاری دادی۔ ارے وہ تو دکھائی جیتے جی مر گئی ہوگی۔ کس حال میں ہوگی بھلا۔ ایک دفعہ جب میٹرک کے اسٹوڈنٹس کی فیر ویل تھی شام کو اور میں پانچ بجے گھر آئی تھی حالانکہ بتا کر بھی گئی تھی پھر بھی کتنا پریشان تھیں وہ اور دو پہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔“ تیرے بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا دینا۔“ میرے خفا ہونے پر کتنی بے چارگی سے بولی تھیں۔ اب تین دن ہو گئے ہیں۔ جانے کچھ کھایا بھی ہوگا کہ نہیں۔ کس قدر ذہنی اذیت میں ہوں گی۔ میرے خدا میں کیا کروں۔“

اس کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ رہا۔ بے اختیاری کی سی کیفیت میں کتنے ہی اشک چل چل کر آنکھوں سے گالوں تک کا سفر طے کرتے ہوئے قیاس میں جذب ہو گئے۔

معاً ہر سے قفل کھولنے کی آواز آئی پھر لکڑی کا بھاری آہنی دروازہ چرچرایا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اسی لمحے ہلکی نیلی شرٹ اور براؤن پینٹ میں ملبوس فصیح نے تلے قدموں سے اندر داخل ہوا۔ ”آپ اٹھ گئیں۔ چلیں اچھی بات ہے۔ حکم کیجیے کیا لیں گی۔ ناشتا چائے یا کھانا۔“ اس کے انداز میں شائستہ قسم کی تابعداری تھی۔

جواب میں خاموشی طاری رہی تو فصیح نے سر اٹھا کر دوبارہ مخاطب کرنے کی غرض سے اس کی سمت دیکھا اور چونک سا گیا۔ اس کا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر ہوا تھا۔

”آپ رورہی ہیں؟ رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ الٹا مزید انرجی کم ہو جائے گی۔ افسوس کہ سر کے ساتھ آپ کا معاملہ سیٹ نہیں ہو سکا اور انہیں یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا، مگر نہ کم از کم صحت نازک کو اس خاص ٹھکانے تک لانے کی نوبت آج تک نہیں آئی۔ بہر حال مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہی ہو سکتی ہے اور وہ ہے۔ اگر آپ فریش ہونا چاہیں تو میں آپ کی ہاتھ روم تک رہنمائی کر دوں۔ سر کی ہدایت پر میں نے شہر سے آپ کے قدم و قامت کو مد نظر رکھ کر چار پانچ جوڑے کپڑوں کے لیے لیے تھے۔ ادھر ساتھ والے کمرے میں المار، میں رکھے ہوئے ہیں، کم ہوئے تو اور آ جائیں گے۔ ابھی نہ جانے کب تک آپ کو یہاں رہنا پڑے گا۔“

اس کے لہجے میں ہمدردی، تعاون اور افسوس کی جھلک تھی۔

نرمین نے کچھ سوچ کر جا سختی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ چوبیس بجیں سال کا کسرتی بدن کا حامل اسمارٹ اور پرکشش نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت اور ٹھہراؤ تھا۔ لمحے کے ہزار ویں حصے میں نرمین کے ذہن میں ایک آئیڈیا جیسے اڑکے فٹ ہو گیا۔



”سنو فوج! کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی آسان سارا ستہ ہے۔“ اس کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا جوش و خروش تھا۔ فوج عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

”پیرزادہ صاحب کی زندگی لفظ ”آسانی“ سے قطعی خالی ہے۔ وہ بڑی نڈر اور دلیر فطرت کے مالک ہیں۔ انہوں نے ایسی جگہ پر ہائش گاہ بنائی ہے جہاں عام آدمی پر بھی نہیں مار سکتا۔ اس جگہ کا روڈ کے ساتھ لنک نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جیپ بھی یہاں سے میل بھر کے فاصلے پر کھڑی کرنی پڑتی ہے اور آگے کا راستہ پیدل ملے کر کے آنا پڑتا ہے اور یہ راستہ بھی کوئی سیدھا سادہ نہیں ہے۔ پہاڑی چٹانوں، جھاڑیوں، کھائیوں سے ہو کر جاتا ہے۔ کوئی انجان شخص اگر جیپ تک آ بھی جائے تو بھی وہاں سے یہاں تک پہنچنے کا صحیح راستہ تلاش نہیں کر پائے گا اور ادھر ادھر بھٹکتا رہ جائے گا یا پھر کسی جنگلی درندے کا شکار بن جائے گا۔“

وہ بے ساختہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

”مگر تم تو جانتے ہو گے ناں۔“ اس نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ تنکے کا سہارا نہ لیتی تو اور کبھی کیا سکتی تھی۔

”ہاں۔ فقط میں پیرزادہ صاحب اور مستانی شاہ ان راستوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔“

”فوج! تم طرز گفتگو چال ڈھال سے کسی شریف خاندان کے دکھائی دیتے ہو۔ یقیناً تمہارے والدین نے تمہیں کسی بے کس اور بے یار و مددگار کی مدد کرنے اور مظلوم کو ظالم کے پنجے سے چھڑا کر نیکی کمانے کے سبق پڑھائے ہوں گے۔ کیا تم میری مدد کرو گے دیکھو میرا اس دنیا میں اپنی دادی کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ وہ میرے بغیر مر جائے گی۔“

مغرور اور متکبر شخص کے آگے اپنی بے بسی اور لا چاری کا اظہار کرنا خود داری کی توہین محسوس ہوتا ہے، لیکن کسی ہمدرد فطرت اور انسانیت کی رفق رکھنے والے بندے کے سامنے مجبور یوں کی گرہیں کھول کر دکھانے میں البتہ کوئی خاص جھجک محسوس نہیں ہوا کرتی، سو اس نے رسک لے ہی لیا تھا۔

”بعض اوقات بچپن میں ہم جو کچھ سیکھتے ہیں بڑے ہو کر معاشرہ اس ”سکھائی پڑھائی“ کو بری طرح رد کر دیا کرتا ہے۔“ اس کے لبوں پر تنقید مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ”والدین تو بچے کو یہ بھی سکھاتے ہیں کہ بد عہدی اور بے وفائی کرنا جرم عظیم ہوتا ہے پھر میں پیرزادہ صاحب کے اعتماد کو نہیں کیسے پہنچا سکتا ہوں۔“

”ظالم کا ساتھ دینا، ظلم کرنے کے برابر ہوتا ہے یہ بد عہدی اور بے وفائی نہیں ہوگی اور پھر تم سوچو

تم جس غلط راستے پر آکھیں بند کر کے اپنے پیرزادہ صاحب کے پیچھے چل رہے ہو اس کا انجام بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔“

وہ غیر محسوس طریقے سے جذباتی بلیک میلنگ کر رہی تھی کہ اس وقت اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

”میں نے خود ہی اپنی مرضی سے یہ راہیں چنی ہیں۔ پیرزادہ صاحب نے کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ میری ضرورتیں مجھے ان کے در تک لے آئی تھیں۔“ اس کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی تھی۔ زمین کچھ مایوس سی ہو گئی۔

”اب انسان کو اتنا بھی نفس کا غلام نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے ایک آخری کوشش کی۔

”میں چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ باپ میرا مزدور تھا۔ ایک دن اینٹیں اور چھت تک پہنچاتے ہوئے راستے میں ہانپ کر نیچے گر پڑا اور کافی دن ہسپتال میں رہا۔ ماں اور بہنوں نے سلائی مشین چلا چلا کر اربانوں سے مجھے ایم اے کر لیا تھا، مگر دو سال جو تیاں جھٹانے کے باوجود کہیں نوکری نہ ملی۔ گھر میں قانون تک کی نوبت آن پہنچی تھی پھر قسمت نے مجھے پیرزادہ صاحب سے ملا دیا اور آج فقط ڈیڑھ سال ہو رہا ہے ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے اور میری چار بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور پانچویں کا جہیز بھی تقریباً تقریباً تیار ہو چکا ہے۔ آخری والی ابھی پڑھ رہی ہے میرے باپ کا علاج ہو رہا ہے میری ماں نے سکھ کا سانس لیا ہے۔ جب بات بنیادی ضروریات کی فراہمی تک آن پہنچے تو ذریعہ معاش ثانوی سی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ میں پور پور پیرزادہ صاحب کا احسان مند ہوں ان کا مشکور ہوں اور ان کے مفادات کا ہر ممکن تحفظ کرنا میرے ایمان میں شامل ہے۔ آپ فرمائیے پہلے کھانا کھائیں گی یا لباس تبدیل کریں گی۔“

اس کے دونوں قطعی انداز نے زمین کو مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا۔ وہ دلگیر سے انداز میں دوبارہ تخت پر جا بیٹھی۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم جاؤ۔“ اس نے نروٹھے پن سے کہا۔

”شام سات بجے تک پیرزادہ صاحب آجائیں گے۔ ان کے آتے ہی میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ پیچھے مستانی شاہ ہی بچے گا۔ وہ اردو قطعی نہیں جانتا، اس لیے اس سے کسی قسم کی کوئی بات پوچھنے یا منوانے کی کوشش بے سود ہوگی۔ اس کا کام باہر پہرہ دینا اور تین وقت کا کھانا تیار کرنا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو یہاں کوئی ذی نفس نہیں ملے گا۔ اس لیے مناسب ہوگا اگر آپ ابھی سے اپنی ضروریات

کی نوعیت مجھے بتا کر ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ اس میں آپ کا ہی فائدہ ہوگا۔ پیر زادہ صاحب کے مزاج کا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ہو سکتا ہے ہر دوسرے تیسرے دن پھر لگاتے رہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہفتوں پلٹ کر خبر نہ لیں۔ ایسے میں آپ مکمل طور پر مستانی شاہ کے رحم و کرم پر ہوں گی جو مقامی بولی کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتا۔ آپ کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔“

وہ اس کی آئندہ زندگی کا دل دہلا دینے والا نقشہ کھینچ رہا تھا۔ وہ بے یقین سی وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کا ایک ایک لفظ نرمین کے اندر عجیب سے واہے اور خوف جگا رہا تھا۔

وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب اس سے میری جنگ نہیں تو اس کے ساتھ معرکہ آرائی سے کیا حاصل ہے۔ اس کی زہنمائی میں وہ بیشک کے واحد دروازے سے باہر نکلی بالکل سامنے ہی لمبا سا کوریڈور تھا جس کے اختتام پر لکڑی کا مضبوط پھانک تھا۔ کوریڈور کے دائیں جانب ایک دروازہ تھا جسے کھول کر وہ اسے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر داخل ہو گیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دو لکڑی کے سادے پٹنگ بچے تھے اور ایک دیوار گیر الماری تھی جسے کھول کر فصیح نے اسے بیگر پر لٹکے کپڑے دکھائے تھے۔ الماری خاصی کھلی تھی اور یہاں بہت سے مردانہ سوٹ بھی بیگرز میں پر لیس کیے لٹک رہے تھے۔ نیچے ریک میں قیمتی مردانہ جوگرز، پٹاوری چپل اور سلپر وغیرہ کے بہت سے جوڑے تھے ایک اسٹینڈ پر کمرے کے دائیں جانب چار پانچ صاف ستھرے تولیے لٹک رہے تھے۔ اسٹینڈ کے ساتھ ہی قدیم طرز کا دیوار گیر قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا اور اس کے عین مقابل کی دیوار میں ایک دروازہ تھا جسے فصیح نے آگے بڑھ کر کھول دیا۔

”یہ باتھ روم ہے۔“ اس کا جائزہ لے کر نرمین کو خاصی حیرت ہوئی۔ باتھ روم جدید لوازمات سے پوری طرح آراستہ تھا۔ اسٹائلش سانیوی بلونا ٹلز باتھ ٹب، جدید طرز کا کموڈ، خوبصورت سائینس ہاف مرز، شیمپو، باتھ سوپ، شاور سب کچھ موجود تھا۔ اتنی قدیم طرز کی دقینوی عمارت میں اتنا شاندار پر عیش باتھ روم۔ یقیناً حیرت ناک بات تھی۔

اس نے بڑی دیر تک غسل کیا، جی بھر کر تھکن اور سفر کی گرد اتاری اور کھل کر آنسوؤں کی برسات کو برسنے دیا۔ اس کے دل کو جیسے کوئی کانچ کے ٹکڑے سے نوچ کھسٹ کر زخم زخم کرتا جا رہا تھا۔ جانے کتنی ہی دیر گزر گئی تھی کہ بند دروازے پر دستک ہوئی۔

”مس! آپ فارغ نہیں ہوئیں۔ پیر زادہ صاحب تشریف لائے ہیں اور کھانے پر آپ کا انتظار

کر رہے ہیں۔“

فصیح نے مہذبانہ انداز میں اطلاع دی۔

اس کا جی چاہا یہیں پانی میں بیٹھے بیٹھے حلوں کر جائے، اس شخص کا سامنا کرنے سے توجہ جائے۔ دل نفرت کے دھوکے سے اس قدر اٹ گیا تھا کہ اسے اس کی آواز اس کا وجود اس کی موجودگی سے وحشت ہو رہی تھی۔

اپنا گرد آلود لباس تبدیل کر کے اس نے ہلکے زرد رنگ کا شلوار سوٹ جیسے طوباؤں کا جسم پر چڑھایا۔ بال جھٹک کر خشک ہونے کے لیے کندھوں پر ڈالے اور ہم رنگ زرد و پٹہ شانوں پر اچھی طرح پھیلا کر بالآخر وہ باتھ روم سے نکل آئی۔

کمرے کے داخلی دروازے پر فصیح اس کا منتظر تھا۔

”آئیے آپ کو پیر زادہ صاحب کے پاس لے چلوں۔“

”پیرہ داری کر رہے تھے تم غالباً۔ فکر نہیں کرو بغیر ”تیاری“ کے نہیں بھاگوں گی۔“ اس کے لبوں پر تلخ تبسم پھیل گیا تھا۔

فصیح نے جھل سا ہو کر سر کھجایا اور پھر اسے ہمراہ لے کر بیشک میں آ گیا۔ عمر دراز خان صوفے پر اپنے مخصوص شاہانہ اسٹائل میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک ہاتھ صوفے کی پشت پر پھیلائے دوسرے ہاتھ میں سگار دہائے دروازے کی سمت متوجہ ہو گیا اس کا منتظر بیٹھا تھا۔

اس پر اچھتی سی نظر ڈال کر اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر فصیح کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ان سے اچھی طرح ان کی ضروریات دریافت کر لینا تھیں کہ بہر حال قیدیوں کی بنیادی ضروریات پورا کرنا فرض ہوتا ہے۔ عیش تو ہم نہ دیں گے اور نہ یہاں ایسا ممکن ہے مگر آرام پہنچانے کی بہر حال کوشش ضرور کریں گے کہ اس بیابان اجازت ویران جگہ قید تہائی کا شائبہ ذات خود ایک کڑی سزا بن جائے گا۔“

وہ مخاطب ہوا تو اس کے لہجہ اور تیوروں میں عجیب درشتی اور بر فیلا پن اتر آیا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی نرمین نے ذرا دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے تاثرات بلا کے سرد اور پتھر لیے تھے۔ وہ عجیب سی بے چینی اور اضطراب کا شکار ہو گئی۔ اسے لگا اس کے اندر جاگتی قوتیں دھیرے دھیرے جیسے کمزور پڑتی جا رہی ہوں۔ اس نے خود کو بہت بے بس محسوس کیا مگر یہ کیفیت بذات خود اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

”ہمارا خیال ہے تم روانہ ہو جلد اور چوہدری افتخار حسن والے معاملے میں جیسا کہ ہم نے تمہیں سمجھایا ہے اپنے بندوں کو گائیڈ کر کے کام پر لگا دو۔ کوئی ضروری بات ہو تو ہمارے موبائل نمبر پر انعام کر دینا۔ ہم آنے سے پہلے تم سے سارا پروگرام طے کر لیں گے۔“

”جی سر!“ وہ ایڈیو کے بل گھوم کر اوداعی سلام کے بعد تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔

وہ بے چینی سے ہاتھ مسلتی اسے جاتا دیکھنے لگی۔ اسے لگا جیسے امید کے جگنو ایک ایک کر کے ہاتھ سے بھسلتے جا رہے ہوں۔ وہ یہاں رہتا تو شاید کسی طور مددگار ثابت ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ”ناک“ کا معاملہ تو نہیں تھا تاں۔ کسی نہ کسی طرح اپنے حق میں کوئی نرمی کوئی روشنی کی درز کا پتالے لیتی۔ اب اس بندے کے ساتھ تو ”آن“ کا مسئلہ ہے نا۔ ناک نیچی ہو ہی نہیں سکتی۔

”یہ زندان تم نے خود منتخب کیا ہے اپنے لیے۔ ہمیں تم سے کوئی ذاتی پر خاش نہیں تھی لیکن تم نے اپنے لفظوں کے انگارے ہمارے سینے میں اتار کے ہمیں سر تا پا آتش فشاں بنا دیا تھا اور اب اس کے نتیجے کے طور پر ہمارے جسم سے پہنے والے ایک ایک قطرے کا حساب لینا ہم پر واجب ہو گیا ہے۔ مردانگی اور غیرت کا خون کرنے والے کسی طور پر معافی کے مستحق قرار نہیں پاسکتے۔ یاد رکھنا مرد کو چیلنج کرنے والی احق خواتین اپنا سب کچھ گنوا لیتی ہیں۔ مرد کو سر تا پا انتقام بنا ڈالتی ہیں۔

مگر ہم تم سے تمہاری عزت نہیں لیں گے کہ یہ بھی اب ہمارے لیے چیلنج بن چکا ہے۔ ہم نے خود سے عہد باندھ لیا ہے کہ تمہاری عزت پامال کرنے کی غرض سے تمہیں خود سے قریب نہیں کریں گے بلکہ اس کے برعکس ہم جو کچھ تمہیں دیں گے یہی تمہاری سزا کے لیے بہت کافی ہوگا۔ اتنی بے آباد ویران جگہ قید تہائی کی صورت میں بخشا ہوا ہمارا یہ ”تحفہ“ تمہیں برسوں ہماری یاد دلاتا رہے گا کہ تم نے کسی عمر دراز خان پیر زادہ کی آن پر حملہ کیا تھا۔“

اس کی طویل پیرائے میں کی جانے والی گفتگو کا حرف حرف پھنکار رہا تھا۔

”اب تم کھانا کھا لو۔ یقیناً ابھی تک تم نے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ کھانے پینے اور ہنسنے اور سونے جاگنے کے جملہ معاملات میں تمہیں کسی قسم کی تنگی یا تکلیف نہیں ہونے دی جائے گی۔“

اس کے یاد دلانے پر نرمین کو یاد آیا۔ تین دن سے ایک کھیل بھی اڑ کر اس کے منہ تک نہیں پہنچی تھی اور اب اس کی آنتیں صحیح معنوں میں قل ہوا اللہ پڑھ رہی تھیں۔

طاقت و دشمن سے بچنے کے لیے اپنی منتشر قوتوں کو مجتمع کرنا بہت ضروری ہوا کرتا ہے۔ سو وہ اپنی انا کی نہ نہ کی آواز کا گلا گھونٹ کر خاموشی سے میز کی طرف بڑھ گئی۔

کھانے میں بھنا ہوا مرغ، فرائی کیے ہوئے گوشت کے پانچہ جات اور مرغ پلاؤ تھا۔ گرم گرم کھانے کی خوشبوؤں نے اس کی اشتہا فزوں تر کر دی۔ وہ بلا تکلف کھانا شروع ہو گئی اور اس کی تاکید سے چوشتری سیر ہو کر کھایا۔

”پتا نہیں دادی نے کھانا کھایا ہوگا کہ نہیں۔“ پیٹ بھرنے کے جہل تھانے نے یہ سوچ قہر طور پر بھلا دی تھی مگر اب یاد آتے ہی ایک دم جیسے اس کا احساس ندامت جاگ اٹھا۔ اس کے حلق میں پھندے سے لگنے لگے۔

”تمہارا کیا پروگرام ہے عمر دراز خان!“ بالآخر اس نے اس سے دو ٹوک بات کرنے کے فیصلے پر عمل درآمد کر ہی لیا۔

اس نے شعوری کوشش سے اپنے لہجے میں کسی قسم کا جھول پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔

”میں تمہیں بتا چکی ہوں میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ مجھے میرے گھر جانے دو۔ تمہارا کام کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔“

اس نے بہت ضبط سے لہجے میں رسائیت برتی تھی۔

”اب معاملہ وہ نہیں رہا۔ نعمان پیر زادہ کا قصہ وہیں ختم ہو گیا تھا۔ آج کے بعد سے دوبارہ اس کیس کے بارے میں تم سے کوئی بات نہیں ہوگی۔ ہمیں اس سلسلے میں اب تم سے کچھ تعاون درکار نہیں ہے۔“

”تو پھر کیوں مجھے روک رکھا ہے۔“ وہ ضبط کرتے کرتے بالآخر چیخ اٹھی۔ ”میں نے تمہارا کیا چھینا ہے؟“

عمر دراز خان کے لبوں پر منہمکی مسکراہٹ در آئی۔

”ہماری ذات کا غرور ہماری آن ہماری مردانگی کا زعم ہماری ہستی کا فخر ہماری انا اور غیرت۔ بڑی لمبی فہرست ہے تمہارے جرائم کی۔ ایسا کون ہے جو ہمیں ہماری ذات کو تعارف کرانے کے بعد بھی اہمیت دیے بغیر غوث سے آگے بڑھ جائے۔ جو ہماری ٹیلی فون کال سے بغیر ریسورسینٹ کی جسارت کرے جو ہمیں جتلائے کہ وہ ہماری رعایا نہیں ہے ہمارے زیر اثر نہیں ہے جس کے لہجے میں ہم سے بات کرتے وقت زمانے بھر کی بے زاری اور زہریلا پن ہو۔ جو ہمارا حکم ماننے سے صاف انکار کر دے جو ہماری گرفت میں ہمارے سامنے دیدہ دلیری سے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ہمیں تحفہ و تحقیر سے دیکھے اور چیلنج کرنے والے انداز میں ہمارا مطالبے پورا کرنے سے انکار کر دے جو ہمیں





اس نے احتیاط سے پھانک کا بھاری پٹ واکیا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ مالک کے حکم کے بموجب پھانک کو کھلا رکھا گیا تھا۔

پھانک سے نکل کر چند قدم آگے بڑھ کر وہ الجھ کر رک گئی۔ اس کے چاروں طرف سیاہ و سبز آسمان سے باتیں کرتے پہاڑ تھے۔ اونچی نیچی گھائیاں تھیں، خاردار جھاڑیاں اور اکادکا درختوں سے ڈھکی کھائیاں تھیں۔ ارد گرد کی فضا میں جنگلی جانوروں اور حشرات الارض کے بولنے کی مہیب آوازیں سماعت میں عجب وہشت ناک شور بن کر گونج رہی تھیں۔

”یا الہی! یہاں سے کہاں جاؤں۔ راستہ کون سا ہے۔ پہاڑ کے اوپر کی سمت سفر کروں یا کسی کھائی کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف جاؤں۔ راستہ کہاں ملے گا؟“

اس کا دل یکا یک خوف اور وہشت کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ پھر اس نے یونہی قیافے سے کام لے کر اترائی کی سمت سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دیرے دیرے جھاڑیوں کی مضبوط شاخوں کا سہارا لے کر پتھروں پر مضبوطی سے قدم جماتی وہ نشیب کی طرف ریٹکنے کے انداز میں آگے بڑھنے لگی۔

آسمان پر بارہ یا تیرہ تاریخ کا چاند روشن تھا۔ روشنی کے باعث دیکھ کر راستہ تلاش کرنا خاصا سہل ہو گیا تھا۔

مگر راستہ یہاں تھا کہاں۔ ہر قدم پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ جاتا۔ وہ اس وقت بہادری کی انتہا کو چھونے کی تک دو دو میں ارد گرد کی ہر اسان کر ڈالنے والی پر اسرار وحشت زدہ فضا سے پیدا ہونے والے خوف و وہشت کو سر سے جھٹک کر پوری کوشش پھیلے پتھروں اور خاردار جھاڑیوں سے بچ کر قدم جانے میں صرف کر رہی تھی۔

اس کا عزم اس کا جنون اس کا ہمسفر بنا ہوا تھا اور نہ اتنے پر بیچ خطرناک راستوں پر کوئی لڑکی دن کی روشنی میں بھی اکیلے سفر کرنے کی ہمت نہ کر پاتی۔

ابھی کچھ ہی قدم آگے بڑھائے ہوں گے کہ ایک جھاڑی کے پاس سے عجب سی پھنکارنے اس کی مٹی گم کر ڈالی۔

”سانپ!“ خوف سے اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

ابھی وہ اپنے دھک دھک کرتے دل کو سنبھال نہیں پائی تھی کہ اس نے سامنے مقابل کے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ایک درندے کی دل دہلا دینے والی چٹکھائی مٹی۔ اس نے گردن موڑ کر ادھر دیکھا اور جیسے

اس کی روح نفسِ عنصری جستہ جستہ پرواز کرنے لگی۔

چیتے کی انگاروں کی طرح دہکتی آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ اس نے اضطرابی انداز میں حرکت کرتے ہوئے اپنے نیچے کی سمت جاتے قدم روک لیے اور خوف سے مفلوج حیات بمشکل تمام بیدار کرتے ہوئے واپس اوپر کی سمت جانا چاہا مگر اس اثنا میں اس کا حرکت کرتا وجود چیتے کی نظروں میں آچکا تھا۔ اس نے دیرے دیرے چوٹی سے نیچے نشیب کی طرف جہاں وہ کھڑی تھی تھر تھر کانپ رہی تھی بڑھنا شروع کر دیا۔ اس کی گھٹھی بندھ گئی۔

اسی لمحے جھاڑی سے سانپ کی پھنکار دوبارہ کان میں پڑی۔ اس نے خوفزدہ ہو کر جھاڑی کی شاخیں چھوڑ دیں جن کا سہارا لے کر وہ کھڑی تھی۔ اچانک توازن بگڑا یا شاید کانپتی لرزتی ٹانگوں نے جواب دے دیا کہ وہ بری طرح لڑکھڑا کر نیچے نشیب کی طرف گرنے لگی۔ جہاں چیتا گیا اس کا منتظر تھا۔ خوف کی انتہاؤں پر حواس سے مکمل طور پر رابطہ منقطع ہونے سے پہلے اس کی سماعتوں نے راتفل کی کان پھاڑ دینے والی آواز پر جواب میں درندے کی ڈکرائی آواز ضرور محفوظ کر لی تھی۔



ایک بار پھر ہوش کی وادی میں واپس ہوئی تو اس کے تصور میں اس پر اسرار وہشت ناک رات کے تمام تر بد صورت اور ہولناک ڈراؤنے نظارے پوری صراحت کے ساتھ روشن ہو گئے۔

”مم..... میں کہاں ہوں۔“

”تم بالکل ٹھیک ہو زمین! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“ ایک مہربان آواز اور ہاتھ کا لمس اسے اپنے بہت قریب محسوس ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا۔ سامنے کھڑکی سے صبح کے آثار نظر آرہے تھے۔ بگیوں کے سہارے تخت پر دراز تھی اور عمر دراز خان اس کے بہت قریب بیٹھا اس کے ماتھے پر پھنڈی پٹیاں رکھ رہا تھا۔ اس کا بدن بخار سے جھلس رہا تھا۔ خوف و وہشت کی شدت نے جیسے اس کی رگ رگ میں آگ بھڑکا دی تھی۔

”وہ..... وہ..... رات کو۔“ اس نے انک انک کر کچھ کہنے پوچھنے کے لیے عمر دراز خان کا پٹیاں بدلتا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی تمام تر پرچھائیاں سمٹ آئی تھیں۔ لہجہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔

”سب ٹھیک ہے زمین ارات کو ہم کہیں دور نہیں گئے تھے۔ تمہاری حفاظت کے خیال سے ادھر ہی رہ گئے تھے۔ ہمیں خدشہ تھا کہ تمہیں کسی خطرناک صورت حال سے واسطہ نہ پڑے۔ اس وقت ہم

پہاڑوں پر ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ جب ہم نے اس درندے کو تہہاری طرف جھپٹتے دیکھا تو گولیوں نے اس کو ٹھنڈا کر دیا تھا اور تم خوش قسمتی سے نیچے کھائی میں جاتے جاتے ایک جھاڑی میں چھس گئی تھیں اس طرح بچاؤ ہو گیا۔ پوری رات بے ہوشی اور بخار میں جتا رہی ہو۔“

”عمر دراز خان!“ نرین کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

اس روٹنے کھڑے کر دینے والی دلدوز اور قاتل ڈراؤنی گھڑیوں کا تصور کچھ ایسا دہشت طاری کر دینے والا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہ رہی۔ بے ساختہ بے اختیاری اور خود فراموشی کے عالم میں وہ سکتی ہوئی عمر دراز خان کے کندھے سے جا گئی۔

”ارے ارے کیا ہو گیا۔ نرین یار! ٹیک اٹ ایزی۔ سب ٹھیک ہے۔“

اس کے انداز میں بلا کی رسائیت اور نرمی در آئی تھی۔

جانے کب وہ روتے روتے یونہی اپنے آپ سے غافل ہو گئی۔

عمر دراز خان نے اسے کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھال کر بہت آہستگی سے اس کے ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانہ وجود کو دوبارہ تخت پر لٹا دیا تھا اور اب پر تشویش انداز میں اس کی ہنسی چیک کر رہا تھا۔



”ہیلو۔“ موبائل فون کی ٹھنکی بج کر ہلان ہو گئی تھی تو اس نے اٹھنا کھینچ کر بالا خرپک کر لیا۔

”ہیلو۔ السلام علیکم۔ جی جناب کیا حال چال ہیں۔ کہاں ہوتے ہیں جناب عمر دراز خان پیرزادہ صاحب صحیح معنوں میں ہمارے لیے تو عید کا چاند بن بیٹھے ہیں۔“

دوسری طرف سے چپکتی لہکتی بٹاش زنا نہ آواز جیسے چھای گئی تھی۔

عمر دراز خان کے ہونٹوں پر مبہمی مسکراہٹ کی کرنیں بکھر گئیں۔ وہ پہچان چکا تھا۔ یہ شہر کی مشہور سوشل ورکر اور ایک سماجی تنظیم کی لیڈر نیلوفر صدیقی تھی۔ اس کے ساتھ بڑی اچھی علیک سلیک تھی۔

”چاند تو چاند ہی ہوتا ہے یعنی نایاب اور رسائی سے بہت دور۔“ اس کا ہاتھ بدستور فائلوں پر جما ہوا تھا۔

”کیسے یاد کر لیا؟“

”یاد تو آپ بغیر وجہ کے بھی آتے ہی رہتے ہیں۔“ بڑا معنی خیز جواب آیا تھا۔ پھر ساتھ میں ایک ٹھنڈی سانس بھری گئی۔ ”آپ ہی ہمیں بھول بیٹھے ہیں۔“ بڑے دلنشین انداز میں شکوہ کیا گیا۔

”آپ بھولنے والی چیز تھوڑی ہیں۔ بہر حال فرمائیے۔“ اس نے مشینی انداز میں جیسے تیار شدہ

جواب دیا۔

”ہماری تنظیم کے تحت پچھلے سال نفسیاتی امراض کی شکار خواتین اور بچوں کے لیے ”امن ہاؤس“ کے نام سے ایک ادارہ کھولا گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد اس کی پہلی سالگرہ ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک تقریب کا اہتمام کیا ہے اور سب کی منتظر رائے اور خواہش ہے کہ آپ کو اس تقریب کا مہمان خصوصی بنایا جائے۔“

”ایک ہفتے بعد۔“ اس نے سامنے لگے خوبصورت سے کیلنڈر کو نظروں سے ٹٹولتے ہوئے دیکھا۔

”جی ہاں۔ پلیز پیرزادہ صاحب آپ کی تشریف آوری ہمارے لیے بہت بڑی عزت افزائی ہوگی۔ آپ کی آمد کا سن کر خود بخود میرا ہم شخصیات مدعو کرنے پر کھنچی چلی آئیں گی ورنہ تو آپ جانتے ہیں یہ بڑے لوگ ٹال مٹول کرنے لگتے ہیں۔“

وہ اس کی ہچکچاہٹ محسوس کر کے فوراً صراحت پر اتر آئی تھی۔

”اچھا چلیں۔ ہم غور کرتے ہیں۔“ اگر بڑا آدمی پہلی دفعہ میں ہی ہاں کر دے تو اس کی بڑائی کون تسلیم کرے گا۔

”پلیز جناب! ہم گزارش کرتے ہیں کہ غور سے کچھ آگے بھی کیا جائے۔“ نیلوفر صدیقی اثبات میں جواب پانے کو چلی تھی۔ آخر ٹھیک ٹھاک موٹی اسامی تھی۔ دولت و شہرت کی فراوانی تھی۔ اس کی آمد سے خود بخود پریس میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا حرکت میں آجائے گا اور اس طرح اس تنظیم کی شہرت پر لگا کرڑے گی۔ پھر نوازے گا بھی بہت۔ ہر لحاظ سے مہمان خصوصی بنانے کے لیے سود مند شخصیت تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ ہم فرصت نکال لیں گے لیکن آپ احتیاطاً ایک دن پہلے میرے سیکرٹری کو یاد کروا دیجیے گا۔“ اس نے خیر ملی رد و کد کے بعد بے نیازی سے ہامی بھر لی۔

”ٹھیک یو دیری سچ پیرزادہ صاحب!“ دوسری طرف کا جوش و خروش اور جذبہ سپاس دیکھنے کے قابل تھا۔

”اؤنہ۔ یہ فالتو کی مصروفیات۔“ اس نے آف کرتے ہوئے بڑبڑا کر خود سے کہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فائلیں ایک طرف کھسکاتے ہوئے انٹرکام کے بٹن پر پیش کیے۔

”فصیح کو اندر بھیج دو۔“

دوسری طرف سے مودبانہ ”جی سر“ سن کر اس نے تھکمانہ کہہ کر ریسور رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سرخم کیے اس کے سامنے حسب معمول اس کے حکم کا منتظر تھا۔

”ہماری جیب نکالو فصیح!“ ایزی چیر کی پشت سے سر نکالتے ہوئے اس نے قیمتی پارک پر تین بند کر کے میز پر گرادیاتھا۔

”اور دیکھو۔ لباس سفر ہے۔ اچھی طرح پیٹرول وغیرہ چیک کر لینا اور وہ سامان جو ہم نے تمہیں لانے کو کہا تھا۔“

”سر! وہ میں لے آیا ہوں۔“ فصیح نے جلدی سے کہا۔

”ٹھیک ہے! اسے بھی جیب میں رکھو اور مستانی شاہ کو اطلاع کر دو ہم شام تک پہنچ جائیں گے۔ ہمیں دو تین دن لگ جائیں گے ادھر۔ ہماری غیر موجودگی میں تمہیں کس طرح ہینڈل کرنا ہے ہم تمہیں بریف کیے دیتے ہیں۔ آؤ بیٹھو۔“

سامنے والی کرسی پر بیٹھتا فصیح پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ باس کس لیے سفر پر جاتا ہے۔



یہ ایک فطری سا امر ہے کہ جب انسان بہت شدت سے رو لے تو آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں جبہ زخم لگنے کا تسلسل بڑھتا ہی چلا جائے تو ٹیسس اٹھنا ختم ہو جاتی ہیں پھر درد نہیں رہتا بلکہ بے حسی طارا ہو جاتی ہے۔ سوچیں جب انتہاؤں کو چھو کر بغیر کسی عملی صورت کے واپس مایوس پلٹنے لگیں تو ذہن خالی ہو کر رہ جاتا ہے پھر اجتماعی بے حسی کی کیفیت انسان کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ وہ بھوک پیاس اشدتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ صبح شام اگر کھاتا بھی ہے تو اس طرح جیسے ایک روٹین ورک تھا پو کر لیا۔ رات کو سوتا اور دن کو جاگتا یوں ہے جیسے مشین آف اور آن ہوتی ہے۔ سوچ! یاد خوشی! غمی! احساس برف بن جاتا ہے۔

انسان چلتا پھرتا رو بوٹ بن جاتا ہے۔

وہ اتار روٹی تھی کہ اب اندر سے سارے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ اپنے گزرے ایام کو پیچھے جانے والے رشتوں کو اتنا یاد کیا تھا کہ اب خود فراموشی والی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ جیسے اب یاد ساتھ چھوڑنے لگی تھی۔ جب انسان ہر ممکن کوشش کے باوجود ناکام رہے تو صبر کے ماسوا اور چارہ رکھتا بھی کیا ہے اور وہ بہت سارا صبر کر چکی تھی۔ بہت سارے تعلق آنسوؤں کی برف میں دفن کرتا تھی۔

وہ دادی کو بھی رو پچی تھی۔ اپنے آپ کو بھی اور اپنی ہر جس کو بھی۔ ایک بے جان لاشے کی طر

ادھر ادھر چکراتی پھرتی تھی۔ اب تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا نہ قید تہائی ڈراتی تھی نہ ماضی کی یادیں ڈستی تھیں اور نہ پھنسنے کا دکھ سنا تھا۔

ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی ارد گرد کی خاموش وحشت زدہ فضاؤں کو کتنی وہ بڑی بے دم سی ہو کر بیٹھی تھی۔ اندر ہی اندر فرار کی ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد اب وہ مکمل طور پر حالات سے سمجھوتا کر چکی تھی اور یوں بھی اب پیچھے کیا بچا تھا جس کے لیے وہ تنگ و دو کرتی۔

عزت! آن! آبرو! شرافت و نجابت سب ختم تھا۔ کون یقین کرے گا اس کا۔ تین ماہ۔ ایک طویل عرصہ گھر سے غائب رہنے والی لڑکی کے لیے گواہی کہاں سے آئے گی؟ وہ دنیا والوں کے لیے مر چکی تھی۔

کتنی ہی دیر سے وہ مکان سے کچھ فاصلے پر اس جگہ بیٹھی بے سبب سامنے والے پہاڑ کی چوٹی پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ پہلے پہل مستانی شاہ اس کے پھانک سے باہر نکلنے پر اس کے ہمراہ آتا تھا۔ غالباً حفاظت کے خیال سے لیکن اب چونکہ وہ ارد گرد کی فضاؤں سے مانوس ہو چکی تھی اس لیے وہ اپنی جگہ پھانک کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔

شام کے سائے آہستہ آہستہ ماحول کو اپنے حلقے میں لینے لگے تھے۔ معاً سامنے والی چوٹی پر ایک انسانی ہیولا نمودار ہوا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی باعث وہ پہچان نہیں سکی۔

پتا نہیں دوست ہے کہ دشمن۔ خیر انسان تو ہے ناں۔ اس ویرانے میں کسی کے ساتھ کیا دشمنی کی جا سکتی ہے۔

وہ تجسس ہی ہو کر دیکھنے لگی۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ادھر ہی آ رہا تھا اور پھر جونہی وہ اس کے قریب آیا اس کا تجسس دم توڑ گیا۔ وہ عمر دراز خان تھا۔

اس دفعہ بڑے عرصے بعد آیا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس بار وہ کوئی تین ہفتے بعد آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین بیگ تھے جنہیں زمین پر نیچے رکھتے ہوئے وہ اس پر بھر پور نظر ڈال کر مسکرا کر اس کی سمت بڑھا۔

”السلام علیکم۔ کیا حال ہے۔“

بلکہ آسمانی ڈھیلے ڈھالے چکن کے شلوار کرتے میں اس کا متناسب سراپا اور اس کی اجلی شفاف رنگت جیسے لودینے لگی تھی۔

زمین کے اندر جیسے شعلے سے جلنے لگے۔

”قیدیوں کو اتنا بھی ستانا ٹھیک نہیں ہوتا۔“

”ہم تمہیں قیدی تو نہیں سمجھتے تم تو راج کر رہی ہو۔“ اس کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔

”عمر دراز خان! بڑی بھاری قربانی دی ہے اصولوں کی فتح کے لیے۔ پھر بھی کرچی کرچی دل لیے استقامت سے کھڑی ہوں۔ اگرچہ آبلہ پا ہوں۔ دل مردہ ہے مگر ضمیر ہنوز زندہ ہے اس لیے خدا نے برداشت کی حدیں بھی بڑھادی ہیں مگر تم سناؤ بے ضمیری کی سیاہ گردن تمہارے کثیف دل پر کتنا وزن اور لاداہے؟“ اس کا دل جتن جتن چٹخ گیا تھا۔

”یہ سزا تمہارا اپنا انتخاب تھی۔ تمہاری عاقبت نااندیشی کا نتیجہ تھی۔ ہماری اتنا وغیرت اور مردانگی پر حرف گیری کرنے والا ہمارا اسکون برباد کرنے والا چین کی نیند کیسے سو سکتا ہے..... بربادیاں اس مقدور کیوں نہ بنیں۔“ نرمن کے زہریلے انکارہ لہجے کی تپش نے اسے بھی بھڑکا کے رکھ دیا۔ اس کی ساری لطیف مزاجی ٹپٹ ہو کر رہ گئی تھی۔



ان کے لیے ہی سلسلے تھے۔ آغاز میں نیلوفر صدیقی نے اپنی تنظیم کی کارکردگی اور ”امن ہاؤس“ کے قیام کی وجوہات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پھر مہمان گرامی کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ڈاکس آنے کی زحمت دی گئی۔

چائے کی فارمیٹیز پوری ہوئیں تو مہمان گرامی کو اہم سیاسی و سماجی شخصیات پرپرس اور نو گرافرز کے ہمراہ ”امن ہاؤس“ میں مقیم نفسیاتی مریضوں سے ملوایا گیا۔ نیلوفر صدیقی امن ہاؤس انچارج مسز ذکیہ کے ہمراہ پیش پیش تھیں۔ مسز ذکیہ ہر مریض کی کیس ہسٹری اور بیک گراؤنڈ فر فر رہی تھیں۔

چلتے چلتے وہ ایک بوڑھی بے حال سی عورت کے بڈ کے پاس رکے۔ کچھڑی بال میلے پھٹے پر۔ کپڑے ناخنوں میں جمائیل ویران آنکھیں، بخر سرپا۔ بظاہر اس میں کوئی ٹھٹھکا دینے والی چیز نہیں اور شاید نیلوفر صدیقی مہمانوں کے ہمراہ ایک منٹ رک کر آگے بڑھنے ہی والی تھیں جب بڑھیا۔ چونک کر عمر دراز خان کو دیکھا۔ پھر ایک جھٹکے میں اس کا گریبان تھا ملایا۔

”مینا..... میری مینا کو دیکھا ہے۔“ بڑا بے قرار انداز تھا۔ ”میری نرمن تھی ناں۔ صبح کی اسکول ہوئی ہے واپس ہی نہیں آئی۔“

اسے بتاتے ہوئے آخر میں وہ بڑی استعجاب آمیز معصومیت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”نرمن!“ عمر دراز خان کو ایک جھٹکا سا لگا۔

”میرا اس دنیا میں دادی کے سوا کوئی نہیں ہے وہ میرے بغیر بے موت مر جائے گی۔“ اس کے ذہن میں نرمن کا جملہ ترپا اور جیسے ترپ کر سکتا ہو گیا۔

”یہ بے چاری بڑی بد نصیب ہے۔ ایک ہی پوتی تھی اس کی وہ تین چار ماہ پہلے لاپتا ہو گئی۔ اس کے غم میں یہ پاگل ہو گئی۔ ایک دن پاگلوں کی طرح اسے پکارتی ہوئی سڑک پر جا رہی تھی کہ ایک گاڑی کے نیچے آگئی اور اپنی دونوں ٹانگیں گنوا بیٹھی۔ ہاسپٹل والوں نے ضروری علاج کے بعد اسے ادھر بھیج دیا۔“

مہمان گرامی کی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسز ذکیہ نے اس بڑھیا کے بارے میں مفصل بتا دیا۔ ”مینا کہاں ہے..... میری مینا۔ اپنے امی ابو کے پاس چلی گئی ہوگی ہے ناں۔“ بڑا معصومانہ استفسار تھا بڑھیا کا۔

عمر دراز خان کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ ہزار خود پہ قابو پانے کی کوشش میں اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ ”آجائے گی مینا اماں!“ دھیرے سے کہہ کر اس کا شانہ تھک کر وہ بے جان قدموں سے آگے بڑھا تھا۔



بخر پتھر ٹلی سیاہ چوٹیوں کے عقب میں سورج کا تھل نمودار ہو چکا تھا اور اب آہستہ آہستہ اوپر کی سمت بڑھ کر پھیل رہا تھا۔ اٹھ کر تخت کے کبل اور گاؤں کیے درست کرتے ہوئے اس نے کھڑکی کے دونوں پنٹ کھولے پھر میز سے چابی اٹھا کر دروازے کا لاک کھولا اور فریش ہونے کے لیے دوسرے کمرے کی سمت قدم بڑھائے۔ رات کا عمر دراز خان آیا ہوا تھا۔ وہ ادھر سو رہا تھا۔ اس نے ہلکے سے دروازہ پیش کیا۔ وہ کھلا تھا۔

جس رات وہ ادھر ہوتا تھا نرمن بیٹھک والے کمرے میں سوتی تھی۔ وہ سونے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہی رکھتا تھا کیونکہ باتھ روم کا واحد دروازہ اسی کمرے میں کھلتا تھا۔ آہستگی سے اندر داخل ہو کر غیر ارادی طور پر اس نے پلنگ کی طرف نظر کی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ دھیرے سے الماری سے اپنے کپڑے نکال کر باتھ روم چلی گئی۔

فریش ہو کر خاصی دیر بعد باہر نکلی تو عمر دراز خان جاگ چکا تھا۔ پلنگ پر ٹکیوں کے سہارے نیم دراز



سکار کے کش لیتے ہوئے اس کی نظریں چھت پر بنے مکنزی کے جالے میں الجھی ہوئی تھیں۔

کھٹکے پر اس نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ سیاہ پھولدار شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ سیاہ دوپٹہ شانوں پر برابر کرتے ہوئے اپنے نیلے بالوں کی لٹیس کان کے پاس سے پیچھے کی طرف کرتے ہوئے اس نے عمر دراز خان کی نظروں کی محویت کو پوری شدت سے محسوس کیا اور بظاہر بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مگر باطن گھبراہٹ چھپانے کو رخ پھیر کر دیوار گیر آئینے کے سامنے برش لے کر بال سلجھانے لگی۔

”زمین!“ وہ اٹھ بیٹھا اور پلنگ چھوڑ کر عین اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔

”جی۔“ اس کے طرزِ مخاطب کی نرمی پر زمین کو بڑا چنچھا ہوا مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا، اپنا

لب دلچہرہ ساٹ ہی رکھا۔

”اپنے شہر واپس چلو گی؟“ دھیسے سے استفسار کرتے ہوئے اس نے دائیں شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ جیسے کھولتے ہوئے تیل کے کڑا ہے میں پھینک دی گئی۔

”کیا.....؟“ اڑے اڑے حواس بشکل مجتمع کرتے ہوئے اس نے اپنی پوری طاقت صرف کر کے اس کی سمت دیکھا تھا۔ نگاہوں کے آگے بری طرح دھند سی چھائی محسوس ہو رہی تھی۔

”کیا کہا تم نے عمر دراز خان۔“ اس کی آنسوؤں میں گھلی نم دار آواز جیسے کسی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

زمین کو لگا جیسے کچھ ساعت جاتی ہے جب اس کے تمام حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے، جسم۔ روح نکلتی کچھ ایسے ہی محسوس ہو رہی تھی جیسے کورابدن خاردار جھاڑیوں پر سے بے درد دی سے کھینچا جا رہا ہو۔

”گوتم نے ہمارا بہت نقصان کیا ہے، تمہاری سزا میں اتنی جلدی ترمیم کی منجائش نہیں نکلتی تھی، مگر تمہاری دادی کی دگرگوں حالت کے پیش نظر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ تمہارے لیے یہ بہت کافی ہے۔ ہم شام کو روانہ ہو رہے ہیں۔ تم تیاری کر لو۔ ہم تمہیں تمہارے گھر کی دہلیز پر چکر واپس پائیں گے۔“

”دادی! دادی.....!“ جیسے نئے سرے سے وہ بننے کے مراحل سے گزرنے لگی۔ ”کیا وہ ز“

ہیں؟“ بہت ہچکچا کر اس کی سمت دیکھتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔

”ہاں..... زندہ تو ہیں۔“ وہ نظر چرا گیا۔ ”تم دیکھ لیتا۔“

”ہاں..... میں چلوں گی۔“ دادی کی زندگی کی نوید کیا ملی اس کے شوق کی ساری حدیں انگڑائی لے کر جیسے بیدار ہونے لگیں۔ وہ یہ بھی فراموش کر گئی کہ چار ماہ بعد جب وہ ”اس“ دنیا میں قدم رکھے گی تو زمانہ اس کی پذیرائی کے کیا کیا سامان نہ کرے گا۔

عمر دراز خان بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے پر بکھرے شوق کے رنگ ملاحظہ کر رہا تھا۔ بڑے عرصے بعد اس کے چہرے کے برقیلی تاثرات تبدیل ہوئے تھے۔

”کنویں کے اتنے قریب رہ کر بھی پیاسا رہنا بہت عالی ظرف لوگوں کا کام ہوا کرتا ہے اور دیکھ لو ہم نے کتنا ضبط رکھا ہوا ہے۔“

وہ اک شانِ قفا خریے بتلا رہا تھا۔

زمین کے روئیں روئیں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ وہ کوئی جھلٹا ہوا جواب دیتے دیتے رہ گئی کہ کہیں وہ غضب ناک ہو کر اپنی سابقہ پیشکش واپس نہ لے لے۔ دادی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ایک بار ان کے سینے سے لگ کر دل کا غبار نکالنے کے لیے تو وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔

شام کے سائے گہرے پڑتے ہی وہ عمر دراز خان کی معیت میں باہر نکل آئی۔ نیچے اترائی تک کا راستہ بہت دشوار تھا۔ وہ کتنی ہی بار لڑھک کر گرتے گرتے بچی اور کتنی ہی بار عمر دراز خان کے آہنی پر حرارت بازوؤں نے اسے سنبھالا دیا تھا۔ وہ ہر طرح کے انتظامات کر کے چلا تھا۔ کندھے پر لوڈ ہوئی راکفلٹ لنگ رہی تھی، پینٹ کی جیب میں ریو الوراڑ سا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا پمپل لوڈ کر کے حفاظت کے خیال سے زمین کو بھی تھما دیا تھا۔

کتنی بار وہ اس سے پوچھ چکی تھی کہ کتنا فاصلہ باقی ہے اور ہر بار اس نے تسلی بخش جواب دیا تھا۔ بس تھوڑا اور۔

مگر اب اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اونچے نیچے پتھروں پر چلتے چلتے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔

”مجھ سے نہیں اب اور چلا جاتا۔“ بالآخر وہ ہانپ کر پتھر ملی گزر گاہ پر بیٹھ گئی اور سانس درست کرنے لگی۔ وہ حال سے بے حال ہو رہی تھی۔

عمر دراز خان نے رک کر اس کی سمت متذبذب انداز میں دیکھا۔ وہ تقریباً بے سدھ ہونے کو تھی۔

”بس اب تو واقعی تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے۔“ وہ فلاسک سے پانی نکال کر اسے دیتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”نہیں پلیز مجھ سے اب اور نہیں چلا جاتا۔“ وہ بے دم ہو رہی تھی۔

”وقت بہت تنگ ہے، ہمیں جلد از جلد شہر پہنچنا ہے اور ابھی سفر بہت لمبا ہے، کوئی جنگلی درندہ ادھر نکل آیا تو مصیبت ہو جائے گی۔ اکیلے ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی مگر اب تمہارے ساتھ ہم ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ تم تھوڑی ہمت سے کام لو اب فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔“

بالآخر وہ جیپ تک پہنچ ہی گئے پھر ایک لامتناہی سفر شروع ہو گیا۔ جانے کتنے گھنٹے گزر گئے جیپ چلاتے چلاتے۔ سڑک میں اس نے فصیح سے موبائل فون پر رابطہ کے بعد کچھ ہدایات بھی دیں۔ صبح کا ذب کے آثار افق پر نظر آ رہے تھے۔ جب جیپ اس کے محلے کے مانوس راستوں سے گزرتی گھر کے گیٹ پر آ کر رکی۔ اپنے گھر کے گیٹ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے جسم و جاں میں عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ ایک عجیب سے کرچی کرچی کر دینے والے احساس نے جیسے اس کے پورے وجود کو حصار میں لے لیا۔

نامانوس رستوں، گلیوں، درپچوں اور مکانون سے کتنا خوف سا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ان کی زبانیں نکل آئیں گی اور سب کے سب مل کر بو لے لگیں گے۔

اس نے یونہی کسی احساس سے ٹھٹھک کر اس کی طرف گردن موڑی۔ وہ نہایت سکون کے عالم میں اس کی طرف ایک تنگ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ کے جمود نے اسے جزبہ سا کر دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بڑی آہستگی سے اس نے نظر اور گردن پھیر لی تھی۔ اسی لمحے اس نے اس کے توانا باز اور گرم سانسوں کا لمس اپنے ارد گرد محسوس کیا۔

”فصیح کو ہم نے ہدایت کر دی تھی۔ وہ امن ہاؤس والوں سے معاملات طے کر کے تمہاری دادی کو یہاں لے کر آئے ہی والا ہے، ان کی حالت دیکھ کر یقیناً تمہیں دھچکا پہنچے گا لیکن بہر حال یہ سب شاید ایسے ہی ہوتا تھا۔“

”میری دادی! کیا ہوا انہیں؟ وہ گھر پر نہیں ہیں تو کہاں ہیں؟“ اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔ دل کسی بری خبر سننے کے واہموں تلے پڑا تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اس نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”وہ کیسی ہیں؟“ وہ بلا ارادہ نظر مچرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”کچھ دیر بعد تم ان سے مل لو گی۔“

”کیا کیا ہے تم نے دادی کے ساتھ؟“ اسے برے برے ہول آرہے تھے۔ بے ساختہ اس کے ہاتھ کو چھوڑ کر چیخ پڑی۔

”ہم نے کیا کرنا تھا۔ تمہاری جدائی شاید لے ڈوبی ہے۔“ اس نے کیلا انداز اختیار کر لیا۔ پھر اسے چھوڑ کر سیٹ پر سیدھا ہو گیا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔

”بہر حال تمہارے تمام تر توہین آمیز رویوں کے باوجود ہم نے تمہاری آبرو پر حرف نہیں آنے دیا اور جیسے لائے تھے ویسے ہی چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہمارے حصے کا باقی انتقام زمانے کی نگاہیں اور اس معاشرے میں بسنے والے افراد خود تم سے لے لیں گے۔ یوں سمجھو ابھی تک تم جنت میں تھیں، سزا کا اصل دور تو اب شروع ہوا ہے، کیسے کس طرح کیونکر؟ یہ بات تم خود ہی بہت جلد جان جاؤ گی۔ خدا حافظ۔“ اس کے لہجے میں عجیب سرور پن در آیا تھا۔

اسی اثنا میں سفید کرولا جیپ ان کے پاس آن رکی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر فصیح براجمان تھا۔ عمر دراز کو غالباً اسی کا انتظار تھا۔ نظر آتے ہی زمین کے جیپ سے اترنے کے بعد تیزی سے جیپ آگے بڑھالی تھی۔ ارد گرد کے کچھ گھروں کے لوگ بیدار ہو گئے تھے اور بہت تجسس کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔



قاتل چپ ہے، خون آلودہ ہاتھ میں اب تک

خنجر تھر تھر کانپ رہا ہے

لوگوں کا انبوہ اسے گھیرے میں لے کر

چیخ رہا ہے

یہ قاتل ہے

یہ قاتل ہے

خاک اور خون میں لت پت لاش کے ہونٹوں پر اک بات جی ہے

یہ قاتل ہے

لیکن کس کا؟ اس نے خود کو قتل کیا ہے

لوگوں کا انبوہ مگر کب سنتا ہے

کون ہے قاتل

کس نے کس کو قتل کیا ہے

اس کے قدموں تلے فٹ پاتھ کی سخت زمین تھی اور سر پر چٹلائی ہوئی دھوپ، دور تک سائبان کا نام

ونشان نہیں تھا۔ اس کے تیز قدم محکم کی پروا کیے بغیر بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

”اس پانی پیٹ کے لیے کیا کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔“ راستے میں رک کر اس نے سینڈل کے اسٹریپ دوبارہ بند کیے اور پھر چل پڑی جیسے چلتے رہنا بھی اس کی ڈیوٹی میں شامل ہو۔  
بالآخر اسکول کی عمارت تک پہنچ ہی گئی۔ داخلی گیٹ پر ضروری کارروائی سے گزرنے اور آدھ گھنٹہ اسٹاف روم میں انتظار کی مشقت برداشت کرنے کے بعد آخر کار اسے پرنسپل کے کمرے میں جانا نصیب ہوا۔

”باقی تو سب ٹھیک ہے مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی بی بی! کہ آپ نے نیازی صاحب کا اتنے اچھے اسٹینڈرڈ کا اسکول کیوں چھوڑا۔ وہ تو عنقریب اب کالج لیول تک پہنچنے کو تھا۔“ پرنسپل صاحبہ نے اس کے ڈاکومنٹس وغیرہ چیک کر کے پیپر ویٹ ہاتھ میں گھماتے ہوئے کسی قدر تحیر اور محسوس سے دریافت کیا۔ چند ٹائیپ کو جیسے اس کا سارا اعتماد بھک سے اڑ گیا۔ وہ لب بستہ بیٹھی رہ گئی۔ پھر خود پر قابو پا کر رسان سے جواب دیا۔

”دراصل ہم نے ادھر سے گھر شفٹ کر لیا ہے اس لیے آنے جانے کی پرابلم تھی۔ وہ یہاں سے خاصا دور پڑتا ہے اس لیے۔“

”کب کیا ہے آپ نے گھر شفٹ؟“ پرنسپل نے یونہی برسمبل تذکرہ ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔  
”کل ہی شفٹ ہوئے ہیں ادھر۔“

چند سرسری سے سوال و جواب کے بعد بالآخر بات طے ہو گئی۔ اس کا اکیڈمک ریکارڈ بہترین تھا۔ اتنے اچھے انگلش میڈیم ہائی اسکول میں ڈیڑھ سال پڑھانے کا تجربہ رہا تھا اور پھر انہیں ضرورت بھی تھی۔ سو تھوڑی سی رسمی رد و کد کے بعد اسے رکھ لیا گیا۔

”دیکھیں بی بی! ایک بات ابھی سے آپ پر واضح کر دوں یہ اسکول پرائیویٹ ہے اور پرائمری کلاس تک ہے۔ اس کو کھولے ابھی ڈیڑھ دو سال ہوئے ہوں گے اس لحاظ سے نیا بھی ہے چنانچہ تنخواہ کے معاملے میں آپ کو اپنی سابقہ پے کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ ہم فی الحال آپ کو دو ہزار پر رکھ رہے ہیں اس سے زیادہ یہ ادارہ ان فورڈ نہیں کر سکتا البتہ بعد میں حالات بہتر ہوتے ہی آپ کی کارکردگی کے مطابق آپ کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا جائے گا۔“

زمین نے طویل سانس لے کر پرنسپل کی طرف دیکھا اور خوش اخلاقی کا دکھاوا کرنے کے لیے یونہی لب پھیلا کر سر ہلا دیا۔

”دو ہزار۔“ اسکول کی عمارت سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا۔ ”اس کا مطلب ہے گزارہ کرنے کے لیے شام کی ایک نوکری اور بھی تلاش کرنا ہوگی۔“

واپسی کے لیے قدم موڑتے ہوئے ایک اور بوجھ آن پڑا تھا پھر کچھ جدوجہد کے بعد اسے ایک ”کمپوزنگ سینٹر“ میں جاب مل گئی۔ خوش قسمتی سے بی اے کے بعد کمپیوٹر کلاسز لینے کا شوق اس کے کام آیا تھا۔ دادی کے ہزار شور مچانے منع کرنے کے باوجود اس نے زلٹ کے انتظار میں گھر بیٹھنے کے بجائے وہ نو ماہ کمپیوٹر کورس کرنے میں صرف کر دیے تھے۔ سواب اس کا فائدہ ہوا تھا۔ ٹائمنگ دو پہر دو بجے سے شام پانچ بجے تک کے تھے۔ سواں کے لیے پرابلم نہیں تھی۔ اسکول گھر سے واکنگ ڈسٹنس پر تھا۔ ڈیڑھ بجے وہاں سے فارغ ہو کر گھر جاتی۔ دادی کو کھانا کھلاتی اور پھر انہیں سلا کر وہ مین روڈ سے اپنے روٹ کی بس پکڑتی اور سیدھا سینٹر جا پہنچتی۔ دل کی دنیا اب اس قدر برف بن چکی تھی کہ دونوں جگہ اس نے اب تک کسی سے سلام دعا اور دوستی آشنائی کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دانستہ اپنے خول میں بند رہنا چاہتی تھی۔ وہ جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ”وہ تو اتنی ہنس مکھ ہے کہ چلتی ہوا کو بھی دوست بنالے۔“ اب وہ ”آدم بیزاری“ کا اشتہار بن چکی تھی۔

ایک ماہ کے صبر آزما عرصے کے بعد جب پہلی تنخواہ ملی تو اس نے واپسی پر سیدھا میڈیکل اسٹور کا رخ کیا۔ دادی کے لیے دو اکس خرید کر جب وہ بس اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھی اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہو۔

چونکہ کر ادھر ادھر دیکھا مگر کچھ سمجھ میں نہ آنے پر سر جھٹک کر اپنی مطلوبہ بس میں سوار ہو کر بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنے لگی۔

مین روڈ پر اتر کر وہ دھیمے دھیمے کھوئے بکھرے قدموں سے اپنے مخصوص راستے پر ہوئی۔ یہاں فلیٹوں کی ایک دنیا آباد تھی۔ ارد گرد بلاکوں کی سر بفلک عمارتوں نے جیسے آسمان کو نگاہ سے اوجھل کر دیا تھا۔ یہ فلیٹس لو اکم (کم آمدنی) والی فمیلیز کے لیے بنائے گئے تھے۔ تنگ و تاریک پلاسٹر اکڑے بوسیدہ سے بے رنگ سے بلاکس چہار اطراف پھیلے ہوئے تھے۔

وہ اپنے مطلوبہ بلاک میں داخل ہوئی اور جھکے جھکے انداز میں سیلن زدہ میزھیاں چڑھنے لگی۔ اس کا فلیٹ چھٹی اور آخری منزل پر تھا۔

بالآخر چھٹے مکان زدہ جسم و جان کے ساتھ وہ اپنے فلیٹ تک پہنچ ہی گئی۔ پرس سے چابی نکال کر لاک کھولا اور اندر داخل ہو کر دوبارہ لاک کرتے ہوئے مذہب حال سی سامنے والے کمرے کی سمت بڑھی۔

دوبی تو کمرے تھے۔ ایک میں سستا صوفہ سیٹ اور ایک میز اور چار کرسیاں سجا کر اسے ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم دونوں کے لیے مختص کر دیا تھا اور دوسرے کمرے میں دو بیڈ اور ایک کپڑوں کی الماری تھی۔ ایک باتھ روم تھا جس سے کچھ فاصلے پر چھوٹا سا بچن تھا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ایک چھوٹی سی نام نہاد بالکنی تھی۔

شروع شروع میں تو اسے اس کا بک میں بڑی گھٹن ہوتی تھی۔ وہ ایسی تنگ و تاریک جگہوں پر رہنے کی عادی کہاں تھی۔ ان کا آبائی مکان پورے ایک کنال پر مشتمل تھا۔ کھلے کھلے کمرے بڑا سا لان۔ پیچھے چھوٹا سا باغیچہ۔ یہاں آ کر تو کھلی فضا میں سانس لینا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

”دادی۔“ بیڈ روم میں آ کر اپنا پرس اور چادر الماری میں ڈالتے ہوئے وہ دادی کے بیڈ کی طرف آئی اور آہستگی سے ان کے اوپر پڑی چادر کا کونا کھسکا دیا۔ انہوں نے کسمسا کر آنکھیں کھول کر ویران نظروں سے اسے دیکھا پھر کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔

”مم۔ مم۔ می۔ مینے۔“ بڑی تنگ و دو کے بعد ان کے منہ سے بے ربطی کے عالم میں اس کا نام ادا ہوا۔

”ہاں دادی! تمہارے پاس ہی ہوں۔“ وہ انہیں نیچے کے سہارے بٹھا کر دھیمے سے کہتی ان کے ہاتھ سہلانے لگی۔

”مم۔ ما۔“ ان کے بھرائے ہوئے گلے سے پھر چند بے ربط جملے ادا ہوئے۔ اسے اچانک سامنے پا کر اس دن صدمے اور خوشی کے ملے جلے عالم میں وہ اچانک قوت گویائی سے محروم ہو گئی تھیں۔

دکھ کے پاتال میں ڈوبے دل کے ساتھ وہ دھیرے دھیرے ان کے کندھے تھپک کر تسلی کے سے انداز میں کہنے لگی۔

”سب ٹھیک ہے دادی! تم کچھ نہ کہو۔ ٹھیک ہے سب۔ تم بیٹھو میں اپنے اور تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔“

وہ اپنے تپتے جھلتے پاؤں سینڈل سے آزاد کرنے لگی۔

”باتھ روم تو نہیں جانا دادی!“ بچن کی طرف جاتے جاتے وہ رک کر پوچھنے لگی۔

دادی کے نفی میں سر ہلانے پر وہ لباس بدل کر بچن میں آ گئی۔ دادی کو چائے دے کر اپنی چائے کا کپ وہیں بچن میں ہمراہ لے گئی اور رات کے کھانے کے لیے سوچنے لگی۔

تھوڑی سی مسور کی دال پڑی ہوئی تھی اس نے وہی بھگو دی۔

”کل شام کو واپسی پر دو تین سبزیاں لے آؤں گی۔ یوں والوں پر کب تک گزارا چلے گا۔ دیے دادی کو تو مقوی مرغن غذا میں کھلائی چاہئیں۔ ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہا تھا۔ کمزوری بھی تو بہت ہو گئی ہے مگر مرغی اور گوشت ہم انورڈ نہیں کر سکتے۔ ابھی تو اتنے بہت سے اخراجات منہ کھولے کھڑے ہیں۔ پانی بجلی سوئی گیس کا بل اور مالک مکان کا کرایہ تو شکر ہے چھ ماہ تک کا پیشگی ادا کر دیا ہے مگر روز کے کھانے پکانے کے اخراجات بھی ہیں۔“

وہ بوجھ بوجھ کر دل مسوس رہی تھی۔ اس سے قبل گھر اور گھر داری کی الف بے بھی جاننے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ کھانا پکانا تو سب دادی کے سر ہوتا تھا۔ کیا چیز ختم ہو گئی، کیا موجود ہے زمین کی جانے بلا مگر اب۔ آہ۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

”دادی! آپ کی دوائیں میں لے آئی ہوں اب انہیں باقاعدگی سے استعمال کرنا ہے۔ یاد ہے ناں ڈاکٹر کہہ رہا تھا علاج باقاعدگی سے اور توجہ سے ہوگا تو کچھ عرصے بعد قوت گویائی بحال ہو سکتی ہے۔ اگلے ہفتے آپ کو لے کر جاؤں گی چیک اپ کے لیے۔“

کھانا پکا کر وہ وہیں بیڈ روم میں لے آئی تھی اور اب دادی کے ساتھ مل کر کھاتی۔ انہیں نوالے بنا کر کھلاتی، وہ امید افزا لہجے میں کہہ رہی تھی۔

مگر دادی کی سنسان مقبرے جیسی آنکھوں میں امید کی روشنی کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ برتن اٹھا کر سمیٹ کر بچن میں رکھنے کے بعد وہ دادی کو ان کی بیساکھیاں تھما کر کمرے سے سہارا دے کر باتھ روم لے کر گئی۔ پھر واپس بستر پر لٹا کر کبل ان پر ڈالا بیرونی دروازے کا لاک ایک بار پھر چیک کیا اور بچن کی لاسٹ بجھا کر دروازہ بند کر کے بیڈ روم میں اپنے بستر پر آ گئی۔

”دادی! انشاء اللہ اچھا وقت جلد لوٹ آئے گا۔“

سونے سے پہلے اس نے روز کی طرح دادی کو اور خود کو جھوٹی تسلیاں دینے کی گویا رسم ادا کی۔ اس نے دیکھا دادی کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ بے بس اور مضطرب آنسو۔ اس کے اندر جیسے کوئی چیز پھٹنے لگی۔

”دادی!“ وہ بولی تو اس کے پیچھے لہجے میں دکھ کی آمیزش تھی۔

”دادی! ہم نے کیا قصور کیا تھا۔ اصولوں سے دوستی ہی تو کی تھی۔ برائی کی نشاندہی کر کے اس کو پھیلنے سے روکا تھا۔ کیا یہ کوئی جرم ہے؟ پھر اتنے بہت سے پھر کیوں ہمیں زخمی کر گئے ہیں؟ ہم معتب کیوں ٹھہرائے گئے ہیں؟ کرے کوئی بھرے کوئی جو فضل ہم نے نہیں کیا اس کی تہمت ہم پر کیوں لگاتے



ہیں لوگ!“

اس کا جی چاہ رہا تھا وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے روئے دھاڑیں مار مار کر اپنی روحانی موت پر بین کرے مگر جانتی تھی دادی نے اس کے ایک آنسو پر ساری رات بلک کر گزارنا تھی۔

سو کمال درجے کے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود پر قابو کیے رکھا۔

”سو جائیں دادی! ماضی کو دفن کر دیں اس کی تمام تر بد صورتیوں کے ساتھ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے جیسے رٹا رٹا یا سبق دہرایا اور ان کی طرف سے رخ موڑ کر سونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔ مگر نیند۔

نیند کہاں تھی آنکھوں میں۔ ڈیڑھ ماہ پہلے کیا ہوا تھا۔

اس صبح جب اس نے جیپ سے اتر کر اپنی نیم پاگل دونوں ٹانگوں سے معذور نحیف و زار دادی کا نیم مردہ لاشہ دیکھا تھا اور ارد گرد دیکھنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔

اس دن جب لوگوں کی زبانیں خنجر بن گئی تھیں اور ان کی نگاہوں کے بے رحم برے اس کے اندر تک شکاف ڈال گئے تھے۔

دیکھنے والوں میں شامل

یار بھی اغیار بھی

چند آنکھوں میں نمی

چند آنکھوں میں حقارت برہمی

چند آنکھوں میں سکوت دائمی

دشمنوں کو بھی یقین

اور بدگماں کچھ ہم نشین، غم خوار بھی

کس طرح صدیاں اچانک ثانیوں میں بٹ گئیں۔

اور ڈیڑھ ماہ پہلے گزرے سارے واقعات اس کی نگاہوں میں پھرنے لگے۔

جتنی دادی سے ملنے کی بے تابی تھی اسی قدر انہیں سامنے دیکھ کر جیسے سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی

تھی پھر لئے پئے انداز میں ان کا خود سے بے گانہ وجود تھام کر اپنے گھر میں داخل ہوئی تو یوں لگا جیسے کسی دوسری دنیا میں آ گئی ہو۔

”دادی پاگل ہو گئیں اور تم اتنے عرصے تک لاپتار ہیں چنانچہ ہم نے عدالت سے اجازت نامہ حاصل کر کے مکان پر قبضہ کر لیا۔ اب یہ ہمارا ہے۔ ہمارا حق ہے۔“ یہ مکان دادا نے بنوایا تھا۔ دادی کو قانونی پیچیدگیوں کی خبر نہ تھی سوا بھی تک ٹرانسفر نہیں کروایا تھا۔ دادا کے بھائی کے بیٹے عزیز الرحمن کی بڑے عرصے سے اس مکان پر نظریں تھیں اب جو میدان صاف دیکھا تو اپنے ایک دکیل دوست کے ذریعے رکی کار روائی کے بعد مکان پر قبضہ کر لیا اور اب اپنی فیملی سمیت رہائش پذیر تھا۔

وہ حیران پریشان بے سائبان اور بے امان کھڑی تھی۔

عزیز الرحمن نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ کچھ عرصے کے لیے اپنے ساتھ رکھنے پر رضامند ہو گیا مگر یہ چند یوم اس محلے میں قیامت کی طرح گزرے۔



عمر دراز خان نے ٹھیک کہا تھا اصل سزا تو اب شروع ہوئی تھی۔ لوگوں کی زبانوں کے تیز نگاہ کی بد چھایاں جیسے اندر باہر اس کے تعاقب میں رہتی تھیں۔ اسے دیکھ کر بچے بڑے یوں راستہ چھوڑ کر ایک سمت ہٹ جاتے تھے جیسے کوئی بدروح دیکھ لی ہو۔ لوگوں کی نظروں میں حقارت، نفرت اور لعنت ملامت کے انگارے برسا کرتے تھے اور زبانیں۔ وہ خنجر زبانیں۔

”توبہ توبہ۔ دہائی ہے۔ چار ماہ اپنے یار کے ساتھ گزار کے آئی ہے۔ لوبھلا بتاؤ کوئی پوچھے تمہیں کس کا خطرہ تھا۔ باوا اماں سر پہ نہیں۔ دادی بوڑھی۔ اس کی کیا مجال تھی۔ اتنا پسند تھا تو عزت سے اس سے نکاح کر لیتی پھر چاہے جہاں مرضی جاتی۔ اس طرح اپنے خاندان کی عزت اور غیرت کا سودا تو نہ کرتی۔“

”اے بہن! یہ ملازمت کی شوقین لڑکیاں شادی بیاہ کے بکھیرے کہاں پالتی ہیں۔ بن سنور کے چمکتی مقلتی گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور نوکری کے بہانے اپنے عاشقوں، دل داروں کے ساتھ رنگ رلیاں مانتی ہیں۔“

”پھر اس کے لہجہ تو دیے بھی شروع سے ہی خراب تھے۔ دیکھا نہیں تھا کیسے دادی سے دو بدو سوال جواب کیا کرتی تھی۔ من مانی کرنے اور زبان درازی کرنے کی بد عادت تو شروع سے اس کو لاحق تھی۔“

”اللہ کی مار ایسی بے حیا اور بے شرم لڑکیوں پر۔ بھلا بوڑھی دادی کا بھی خیال نہیں آیا۔ کوئی خوف خدا نہیں رہا۔ ایک نہ دو پورے چار ماہ۔ توبہ استغفار۔“

”تمہارے چچا جی بتا رہے تھے میں نے صبح نماز پڑھنے کے لیے مسجد نکلتے ہوئے دیکھا تھا اسے جیب سے اترتے ہوئے۔ وہ شہر کا بڑا مشہور اور دولت مند بندہ ہے۔“

”کون بھلا؟“

”ارے وہی جس کے ساتھ منہ کالا کر کے آئی تھی وہ ناہنجار بے غیرت لڑکی!“

”بھئی شیخ صاحب! آپ محلے کے بڑے ہیں۔ بزرگ ہیں۔ ہمارا خیال ہے۔ اس ضمن میں آپ کو یہ اہم قدم اٹھالینا چاہیے۔“

”کیا مطلب بھی محل کر بیان کیجیے صاحبان!“

”دیکھیے شیخ صاحب! ہماری بھی بیٹیاں ہیں جو جوان ہیں ان کے بیاہ کرنے ہیں اور جو چھوٹی ہیں انہوں نے نکل جوان ہوتا ہے۔ ہمارا خیال ہے محلے کی پاکیزہ اور صاف ستھری فضا کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے اس غلاطی کی پوٹ کو اپنے محلے سے نکال دینا چاہیے۔“

”بجا فرماتے ہیں صوفی صاحب! کہیں بے حیائی اور بے غیرتی کی یہ کھلی داستان میرے منہ میں خاک مٹھکی بہو بیٹیوں کے لیے مثال نہ بن جائے۔ اس ضمن میں فوری اقدام کرنا ہوگا۔“

اور پھر باہر کی فضاؤں میں برستے الزام اور تہمت کے یہ انکارے گھر کے اندر تک بھی چلے آئے۔ جب ایک دن عزیز الرحمن کی بیوی نے بڑی عاجزی سے اس سے مخاطب ہو کر درخواست کی۔

”دیکھو بھئی۔ میں تمہیں یہاں رکھ لیتی مگر بات یہ ہے کہ میری دونوں لڑکیاں جوان ہیں۔ کوثر کی بات طے ہو چکی ہے اگر اس کی سسرال کو یہ خبر ہوگئی کہ چار ماہ تک گھر سے غائب رہنے والی لڑکی ہماری رشتہ دار ہے اور ہمارے ساتھ رہ رہی ہے تو وہ کھڑے کھڑے رشتہ ختم کر ڈالیں گے پھر انجم بھی شادی کے لائق ہوگئی ہے جو تمہاری کہانی کان پڑ گئی تو کون ہماری بیٹی کا ڈولا اٹھائے گا۔ تم برائے مہربانی کہیں اور انتظام کر لو۔“

اور پھر..... پھر ایک اور تازیانہ اس وقت لگا جب سر نیازی نے اسے اپنے کمرے میں بلوا کر استغنیٰ دیئے کو کہا۔

وہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ نیازی صاحب اپنے مخصوص پردہ پر تپنے تلے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”دیکھیے مس فرحین احمد! استاد کا کردار طالب علموں کے لیے مشعل راہ ہوا کرتا ہے۔ بچے بڑوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور معذرت کے ساتھ کہتا پڑتا ہے کہ آپ کا کردار اب کوئی قابلِ فخر نہیں رہا۔ اس سے طالب علموں کے اخلاق و کردار کی نشوونما پر فرق پڑے گا۔ بہت عرصے سے اسٹاف کے دیگر

ممبران مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ درس گاہ کی فضا کو آلودہ کرنے والے عناصر کا یہاں سے اخراج بہت ضروری ہے اور اب تو بچوں کے والدین بھی شکایت لے کر آنے لگے ہیں کہ آپ کے اسکول کا ماحول اب ٹھیک نہیں رہا۔ ہم اپنے بچوں کو بے حیائی اور بے غیرتی کا سبق نہیں پڑھانا چاہتے۔ چنانچہ مجھے اپنے ادارے کی نیک نامی اور وقار کی خاطر آپ سے مطالبہ کرنا پڑ رہا ہے کہ آپ بخوشی یہاں سے رخصت ہو سکتی ہیں۔“

ایک دو تین چار۔ ذلت کے طاقتور تھپیڑوں کی بارش نے اس کے چہرے کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ صدمہ۔ شدید صدمہ اس کے ذہنی خلیجان کا باعث بن گیا تھا۔

اسی ادارے کی فضا کو پاکیزہ شفاف اور آلودگی سے پاک رکھنے کے لیے تو اس نے یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ ان ہی بچوں کی مثبت اخلاقی و جذباتی نشوونما کے لیے تو اس نے نعمان پیر زادہ جیسے مشکوک کردار کے لڑکے کو اپنی کلاس میں ایڈمٹ کرانے سے انکار کیا تھا۔ اس تعلیمی درس گاہ کے مقدس ماحول کو بحال رکھنے کے لیے تو اس نے اذیت کی لامحدود وسعتوں پر محیط وہ چار ماہ کی قید تنہائی کاٹی تھی۔

”ادارے کی فضا کو آلودہ کرنے والے عناصر کا اخراج بہت ضروری ہے۔“ وہ رہ کر یہ جملہ اس کے اعصاب پر کوڑے کی طرح برس رہا تھا۔

میں نے جس شاخ کو پھولوں سے سجایا تھا منیر  
میرے سینے میں اسی شاخ کا کاٹنا اترتا

اور پھر ایک اور خبر نے اس کے سینے میں شگاف ڈال دیا۔ اس کی غیر موجودگی میں میٹرک کی کلاس ایک دوسری ٹیچر کے ذمہ لگ گئی تھی اور اس سے ”معاملہ“ طے کر کے عمر دراز خان پیر زادہ نے نعمان پیر زادہ کو ری ایڈمٹ کرا دیا تھا۔ اور اب وہ شان سے میٹرک کے فائنل پیپر ز دے کر فارغ ہو چکا تھا۔

یہ اصولوں پر سمجھوتا نہ کرنے کی سزا تھی جو وہ آج بدر بدر تھی۔ بالآخر وہ حملہ بدر کر دی گئی۔ بینک میں جو رقم پڑی تھی اسے نکھو کر ایک گناہم و تار یک علاقے میں فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ جو رقم بچی اس سے کچھ فرنیچر ڈالوا لیا اور پھر گھر کے روٹی پانی کے خرچے اور دادی کے علاج معالجے کے لیے ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔

”تم نے ٹھیک کہا تھا عمر دراز خان اسزاتو میں اب پارسی ہوں۔ پور پور زخمی ہوں۔ دادی کی آتی

نے بھی جھپٹیں مس کیا۔ وہ کیا فرماتے ہیں اپنے ساحر لدھیانوی صاحب کہ  
جہاں جہاں تری نظروں کی اوس ٹپکی ہے  
وہاں وہاں سے ابھی تک غبار اٹھتا ہے  
جہاں جہاں ترے جلوؤں کے پھول کھڑے تھے  
وہاں وہاں دل وحشی پکار اٹھتا ہے

جواب میں فرحین نے بلا کے قہر مان انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”یہ شاہراہ ہے اور میرا اسکول قریب ہے میں یہاں کوئی تماشا کھڑا نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے بہتر ہوگا۔ میرا راستہ چھوڑ دو۔“ اس کا دھیمہ انداز غضب کا سردہن اور نہ ہر اپنے اندر سونے ہوئے تھا۔  
”اچھا چلیں پھر ملیں گے کبھی کبھی پسپائی اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ یوں بھی اتنی بڑی  
فلکت فاش دینے کے بعد ہمارا تم سے انتقام کا کوئی سلسلہ باقی نہیں رہا۔ ہمارا مسئلہ تو دیسے بھی حل  
ہو چکا ہے۔“ خلاف توقع وہ خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راستے سے ہٹ گیا تھا۔

جب وہ تیز قدم اٹھاتی گیٹ کر اس کے اندر جا رہی تھی تو چوکیدار کی معنی خیز نگاہیں اس کے اندر  
تک اترتی چلی گئی تھیں۔

دوسرے دن چوکیدار نے اسے ایک سفید لفافہ اسٹاف روم میں آ کر تھمایا تو چونک پڑی۔  
”وہی کل والے صاحب دے کر گئے ہیں۔“ اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں چوکیدار نے  
ذو معنی انداز سے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ خود کو بے بسی کی انتہاؤں پر محسوس کرنے لگی۔ دل چاہ رہا تھا بغیر پڑھے دو ٹکڑے کر کے ڈسٹ  
بن میں پھینک دے مگر پھر کچھ سوچ کر کھول لیا۔ اندر اسٹاکش وٹس کارڈ پر سیاہ روشنائی میں درج تھا

ہم بھی شکستہ دل ہیں پریشان تم بھی ہو

اندر سے ریزہ ریزہ میری جان تم بھی ہو

ہم بھی ہیں ایک اجڑے ہوئے شہر کی مثال

آنکھیں بتا رہی ہیں کہ ویران تم بھی ہو

ٹل جائیں ہم تو کیسا سہانا سفر کئے

گھٹاں ہیں ہم بھی سوختہ سامان تم بھی ہو

”اف اللہ۔“ اس کا چہرہ غیض سے جل اٹھا۔ اس نے شدت جذبات سے بری طرح وٹس کارڈ

جاتی سانسوں کا خیال نہ ہوتا تو کب کی زہر کھا کر سو رہتی۔ مگر اب جینا اور جیتے رہنا جیسے فرض بن  
ساتھ چٹ گیا ہے۔ بہت حساب ہیں تمہاری طرف عمر و از میرے روئیں روئیں میں تمہارے۔  
نفرت اور صرف نفرت ہے۔ تمہارا نام کلنگ کا ٹیکہ بن گیا ہے میرے لیے۔ تمہارا تو بال بھی بیکانہ  
ہوا۔ تم پر تو کوئی آج نہیں آئی مگر تمہیں چین کی نیند میں بھی نہیں سونے دوں گی۔ میں نے تو تمہارا  
جسم سے بہتے خون کے بدلے اپنی آنکھوں کو خون رنگ کر لیا ہے مگر میری پارسائی کے ششے پر پڑی  
تمہارے دامن کو ایک دن ضرور آلودہ کرے گی۔ تم تو آج بھی اتنے ہی چاہے جاتے ہو ہاتھوں ہاتھ  
لیے جاتے ہو۔ کسی کو جرات نہیں کہ تمہیں اسکیٹ لائز کر سکے مگر میں تمہارے حصے کی رسوائیاں بھی اپنے  
دامن میں سینٹے پر مجبور ہوں۔ تم سے کوئی جواب طلب نہیں کرتا مگر میں اس معاشرے میں ایک حقیر کے  
سے بھی بدتر سمجھی جاتی ہوں۔ لوگ تمہارے نام سے میرے شیشہ عصمت کو چکنا چور کرتے ہیں۔ سب  
نے مجھے کھلی گزر گاہ سمجھ لیا ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے اپنی پسند کی گالی سے نوازا دیتا ہے۔ مگر کب تک آؤ  
کب تک۔

جنہوں نے ہستی اجاڑ ڈالی، کبھی تو ان کا حساب ہوگا۔ بھڑکتی سلگتی یادوں کی چنگاریاں رہ رہ کر اس  
کے دل کے گرد الاؤ روشن کر رہی تھیں۔

وہ سر جھکائے اپنے راستے پر چل رہی تھی۔ سر اٹھاتا تو جیسے بھول ہی گئی تھی۔ اب تو جیسے گناہ کرنا  
شر مسار ہونے والوں کی طرح دوسروں سے خود اپنے آپ سے چھٹی، بچتی پھرتی تھی۔ یونہی اسے  
جیسے وہ کسی نظروں کے حصار میں ہو۔ اس نے کسی خدشے کے پیش نظر سر اٹھا کر سڑک کی طرف نگاہ  
اور پھر جیسے زمین و آسمان ختم کر رہ گئے۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر قدم قدم گنتا عین اس کے مقابل  
آن کھڑا ہوا تھا۔

اس وقت وہ اپنے اسکول کے گیٹ سے محض ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی اور اسکول گیٹ پر ک  
بت کی طرح ایسا وہ چوکیدار پوری طرح اس گاڑی سے نکل کر سامنے آنے والے شاندار سوئڈن  
وجہہ مغرور سے بندے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”السلام علیکم۔ کیسی گزر رہی ہے۔“ اس کے لہجے میں وہی بشارت اور گر مجھوٹی تھی گویا کچھ بھی تو  
ہوا ہو۔

”ہمیں تو تم نے خاصا پریشان کیا۔ ہم دو تین دن پہلے ادھر اپنے ”ٹھکانے“ پر گئے تھے وہاں  
ایک ایک نقش تمہیں ڈھونڈتا تمہارا پتا پوچھتا محسوس ہو رہا تھا۔ مینوں کے ساتھ ساتھ مکان اور باجہ

مٹھیوں میں بھیج کر چور چور کر دیا تھا۔

”مجھے انکاروں پر پھینک کر میرا تسخراڑا تے ہو عمر دراز خان؟ وہ خدا تو دیکھ رہا ہے اوپر والا سب جانتا ہے میں دوسروں کے حصے کا بھگتان بھی بھگت رہی ہوں کہاں تک؟ کبھی تو رحم آئے گا ناں اس پاک ہستی کو۔ کبھی تو میرے بھی دن پھریں گے۔“

”آؤ فرحین! ہم تمہیں گھر چھوڑ دیں۔ بہت تیز دھوپ ہے۔“

وہ اسکول گیٹ سے نکلی ہی تھی جب سامنے ہی اپنی سرخ چمکتی دکتی ٹیوٹا کرولا سے ٹیک لگا کر کھڑا ام دراز خان اسے دیکھ کر اس کی سمت بڑھا تھا۔

ابھی اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی یا اپنے قدم بڑھاتی اسی لمحے پرنسپل نے اپنی سوزوکی کار گیٹ سے نکالنے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

اس کے وجود میں جیسے کوئی بھونچال سا آگیا۔ پرنسپل اپنی گاڑی نکال کر روانہ ہو چکی تھی مگر اس کی کاٹ دارنگا ہوں نے اندر تک اس کی روح کو چسید کے رکھ دیا تھا۔

”کیوں آتے ہو بار بار میری راہ میں؟ تمہارے بچائے ہوئے انگاروں پر ہی تو چل رہی ہوں اور اطمینان رکھو زمین احمد کوئی موم کا پتلا نہیں ہے کہ مصائب کی دھوپ میں پگھل جائے گا۔ مت بار بار اپنی شکل دکھا کر میرے دکھوں کا دورانیہ بڑھایا کرو۔“

گیٹ پر ایستادہ حسب سابق ادھر متوجہ چوکیدار کی وجہ سے وہ بہت دھیمے غراتے ہوئے انداز میں گویا ہوئی اور پھر جیسے بے اختیار خستی ہوئے آگے بڑھی تھی۔

ابھی وہ گھر کے کچھ فاصلے پر ہی تھی جب دوبارہ سرخ کرولا اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔

”سنو۔ سنو۔ ہمیں صرف دو باتیں کہنی ہیں تم سے۔“ اس کے غضبناک ہو کر پھٹ پڑنے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”نمبر ایک یہ ہمارا کارڈ رکھ لو کبھی ضرورت یا مصیبت پڑنے پر بلا جھجک کال کر دینا۔ موبائل نمبر بھی درج ہے گھر کے اور دفتر کے تمام کاٹیکٹ نمبرز بھی موجود ہیں۔ نمبر دو یہ کہ ہمیں ساحر لدھیانوی کی زبان میں تم سے کہنا تھا کہ

تیری تڑپ سے نہ تڑپا میرا دل، لیکن

تیرے سکون سے بے چین ہو گیا ہوں میں

یہ جان کر تجھے نہ جانے کتنا غم پہنچے

کہ آج تیرے خیالوں میں کھو گیا ہوں میں۔

اس کے لبوں پر بڑی واضح قسم کی خوشگوار مسکراہٹ درآئی تھی

”تمہارے ساتھ گزارے لمحات کی یاد ہمیں خاصا ڈسٹرب کرنے لگی ہے۔ تب ہی تو دیکھ لو بغیر کسی باڈی گارڈ اور ڈرائیور کے اتنی غیر معروف سی جگہ پہ بے خطر تم سے ملنے چلے آتے ہیں۔“ وہ کہہ کر گاڑی کا دروازہ کھولنے لگا۔ پھر جیسے کچھ یاد آ جانے پر مڑا تھا۔ ارے ہاں۔ یہ بلیٹک چیک رکھ لو۔ اس میں اپنی ضرورت کے مطابق رقم بھر لیتا۔ ان حالات میں ضرور۔“

اور اتنی دیر سے ضبط کے قفل لگائے کھڑی زمین سے اپنا غصہ دبانا جب دشوار تر ہو گیا تو اس نے جھٹ کر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں سے چیک تھا با اور پڑے پڑے کر کے ہوا میں اچھالتے ہوئے دانت پیس کر اس کی بات کاٹ کر غرائی۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں تمہاری شکل پر، تمہاری دولت پر، تمہارے عہدے پر اور ہر اس شے پر جو تم سے وابستہ ہے۔“ پھر وہ رکی نہیں بھاگتی ہوئی اپنے ہلاک کی سیڑھیاں ملے کرنے لگی تھی۔

گھر پہنچ کر دروازہ مقفل کر کے وہ دادی کے پاس بیڈ روم میں جانے کے بجائے سیدھی ڈرائنگ روم میں آگئی اور صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر دھواں دھار روئے لگی۔ کچھ اتنی شدت سے کہ اس کی کھٹی کھٹی چیخیں اور سسکیاں دادی کی سماعتوں میں اترنے لگیں۔

”مم۔ می۔ مے۔“ دوسرے کمرے سے دادی کی غول غال سن کر وہ ایک جھٹکے سے ہوش میں آگئی۔ اس سے جو شتر کھانٹھ جاتی وہ بیساکھی کے سہارے گر کر پیڑی دروازے سے الجھتی اندر آ گئیں۔

”ارے دادی! آپ کیوں اٹھ بیٹھیں۔“ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں تھام نہ لیا ہوتا تو وہ دروازے سے ٹکرا کر بری طرح فرش پہ جا گرتیں۔

”مم۔ می مینے۔“ زمین نے انہیں صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ اور اب وہ اس کے کندھوں پر اپنا عرشہ زدہ بوڑھا ہاتھ رکھے شاید اس کے بچتے آنسوؤں کا سبب پوچھ رہی تھیں جنہیں صاف کرنے کی نوبت نہیں آ سکی تھی۔

”دادی! اپنی طرف سے تو اس نے خود پر ضبط کے پہرے بٹھانا چاہے تھے، مگر دل اتنا بھرا ہوا تھا کہ بے اختیار پھر سوتے پھوٹ نکلے۔ وہ ان کے لرزتے کانچے گھٹنوں پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ ان کا بوڑھا ہاتھ ہولے ہولے اس کے گھنے بالوں کو سہلانے لگا پھر محسوس ہوا کہ دادی کی پلکوں سے ٹوٹتے ستارے بھی زمین کے بالوں میں جذب ہو رہے ہیں۔ زمین نے تڑپ کر سر اٹھایا اور پھر



ان کے جھریوں بھرے چہرے پر لرزے آنسو اپنی دونوں ہتھیلیوں سے صاف کر دیے۔  
 ”نہیں دادی! انہیں تم کیوں روتی ہو میں جو ہوں ہر زخم پہنے کو۔ ہر دکھ بھوکے کو۔ زمانے کی نگاہ اور  
 زبان سے نکلا ہر تازیانہ کھانے کو۔ تم کیوں روتی ہو دادی۔“  
 اور اس کا اپنا چہرہ آنسوؤں کے ریلے میں جیسے تر بہر ہوتا چلا جا رہا تھا۔



”مس زمین کہتے ہیں انسان ٹھوکریں کھا کر سنبھل جاتا ہے اور سبق سیکھتا ہے مگر معاف کیجئے! آپ کے اندر برائی کا زہر اس بری طرح سرایت کر چکا ہے کہ آپ ڈھنٹائی سے اپنی اسی روش پر گامزن ہیں۔ آپ کے متعلق اڑتی پڑتی بہت سی مشکوک باتیں میرے کان میں پڑی تھیں مگر میں نے اس کے باوجود رسک لے کر آپ کو اپنے اسکول میں جاب دے دی تھی کہ شاید آپ اپنے رنگ ڈھنگ بدل لیں مگر عادت پختہ ہو جائے تو اس کا کیا علاج۔ میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے اسکول سے وابستہ ٹیچر کے کردار کے چھینٹے میری عزت اور وقار کو داغدار کریں اور میرے ادارے کا ماحول خراب کریں۔ آپ کو شہر کی مشہور اور دولت مند اسامیوں کو پھنسانا ہے تو یہ کام کہیں اور جا کر کریں یہ ادارہ استعمال نہ کریں۔ یہاں اس قسم کی ملاقاتیں ”محبت ناموں“ اور پیغامات کا تبادلہ اور کھلے عام باہمی کے مظاہرے کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ آپ تشریف لے جاسکتی ہیں اور بہتر ہوگا اپنے ہاتھ سے استغنی لکھ دیں ورنہ مجھے بذات خود ناپ کر داتے ہوئے خاصا افسوس ہوگا۔“  
 اوہ خدا یا۔ آزمائشوں کی یہ لمبی قطار۔ کیا اس دیوار چین کا دوسرا سرا کبھی میرے ہاتھ نہیں آئے گا ایک بار پھر۔ ایک بار پھر وہی انگارہ جملے وہی خنجر صفت زبان۔

ابھی کیا کہیں ابھی کیا سنیں  
 کہ سر فسیل سکوت جاں  
 وہ جو حرف حرف چراغ تھا  
 اسے کس ہوائ نے بجھا دیا  
 کبھی لب بلیں گے تو پوچھنا  
 سر شہر عہد وصال دل  
 وہ جو کناہوں کا ہجوم تھا  
 اسے دست موج فراق نے

تہہ خاک کب سے ملا دیا  
 کبھی گل کھلیں گے تو پوچھنا  
 ابھی کیا کہیں ابھی کیا سنیں  
 یوں ہی خواہشوں کے فشار میں  
 کبھی بے سبب کبھی بے غل  
 کہاں کون کس سے بچھڑ گیا  
 کبھی پھر ملیں گے تو پوچھنا

مجھے تو آنسو کبھی اچھے نہیں لگتے تھے نہ اپنی آنکھ میں نہ کسی کی آنکھ میں۔ میں تو خوشی، اعتماد اور اعتبار کے دیس کی باسی تھی۔ مجھے تو روشنیاں اچھی لگتی تھیں۔ پھر مجھے اندھیروں میں کس نے دھکیل دیا۔ میں تو ہر رخ پہ خوشیاں بچی دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر میری خوشیاں کون میرے چہرے سے نوج کے لے گیا یہ کون میرے منہ پہ گناہ گاری کی سیاہیاں پھیر گیا ہے۔ میں تو سچائیوں کا احترام کرنے والی تھی پھر میری ذات کی سچائیاں کیوں دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں میں نے حق سچ اور انصاف کی راہ پہ ثابت قدمی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے لیے زنداں میں چار قیامت کے مہینے ویرانے میں بسر کر دیے مگر دنیا والوں نے اس چھوٹے سے زنداں سے مجھے ایک بڑے زنداں میں کیوں ڈال دیا ہے جہاں چاروں اطراف بھانپڑی بھانپڑی ہیں جہاں شک کے ناگ اپنی دو شاخی زبانیں نکالے میری روح کو لمحہ لمحہ ڈستے ہیں۔

آہ۔ یہ ماضی۔ یہ ماضی کے ہیولے کبھی میرا چچا چھوڑ دیں گے؟  
 وہ ایک بار پھر غم روزگار سے نبرد آزما تھی کمپوزنگ سنٹر سے ملنے والے اٹھارہ سو روپے بھلا کیا ساتھ دے سکتے تھے اس سے تو راشن پانی کے خرچے بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔  
 اب اس نے ٹینک کے بجائے کسی دفتری جاب کے لیے تلاش شروع کر دی، مگر مایوسی جیسے اس کے مقدر کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ ہر جگہ ”تجربہ“ تھاں میں سجا کر پیش کرنا پڑتا تھا۔ پھر رشوت، سفارش، پہنچ وہ کس کس محاذ پر لڑتی۔

دادی کی طبیعت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی مخصوص ایک سرساز نہ کر سکنے کے باعث ان کی دونوں ٹانگیں پھولنا شروع ہو گئی تھیں۔ قوت گویائی پہلے سے بھی کم رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر ز نے کہا تھا کہ صدے سے چلی جانے والی قوت گویائی کے واپس آنے کے امکانات بہر حال موجود ہوتے ہیں۔ اس سلسلے

ایک بے نام اذیت بکے سوا کچھ بھی نہیں



کپورنگ سینٹر سے واپس آتے آتے خاصی دیر ہوگئی تھی کیونکہ مطلوبہ روٹ کی بس دیر سے ملی تھی۔  
ست روی سے بلاک کی سیڑھیاں ملے کر کے وہ اپنے قلیٹ میں داخل ہوئی تو سواچھ بچ رہے تھے  
سردیوں کا موسم تھا اس لیے سواچھ بچے ہی رات کی سیاہ تاریکی پھیل گئی تھی۔

بیڈ روم میں آ کر بیگ اور چادر اتارنے کے بعد اس نے جھلائے ہوئے کوٹ زدہ انداز میں  
سینڈل اتارے اور پاؤں ایک دوسرے سے مسلتی کالہی سے سیدھی ہو کر دادی کی طرف متوجہ ہوئی۔  
”دادی۔ دادی۔“ پھر ذرا دھیان سے دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔ دادی بستر پر موجود نہیں تھیں۔  
”دادی۔“ اس کا دل جسم کے پنجرے میں جیسے پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ ”دادی۔ آپ کدھر ہیں۔“ وہ  
پاگلوں کی طرح اٹھ کر انہیں ادھر ادھر تلاش کرنے لگی۔

اس کا دل کسی انجانے خدشے سے دھڑدھڑائے جا رہا تھا جو اس باختمی نیچے پاؤں ہاتھ روم کی  
طرف لپکی اور دروازے پر ہی اوندھے منہ مری دادی کو دیکھ کر جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔  
ڈرتے ڈرتے انہیں سیدھا کر کے دل کی دھڑکن چیک کی۔ اس کا اپنا دل اس قدر زور سے دھڑک  
رہا تھا جیسے ابھی کسی آن پلسیاں تو ذکر باہر آن کرے گا۔ ان کے دل کی دھڑکن دھیمے دھیمے تاخوس  
سے انداز میں رک رک کر چل رہی تھی۔ اس کی جان میں جان آئی پھر جیسے تیسے کر کے انہیں کچھ اٹھا کر  
کچھ تھیسٹ کر پٹنگ پر ڈالا اور ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگی۔ یکنخت اس کو احساس ہوا اس طرح  
دادی زندگی سے مزید دور ہوئی جا رہی ہیں۔ انہیں اسپتال لے جانا انتہائی ضروری تھا۔  
”مگر اس وقت کیا کروں۔ کس طرح انہیں لے کر جاؤں۔“ اس کے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔  
مجھ معنوں میں حواس جواب دے گئے۔

لیکسی اس ویران سنان علاقے میں کہاں سے ملتی اور بالفرض مل بھی گئی تو بھی چھٹی منزل سے  
گراؤنڈ تک کس طرح انہیں لے جا پاؤں گی۔ میری ”شہرت“ کے طفیل کوئی پڑوسی بھی مدد کرنے کا مجاز  
نہیں ہوگا۔

اس کے اندر بھونچال سا آگیا تھا پھر لگا جیسے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔  
”مجبوری میں تو حرام بھی جائز ہو جاتا ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر اپنے بیک کی جیبیں کھنگالنے لگی۔ اس  
دقت کا بے دھیانی سے کھسیڑا جانے والا کاغذ کا وہ بے کار پرزہ اس کے خیال میں اب کتنا مستراح جاں

میں کیس مخصوص تھراپی اور میڈیسن وغیرہ کے ذریعے رفتہ رفتہ تارل ہو سکتا ہے اور وہ سارے جتن بھی  
اسی لیے کر رہی تھی۔ اس کی اولین خواہش تھی کہ دادی کی گویائی لوٹ آئے۔ پتھروں کے اس دیس میں  
کوئی تو اس کی سن کر تسلی کے دو ٹیٹھے بول اس کی جھولی میں ڈالنے والا ہو۔ اس دن بھی دادی کو خاصی  
تکلیف تھی ٹانگوں میں ساتھ بٹھا رہی تھی۔ دو پہر تک تو وہ ان کے پاس بیٹھی ان کو دوباتی رہی ان سے  
باتیں کرتی رہی مگر دو بجے اسے کپورنگ سینٹر جانا تھا کہ اب ایسی نوکری کو ہاتھ سے گنوانے کی حماقت  
نہیں کر سکتی تھی۔

”دادی! میں جگ‘ گلاس اور ڈونگے میں سادہ چاول ادھر آپ کے بستر کے ساتھ میز پر رکھ کر  
جا رہی ہوں تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔ کوشش کروں گی جلدی لوٹ آؤں۔ اس حالت میں آپ کو چھوڑ  
کر جانے کو تو دل نہیں مانتا مگر کیا کروں۔ آج تنخواہ ملنی ہے جس سے آپ کے لیے دوائیں لانی ہیں۔“  
جواب میں دادی نے ہاتھ کے اشارے سے اور منہ سے غوں غاں کر کے کچھ سمجھانے کی کوشش کی  
جسے وہ سمجھ گئی کہ اب وہ ان کے اشاروں کی زبان سے کس قدر واقف ہوگئی تھی۔ ”آپ کہتی ہیں۔  
دوائیں نہ لاؤں۔ خرچا ہوگا اور پھر کھانے پینے کے لیے کہاں سے آئے گا مگر دادی پیاری! اللہ مالک  
ہے آپ کے لیے ہی تو سب کچھ کرتی ہوں تاکہ آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں ورنہ اس سیاہ کار  
غلاطی میں لتھڑے بے کار وجود کی سلامتی کے لیے کس کا فرنے کھٹا پٹنا تھا۔ بس دادی جلدی سے  
ٹھیک ہو جائیں آپ کے سوا میرا ہے ہی کون پھر تو پیچھے میرا بد صورت کریہہ ماضی ہی رہ جائے گا۔  
میری جان کا عذاب۔“

اس کے گلے میں جیسے پھندے لگنے لگے۔ کسی زمانے میں شاعری کی کتاب میں پڑھی ہوئی نظم  
کے چند شعر اس کے ذہن میں چمک پھیریاں کھانے لگے۔

اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں ہوں میں  
اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے  
اپنی بے کار تمناؤں پہ شرمندہ ہوں  
اپنی بے سود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے  
میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہے دو  
میرا ماضی مری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں  
میری امیدوں کا حاصل‘ میری کاوش کا صلہ

محسوس ہو رہا تھا۔

بالا خر کار ڈبل ہی گیا جسے چھٹ کر بیک سے جھانکتا پچاس کا نوٹ کھینچ کر وہ اندھا دھند سیرھیوں کی طرف لپکی تھی۔ فلیش سے کچھ دور مارکیٹ کے نام پر بنی دو چارہکانوں کے ساتھ۔ پنی سی اوتھا۔ اس نے افراتفری میں موہاٹل نمبر ملایا۔

”میں عمر دراز خان پیر زادہ اسپیکنگ۔“ چند ساعت بعد اس کی بارعب گونجی آواز جیسے ایئر بیس پر چھاسی گئی وہ کچھ دیر تک خشک لبوں پر انگلیاں پھیرتی بولنے کے لیے اپنے قتل حواس قابو میں کرتی رہی۔ ”السلام علیکم۔ میں زمین بات کر رہی ہوں۔“ اس نے دھیسے سے مغلوب لہجے میں کہا۔

”اوہ اچھا۔ کیوں خیریت تو ہے زمین!“ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ اتنی رات گئے اور اتنی مدت بعد اس طرح اس سے کانٹیکٹ کسی خوشگوار صورتحال میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سو اس کے لہجے میں واضح طور پر تشویش اند آئی تھی۔

”وہ دادی۔ دادی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ بے ہوش پڑی ہیں۔“ وہ سب قرار و تاب کھو کر بری طرح بکھر گئی۔

”ڈونٹ وری زمین! ہم ابھی اور اسی وقت آرہے ہیں۔ تم حوصلہ کرو۔“ اس کے بھرائے ہوئے لہجے اور آنسوؤں میں کھلی سسکتی آواز نے عمر دراز خان کے اندر جیسے چابی سی بھردی تھی۔ وہ بہت بے چین سا ہو کر گویا ہوا کے دوش پہ اڑتا ہوا پہنچا تھا۔

”اوہ انہیں فی الفور اسپتال لے جانا ہوگا۔“ ایک سرسری سے جائزے سے ہی وہ دادی کی مخدوثر حالت کے بارے میں جان گیا۔

”تم دروازے وغیرہ لاک کر کے گاڑی میں بیٹھو۔ ہم انہیں نیچے لے کر آتے ہیں۔“ دادی کو اپنے دونوں بازوؤں میں احتیاط سے سنبھال کر وہ بہ سرعت سیرھیاں طے کرنے لگا تھا۔ جب وہ اس کے پیچھے گرتی پڑتی آ رہی تھی تو بہت سے گھروں سے جھانکتے چہروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا مگر اس وقت اسے کسی شے کی پروا نہیں تھی۔

ہاسپٹل والوں نے دادی کی حالت کے پیش نظر فوراً سے پیشتر آئی سی یو میں داخل کر لیا۔ عمر دراز خان پیر زادہ کی سیاسی و سماجی اعتبار سے مستحکم شخصیت کی موجودگی بذات خود ہاسپٹل کا انتظامیہ کی خصوصی دیکھ بھال اور پھرتیوں کا باعث بن گئی تھی۔ سچ ہے پیر اور عہدہ بولتا ہے۔ مر لیغ کے وی آئی پی روم کے ساتھ ان کے ”لواحقین“ کے لیے بھی الگ کمرے کا فوراً سے پیشتر انتظام کر دیا

گیا تھا جہاں وہ دونوں اس وقت موجود تھے۔ پوری رات جیسے آنکھوں میں کٹ گئی۔ وہ غڑ حال سی لب بستہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کبھی بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی اور پریشانی کے عالم میں مٹھیاں سمجھ کر ادھر ادھر ٹپکتے لگتی۔

”دادی ٹھیک ہو جائیں گی ناں عمر دراز خان! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

بالا خر وہ مہر سکوت توڑ کر بے تابی سے کہہ کر خوفزدہ سے انداز میں اسے دیکھنے لگی اس پریشانی کے عالم میں اس کا وجود بہت مضبوط سہارا محسوس ہو رہا تھا۔

عمر دراز خان نے سراٹھا کر بغور اس کا متورم چہرہ دیکھا۔ اندیشوں نے جیسے اس کا سارا وجود نچوڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ آہستگی سے اس کے قریب آیا اور دھیرے سے اسے بے ساختہ شانوں سے قہام لیا۔ ”انشاء اللہ ضرور ٹھیک ہو جائیں گی۔ تم فکر نہیں کرو۔“ وہ بہت رسان سے تسلی دے رہا تھا۔

وہ بے اختیاری کی سی کیفیت میں اس کے سینے پر پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کڑے وقت میں تسلی کے دو بول اور اپنا نیت بھرا لہجہ کس قدر جاں فزا اور تقویت بخش ہوا کرتا ہے۔ زمین کو پہلی بار شدت سے احساس ہوا تھا۔

”بہنو بریو۔ شاباش۔“ اس نے انگلی کی پوروں سے اس کے انگلی صاف کرتے ہوئے اس کا سر چھپتایا۔

صبح آٹھ بجے خوشخبری سننے کو ملی کہ مریضہ کو ہوش آ گیا ہے۔ کچھ دیر بعد پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دی جائیں گی۔ تب ان کے گھر والے ان سے مل سکیں گے۔

عمر دراز خان نے بے ساختہ سکون کا گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی سمت دیکھا جس کے رخ پہ آن کی آن میں مسرت کے تمام جگنو چمک اٹھے تھے۔

”زمین! تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ آؤ ناشتا کرلو۔ دادی جان اب بالکل ٹھیک ہیں۔“ وہ دادی کے بستر پر سر ہانے بیٹھی ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے جانے کون سے قصے سنارہی تھی جب پشت سے عمر دراز خان نے آواز دی تھی۔ وارڈ بوائے اس کے حکم پر ناشتا ٹریبل پر لگا کے جا چکا تھا۔

”مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔“ اس نے یونہی عذر کر دیا۔ اس کا دل دادی کے پاس سے اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ جیسے اندیشہ ہو کہ اٹھے گی تو دادی دوبارہ آنکھیں نموند لیں گی۔ دادی نے اس کے ہاتھ پہ دباؤ ڈال کر جیسے عمر دراز خان کی بات ماننے کی تاکید کی۔

”نہیں بہنو۔ یہ غلط بات ہے۔ پیٹ سے بھلا کیا دشمنی۔ چلو آؤ۔“ اس کے انداز میں قدرے تخم

تھا مگر اس نے برا نہیں مانا۔ بالآخر وہ آگئی۔ اس نے بڑے اصرار سے ناشتا کرایا۔

”اسپتلی میں بہت ضروری میٹنگ ہے جس میں شرکت لازم ہے۔ دو تین گھنٹے لگ جائیں گے اس دوران فصیح تمہارے پاس رہے گا پھر بھی کوئی ایمر جنسی ہو جائے تو موبائل نمبر پر فوری رابطہ کرنا۔ اوکے۔“ اس کے جانے کے بعد فصیح آیا تو باس کی حسب ہدایت فروٹ جوس کے پیکٹ، دودھ کے پیکٹ، بجنی سوپ اور جانے کیا کیا کچھ ایک ذخیرے کی شکل میں ہمراہ لے کے آیا تھا۔

دو پہر تک عمر دراز خان واپس آچکا تھا۔ شام تک وہ ہمراہ رہا۔ اس کی موجودگی میں ڈاکٹرز کے وفود نہیں اور وارڈ بوائے وقفے وقفے سے چکر لگاتے رہے۔

”یہ ساتھ ہی ٹوائلٹ ہے تم شاور لے کر لباس تبدیل کرلو۔“ ساتھ ہی اس نے ریڈی میڈ سوٹ کا لفافہ اس کی طرف اچھال دیا۔ ”راستے میں ہمیں خیال آیا تمہیں یقیناً فریش ہو کر لباس بدلنا ہوگا۔ سو جو بوتیک سامنے نظر آیا وہیں سے افراتفری میں لے لیا۔“

خیال رکھنے کا یہ انداز کس قدر انوکھا تھا۔ اس نے نجل سا ہو کر زردیدہ نگاہوں سے دادی کی طرف دیکھا۔ ان کی کھلی آنکھوں میں اطمینان کی لہریں تھیں۔ وہ چپ چاپ ہاتھ روم کی جانب مڑ گئی۔

”دادی جان بالکل ٹھیک ہیں۔ فصیح ان کے پاس بیٹھے گا۔ اتنی دیر میں ہم رات کا کھانا کھا آتے ہیں۔ یہ سامنے ہی ریسٹورنٹ ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے قطعی انداز اختیار کیا مگر اسی وقت دادی نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ جھنجھلا سی مئی

لیکن بہر حال دونوں طرف کے اصرار نے اسے پابزنجیر کر دیا۔

”ڈاکٹر بتا رہے تھے اگر ان کی طبیعت سنبھل گئی تو دو تین دن بعد ڈسچارج ہو جائیں گی۔“ کھانے کے دوران وہ بتا رہا تھا۔

”اچھا..... اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ اس نے صدق دل سے دعا دی۔

”تم نے مصیبت میں میری مدد کی اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ کیا تم ایک نیکی میرے ساتھ اور کر سکتے ہو؟ میرے پاس ہسپتال کے ڈیوڑھی کٹر کرنے اور میڈیسن وغیرہ کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ کیا تم مجھے کچھ رقم ادھار دے سکتے ہو؟ میں انشاء اللہ جلد تمہیں لوٹا دوں گی۔“ اس نے بڑی سادگی سے دریافت کیا۔ جب ناک ہی نہ رہے تو پھر کیا حجاب۔ گردن میں خم تو اسی وقت آگیا تھا جب اس سے مدد مانگنے کے لیے اس کا نمبر گھمایا تھا۔ اب نام نہاد پردہ دار یوں سے کیا حاصل۔ جواب میں وہ نظر بھر کے اسے دیکھتا ہوا بے ساختہ مسکراہٹ چھپاتا رہا۔

”ہمارے تو ادھر بھی بہت سے ادھار نکلتے ہیں تمہاری طرف۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”وہ کھانا الگ ہے۔“ اس کے لہجے میں یکا یک بریلا پن اتر آیا تھا۔ ان کے واپس لوٹنے پر فصیح باس کی ہدایت کے مطابق گھر چلا گیا۔ زمین وقت گزاری کو یونہی ایک میگزین کھگانے لگی۔ کچھ دیر بعد تلی آ میز انداز میں اٹھ کر دادی کی طرف بڑھی تو عجیب سرسراہٹ سی ناہموار آوازیں کان میں پڑنے لگیں۔

”دادی۔“ وہ تیزی سے ان کے قریب آئی اور پھر جیسے سناٹے میں رہ گئی۔

”عمر دراز خان۔ ایک منٹ ادھر آنا۔ یہ دادی کو کیا ہو رہا ہے۔“ اس کا لہجہ خوف و وحشت میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔ تیزی سے ریسورر کھ کر ادھر لپکا۔ دادی کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

”دادی۔“ زمین کا دل ڈوبنے لگا۔ بے قراری سے ان کا ہاتھ تھا۔ دادی نے اپنا دوسرا نحیف کا ہتھکڑا پاس کھڑے عمر دراز خان کی طرف بڑھایا جو نرس کو بلانے کے لیے بیڈ کے ساتھ لگا ہٹن پلش کر رہا تھا۔

”جی دادی اماں! ہم ادھر ہی ہیں آپ کے پاس۔“ اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ دادی نے اس کے ہاتھ پر زمین کا سنہری ملائم ہاتھ رکھ کر دونوں کے ہاتھوں کے اوپر اپنا منحنی سا بوڑھا ریشہ زدہ ہاتھ رکھا۔ ایک اطمینان بھری نگاہ دونوں کے چہرے پر ڈالی اور اپنا مفہوم لگا ہوں سے سمجھا کر سکون سے آنکھیں موند لیں۔ ہمیشہ کے لیے۔

”دادی۔“ ایک دلدوز جج کے ساتھ وہ بے ہوش ہو کر لپک کر سہارا دیتے ہوئے عمر دراز خان کے بازوؤں میں آ رہی تھی۔



اس کی ”شہرت“ کا گراف مزید اونچا ہو کر ”اعلیٰ سطح“ کو چھونے لگا تھا۔ کتنے لوگوں نے اسے عمر دراز خان کی گاڑی میں ہسپتال میں ریسٹورنٹ میں دادی کی فوننگی کے موقع پر اور اس کے بعد باقاعدگی سے اس کے فلیٹ کا وقت بے وقت چکر لگاتے خبر گیری کرتے دیکھا تھا۔ ڈھکے چھپے انداز میں اخبارات میں بھی اس کیڈنڈل اچھالا جانے لگا تھا۔ عمر دراز خان کو تو جیسے ازل سے اس بات کی کوئی پروا نہیں رہی تھی مگر زمین ”شہرت“ کی یہ کرچیاں اپنی لبو لبان پلکوں سے چن رہی تھی۔

”تمہارا انتقام پورا ہو گیا ہے۔ دیکھ لو اتنا لبو تو تمہارے جسم سے بھی نہ بہا ہوگا جتنا ان آنکھوں سے



بہر چکا ہے۔ تم تو ”سود“ تک وصول کر چکے ہو۔ اب خدا کے واسطے میرا بچھا چھوڑ دو۔ مجھے سکون سے مرنے دے دو۔ کیا لینے آتے ہو میرے پاس۔ کس قابل چھوڑا ہے مجھے۔ اب کیا رہ گیا ہے جسے لوٹنے کی آس میں ہو۔ بس کرو اب۔“

اس دن بھی حسب معمول وہ شام کو اس کے قلیٹ پر آیا تو وہ بالآخر چیخ پڑی۔  
 ”ریلیکس۔ ریلیکس۔“ اس نے آہستگی سے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے صوفے پر بٹھا دیا اور پھر خود بھی نزدیک ہی بیٹھ گیا۔

”اچھا ہوا تم نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ ہم بھی اسی کے منتظر تھے مگر کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ ہم اس لیے باقاعدگی سے یہاں آتے ہیں کہ تمہاری دادی اماں اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت ہم پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے تمہیں ہمارے سپرد کر گئی ہیں اور اب تمہاری خبر گیری ہمارا فرض بن گئی ہے۔ تم یہاں بالکل اکیلی ہو اور ہمارا دھیان اسی پوائنٹ پر لگا رہتا ہے۔ اس لیے ہم نے طے کیا ہے کہ اب تمہیں اپنے ساتھ لے چلیں گے باقاعدہ شرعی رسومات ادا کر کے۔“  
 جواب میں بلا کے تلخ اور سرد انداز میں اسے گھورنے لگی۔

”کیوں۔“ ڈرامے کرتے ہو عمر دراز خان! اپنی حیثیت دیکھو اور میرا مقام دیکھو۔“  
 تم تو اس معاشرے کے بڑے پسندیدہ اعلام و جہا خلاقی اقدار کے پابند اور اثر و رسوخ کے باعث حاصل ہونے والی ”عظمتوں“ کے علمبردار ہو۔ عزت دار کہلائے جاتے ہو۔ میرے پاس کیا ہے۔ عزت سلامت ہوتے ہوئے بھی جی بھر کے بے عزت ہوئی ہوں۔ میری ”شہرت“ کے قصے تو اتنے پھیل چکے ہیں کہ اب ارد گرد کے لوگ مفت مشورے دینے لگے ہیں کہ

گھر کو بے حیائی اور فحاشی کا اڈہ بنانے سے بہتر ہے بازار کے بالا خانوں کو رونق بخش دو۔ مجھ کا لک زدہ وجود کا تعفن کون برداشت کرے گا۔ مجھے اس زندان میں رہنے دو۔ یہ تمہارے سنہری چنجرے سے کہیں بہتر ہے۔ یہاں میں اپنی مرضی سے سر پٹک پٹک کر جان تو دے سکتی ہوں تاں۔ ایک مرتی ہوئی بوڑھی روح سے کیے گئے وعدے کو نبھانے کے لیے مجھ سے نکاح کے دو بول پڑھو اگر تم اپنا سیاسی کیرئیر بچانے کے لیے گھر کے تاریک کونے میں ڈال دو گے مجھے گوارا نہیں اور دنیا کو خبر کر کے یہ بندھن جوڑنا گویا رسوائی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف ہوگا۔ لوگوں کی نگاہوں کا تسخیران کے شکوک اور الزامات کا واضح ثبوت بن کر ان کا سامنا کرنا میرے بس میں نہیں ہوگا اور پھر تم کیوں یہ گند سیٹھو۔ ایک بے بس بے سہارا اور بے سروسامان لڑکی جب اپنے دامن میں اس قدر ”شہرتوں“

کے داغ لیے ہو تو کون ”عزت دار“ اس کے سر پر چادر ڈالنے کو معاشرے کے مقابل ڈٹ کر کھڑا ہوتا ہے۔“ وہ بے پناہ دکھ کے احساس سے شدت سے رو دی۔  
 عمر دراز خان نے تاسف اور طول نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم نے دیکھا زمین! تم اپنی ذات کی تمام تر سچائیوں اور نیکیوں کے باوجود مستحب ٹھہری ہو اور ہم جو جرم میں برابر کے شریک ہیں بلکہ اصل مجرم ہیں ہم اپنی تمام تر بد اعمالیوں کے باوجود سب کی نظروں میں معزز اور معتبر ٹھہرے ہیں جو بات تم پر الزام بنا کر ڈالی جاتی ہے سب کچھ جاننے کے باوجود ہم سے براہ راست منسوب کرنے کی کسی میں جرأت نہیں ہوتی، حالانکہ سب کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر پانی ہمیشہ نشیب کی طرف ہی بہتا ہے۔ ہم اس معاشرے میں اعلیٰ معاشی و سماجی استحکام رکھتے ہیں اس لیے اٹھی ہوئی انگلیاں ہماری بلند بالا شخصیت کے رعب داب اور جاہ و جلال کے آگے خود بخود جھک کر برابر ہو جاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے زمین کہ عزت، شرافت، سچائی، مساوات اور توازن کے جن اعلا اخلاقی اصولوں کا تم پر چار کر رہی ہو یہ اب ہماری سوسائٹی کے لیے اجنبی ہو گئے ہیں۔ یہاں سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ ”پیسہ اور پہنچ لڑا کر کام نکالو“ اور دھاندلی کے اس عظیم اصول پر سب ہی افراد حسب توفیق مضبوطی سے کار بند رہتے ہیں۔ زمین! آج ہم تمہیں بتائیں کہ ایک زمانے میں ہم بھی تمہارے وضع کیے گئے اصولوں پر چلا کرتے تھے۔

ہم تین بھائی اور ایک بہن ایک غریب سی بیوہ کی اولاد تھے جس نے ہمیں شرافت و نجابت اور اخلاق و انصاف کا درس دیا تھا جس نے راتوں کو چراغ کی روشنی میں دوسروں کے کپڑے سی کر اور دن کو لوگوں کے گھروں کی صفائیاں ستھرائیاں کر کر کے ہمیں پالا تھا۔ بڑے ارمان تھے اس کے دل میں مگر ہوا کیا۔ ہمارا بڑا بھائی کالج میں گیا۔ بہت اصرار کے باوجود وہ کسی تنظیم کا ممبر نہیں بنا۔ اسے بس اپنی پڑھائی سے غرض تھی۔ کالج کی ہی دو مخالف تنظیموں میں آپس میں خون خرابہ ہو گیا۔ بات کالج کی چار دیواری سے نکل کر عدالت تک جا پہنچی۔ ہمارا بھائی بھی موقع کا عین شاہد تھا اس نے جا کر جج اگل دیا اور جج کی سزایہ ملی کہ اس تنظیم کے پیچھے اعلا سیاسی شخصیت نے اسے پراسرار طریقے سے قتل کر ڈالا اور ہماری بہن کو۔“ اس نے شدت جذب سے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

”ہماری بیوہ ماں ترپنے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ ہم تو انتہا درجے کے بے بس اور لاچار تھے مگر اس بات نے ہمارے جوان ہوتے لہو کے اندر بہت سی حقیقتوں کے رنگ بھر دیے۔  
 ہم نے سوچ لیا کہ غریبوں کو کیڑے کوڑے سمجھ کر ختم کر دینے کا اختیار رکھنے والی کرسیوں تک ضرور

رسائی حاصل کریں گے۔ ہمارے ملک میں دو طرح کے ڈاکو پائے جاتے ہیں۔ ایک تو جنگل کے ڈاکو ہیں اور دوسرے وہ لٹیرے ہیں جو کرسیوں پر بیٹھ کے عوام کو دیدہ دلیری سے لوٹ رہے ہیں۔ سوہم نے کالج لائف میں قدم رکھتے ہی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک مضبوط سیاسی شخصیت کی ”تربیت گاہ“ میں ”داخلہ“ لے لیا۔ اس نے ہمارے اندر کے ”جوہر“ جانچ کر ہمیں کندن بنا دیا۔ اس کے اشاروں پر ناپتے ہوئے اس کی معیت میں اس کو فالو کرتے کرتے ہم اپنا مقام خود بناتے گئے اور بالآخر مشنری تک جا پہنچے۔ چور دروازے نے ہمیں اس مقام تک پہنچا دیا جس کا میں ایک بے کس دلا چار بیوہ کا بچہ کبھی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ دراصل ہمارے ہاں گناہ و ثواب کے پیمانے بڑے مختلف ہیں ہم کتابوں میں کچھ پڑھتے ہیں اور عملی زندگی میں کچھ کرتے ہیں۔

ہمارا معاشرہ دو نفلے پن کا شکار ہے جو جرم ”بڑا آدمی“ کرتا ہے اس سے انماض برتا جاتا ہے اور اسے فراخ دلی سے معاشرے کے کسی عام سے معمولی سے بے حیثیت سے شخص کے سر قھوپ دیا جاتا ہے مگر ہاں کسی ”عام آدمی“ سے سرزد ہوا معمولی سا غلط فعل ساری عمر کے لیے سیاہ طوق بن جاتا ہے۔

”تو تم نے کیا انوکھا کارنامہ کیا؟ تم بھی تو ان ہی میں شامل ہو گئے ہو جو اپنے جرم کی صلیبیں کمزوروں کی گردنوں میں ڈالنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ماضی میں تم نے مظالم سہے اور اب خود ظالم بن کر معاشرے سے انتقام لے رہے ہو۔ کیا کمال دکھارہے ہو؟ نہیں عمروں اور خاندان اور حقیقت ہوتا تو یہ چاہیے کہ جس عظیم کرب اور ظلم کا آپ شکار ہوئے ہیں با اختیار بن کر اس سے دوسروں کو بچانے کی سعی کی جائے اور اگر ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو لوٹ مار اور ظلم و ستم کے اس بازار کو گرم کرنے والے گروہ میں شمولیت اختیار نہ کی جائے اگر آپ بازار کھنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو کم از کم بازار تو سکتے ہیں ناں۔ تم اپنی عمر میوں اور دکھوں کے بدلے کمزوروں سے لیتے پھر رہے ہو۔ دھاندلی کے جس زہریلے اصول نے تمہیں ڈسا، تم اب اس پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کی زندگیوں میں زہر گھولتے پھر رہے ہو؟ پیسے اور بکنج سے کام لے کر دوسروں کی پرسکون زندگیوں کو جہنم زار بنا رہے ہو۔ میں تو پور پور زخمی ہونے کے باوجود بہر حال مطمئن ہوں کہ ضمیر اپنی جگہ زندہ و تابندہ ہے مگر تم بے ضمیری کی گرد لیے کس طرح اپنے آپ کو روشن دل و دماغ رکھنے والے گروہ میں شامل کر رہے ہو۔

مجھے تو آج بھی اپنے کیے پہ افسوس نہیں۔ میں سمجھتی ہوں اگر اس دن وقتی طور پر گردن بچانے کے لیے تم سے سمجھوتا کر لیتی انصاف اور عدل و توازن کے اصولوں کو پس پشت ڈال دیتی تو آج مجھے کہتے وہ جگہ نہ ملتی جہاں بیٹھ کر اپنی مردہ ضمیری پر چند آنسو ہی بہا سکتی۔ کیا ہوا جو آج کانٹوں پہ گھسیٹی جا رہا

ہوں۔ سر عام پتھراؤ کیا جا رہا ہے میری ذات پر۔ میرا اندر تو روشن ہے ناں۔ میرے ہمراہ کچھ ستادوں اور ضمیر کی ملامتوں کا بوجھ تو نہیں ہے ناں۔“

وہ کچھ دیر یونہی دم بخود بیٹھا اس کی باتیں سن رہا پھر ایک دم اٹھ کر بنا کسی سوال جواب کے نکل کھڑا ہوا۔

ایک ہفتہ گزر گیا مگر وہ پلٹ کر دوبارہ نہ آیا۔ البتہ اس دوران فصیح باقاعدگی سے شام کو دروازے پر کھڑے کھڑے اس کی خیر خیریت اور اشیائے ضرورت کے بارے میں اپنے ہاس کی ہدایت کے مطابق پوچھتا رہا اور سودا سلف وغیرہ وافر مقدار میں بے کہے پہنچا دیتا۔ ایک دن اسی کے ہاتھ عمر دراز خان کی طرف سے ایک سفید لفافہ وصول ہوا۔ زمین نے کھول کر پڑھا۔ ساحر لدھیانوی کی بڑی پرسوز سی برجستہ نظم درج تھی۔

تو بھی کچھ پریشان ہے

تو بھی سوچتی ہوگی

تیرے نام کی شہرت تیرے کام کیا آئی

میں بھی کچھ پشیاں ہوں

میں بھی غور کرتا ہوں

میری کام کی عظمت تیرے کام کیا آئی

تیرے خواب بھی سونے

میرے خواب بھی سونے

تیری میری شہرت سے

تیرے میرے غم دو نفلے

تو بھی اک سلگتا بن

میں بھی اک سلگتا بن

تیری قبر تیرا فن

میری قبر میرا فن

اب تجھے میں کیا دوں گا

اب مجھے تو کیا دے گی

تیری میری غفلت کو

زندگی سزا دے گی

تیرے نام کی شہرت تیرے کام کیا آئی

”تیرے نام کی شہرت“ پڑھ کر کاغذ نہ کرتی وہ دھیرے سے بڑبڑاتی تھی۔ ”خیر تیرے نام کی شہرت“ نے میرا کام تو خوب تمام کیا ہے کہ نہ جی سکتی ہوں نہ مر سکتی ہوں۔ عجب عالم برزخ میں لاکھڑا کیا ہے مجھے۔“

تقریباً پندرہ دن بعد وہ اس کے روبرو تھا اور اس کے انداز اور تیور بہت قطعی قسم کے تھے۔ ”یہاں کوئی ضروری سامان ہے تو اسے ہمراہ لے لو۔ فرنیچر وغیرہ فصیح بکوا دے گا۔ کل مالک مکان کو فلیٹ خالی کر کے دیتا ہے۔“

”مگر کیوں؟“ وہ اس اچانک افتاد پر ہراساں ہو گئی۔

”ہماری بات طے ہو چکی ہے پہلے سے کل چار تاریخ ہے اور اس سے یہی طے ہوا تھا۔ اب تم تیاری کر لو۔“

”مگر میں کہاں رہوں گی؟“ وہ نئے سرے سے بے سائبان ہونے پر دکھ سے ساکت سی رہ گئی تھی۔

”آپ ہمارے ساتھ چلیں گی۔“

”مگر کہاں؟“ وہ ہنوز بوکھلا ہٹ کا شکار تھی۔

”پہلے ہم سعودی عرب جائیں گے وہاں اللہ اور اس کے رسول کے گھر میں حاضری دیں گے اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں کی معافی مانگیں گے۔ اپنی سیاہ اعمالیوں پر عذامت کے اشک نذر کریں گے پھر لندن میں مستقل رہائش پذیر ہو جائیں گے وہاں پہلے سے گھر خریدا جا چکا ہے سرمائے کی ہمیں کمی نہیں ہم وہاں کوئی چھوٹا موٹا بزنس اشارت کر لیں گے۔“

”اور یہاں؟“ وہ ہنسی اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

”ہمارا ریزائن اب تک چیف منسٹر صاحب کی ٹیبل تک پہنچ چکا ہوگا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا باز رکھنا سکتے تو باز رہ تو سکتے ہیں۔ اپنی سیاہ اعمالیوں میں اضافہ کر کے ضمیر کا بوجھ بڑھانے سے دل کا سکا وقرار کہاں نصیب ہوتا ہے۔“ وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

”تو کیا ہم ملک چھوڑ جائیں گے ہمیشہ کے لیے۔“ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ”نہیں میں ایسا نہیں

چاہوں گی۔ فرار تو مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتا۔“

”ہم فرار نہیں ہو رہے۔“ اس نے سر ہلا کر زور دے کر تصحیح کی۔ ”ہم عارضی طور پر منظر سے ہٹ رہے ہیں اور یہ قدم ہم نے تمہارے احساسات کو مد نظر رکھ کر اٹھایا ہے۔ وہاں ہمارے اور تمہارے بیچ کے بندھن کو کوئی تسخیر طغرا اور استہزا سے نہیں دیکھے گا۔ کوئی تمہیں تمہارے ماضی کا حوالہ دے کر شرمسار نہیں کرے گا۔ وہاں ہم عام لوگوں کی طرح زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزار سکیں گے۔ نہ کوئی منسٹر کی بیوی ہونے کے ناتے تمہارے افعال و اعمال اور حرکات و سکنات پر نظر رکھے گا نہ تمہاری اور ہماری نجی لائف کو اسکیڈنڈلائز کرنے کی نوبت آئے گی۔ کچھ عرصے تک ہم دونوں منظر سے دور رہیں گے تو خود بخود اس واقعہ کی شدت کم ہوتی جائے گی اور رفتہ رفتہ لوگوں کے ذہنوں سے یہ داستان فراموش ہو جائے گی۔ یاد رکھو زمانہ بڑا بھلکدو ہوا کرتا ہے۔ اسے روز ایک تازہ داستان چاہیے ہوتی ہے۔ وہ کیا ہے کہ

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے

خلقت شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

ہم اپنے بچوں کے ہمراہ واپس وطن لوٹیں گے تو ہم سے منسوب داستانوں کی بازگشت بھی سنائی نہیں دے گی اور یہ جو چند سال ہم باہر گزاریں گے اس میں نہ صرف خود اچھی طرح سیٹ ہو جائیں گے بلکہ ہمارے بچوں کے ذہنوں پر بھی ہمارے ماضی کا کوئی عکس نہیں پڑے گا۔

جب ہم واپس لوٹیں گے تو تم دیکھنا ہر چہ راترل ہو کر طے گا کسی آنکھ میں تمہارے لیے کوئی استہزا اور تشکیک نہیں ہوگی کہ زمانہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا بھولتا جاتا ہے تب تک گزری داستانوں کے تمام نقوش مدہم پڑ چکے ہوں گے اور ہم بھی سیاسی و سماجی وابستگیوں سے چھٹکارا حاصل کر کے ایک عام شخص کی طرح خوش و خرم بھرپور زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں گے اور اب خدا کے واسطے کچھ اور نہ کہتا۔“

اس کے کچھ کہنے کو پھڑ پھڑاتے لبوں پر بے ساختہ اس نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”ہماری بھیجی ہوئی نظم پڑھی تھی؟“ وہ مسکرا کر اس کا چہرہ جانچ رہا تھا۔ ”اس کا آخری بند کچھ مطابقت نہیں رکھتا۔ ہم تمہیں بہت کچھ دیں گے۔ اپنا سب کچھ۔ اپنا آپ تو بہت عرصہ ہوا اسی دیرانے میں ہم تمہارے سپرد کر چکے ہیں۔ ہاں تم ہمیں کیا دو گی۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کنجوس

تو ہمارے معاملے میں ہم سدا سے رہی ہو۔“ وہ شرارت سے اسے چھیڑ رہا تھا۔  
 ”اچھا یہ ٹکٹ سنبالو۔ ہماری کل صبح کی فلائٹ ہے اور اب فوراً سے پیشتر چلو۔ ادھر پرل کا ٹیٹل  
 ہوٹل کے ایک کمرے میں صبح قاضی اور گواہوں کو دو لہا دلہن کی اتنی طویل غیر حاضری کی جانے کون سی  
 وجوہات کے طو مار باندھ رہا ہوگا۔“

تو بہ کس قدر جلدی مچا رہا تھا یہ شخص۔

”نکاح کا فریضہ ہم اسی سرزمین پر انجام دے کر جائیں گے البتہ وہ عروسی اور بٹی مون منانے  
 کے مراحل یورپ جا کر طے کیے جائیں گے۔“ اس نے اس کا سنہری گداز ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں  
 لے کر ایک بھر پور گہری بولتی نگاہ اس پر ڈالی۔

”ویسے دل تو چاہتا ہے یہ مراحل اسی ویرانے میں جا کر طے کیے جائیں جہاں تمہاری موجودگی نے  
 گل و گلزار کھلا دیے تھے۔“ نگاہ لہجہ اور لمس تینوں پر شوق جذبات میں گندھے ہوئے تھے۔ حیا سے اس  
 کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کے نصیب کی صبح بالآخر طلوع ہو گئی تھی۔

## میں نے شام ہاری ہے

”اوکے ڈیڈی! پھر میں اور راجیلہ جا رہے ہیں گیٹ بند کر لیجیے گا۔“ شین بجلت میں چابی گھماتی ہوئی  
 باہر نکلی تھی۔

”ایک منٹ ٹھہرنا شین! یہ لسٹ لیتی جاؤ واپسی میں جنرل اسٹور سے کچھ چیزیں لیتی آنا۔ اب میں  
 کہاں جاؤں گا۔“ ڈیڈی نے سستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا کام بھی اس کے ذمے لگا دیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ ہماری واپسی آٹھ ساڑھے آٹھ تک ہوگی۔“

”رات کے کھانے تک پہنچ جاؤ گی؟ انتظار کریں تم لوگوں کا؟“، یعنی نے اپنی تک سب سے تیار  
 اسمارٹ خوش رو اور پر اعتماد لڑکیوں پر ایک نگاہ فاخرانہ ڈال کر بہت محبت سے دریافت کیا تھا۔

”نہیں بالکل بھی نہیں۔ آپ لوگ کھانا ضرور کھا لیجئے گا۔ بغیر انتظار کیے۔“ راجیلہ نے جھٹ پیش  
 بندی کے طور پر کہہ دیا تھا۔ مبادا ماں باپ ان کے انتظار میں بھوکے بیٹھے رہیں۔

”شیخ صاحب! آپ کا بچوں کو پالنے کا طریقہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ آپ لوگوں نے اپنی اولاد کو  
 بالکل بے لگام چھوڑا ہوا ہے۔ اوپر سے الگ گاڑی دے کر ڈرائیونگ سکھادی کہ جہاں ان کا دل چاہے

۷۷۷۷۷۷۷۷



شیخ صاحب خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئے۔ ظاہر ہے مہمان تھے۔ گھر آئے ہوئے تھے۔ بیگم کے رشتے دار تھے وہ مصلحتان کی بات کا منہ توڑ جواب دینے سے احتراز کر گئے۔ تاہم اتنا ضرور کہا۔

”ابراہیم صاحب۔ اولاد کھلونا نہیں ہوتی تجربہ گاہ میں رکھا کیمیکل نہیں ہے جس پر فارمولا اپلائی کر کے اس کو مختلف انداز میں اپنی پسند کے مرکب میں تبدیل کیا جاسکے۔“ وہ لہجہ کو تلخ ہونے سے نہ بچا سکے۔

”یہ تو آسانی تھہ ہوتی ہے۔ گھر کی رونق، دل کا چین، روح کی خوشی۔ بھلا آنگن کی خوشبو بند مٹیوں میں مقید کی جاسکتی ہے؟“

”آپ نے جانے کن ہواؤں میں رہتے ہیں۔“ ابراہیم صاحب نے ہاتھ ہلا کر بیڑاری اور طنز سے اپنے ہم زلف کو دیکھا۔ ”میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نظر سے۔“

”حالانکہ یہ سراسر خلاف فطرت قانون ہے۔ قطعی اور ناقابل برداشت۔ میں تو اس محاورے کو ایک ظالمانہ روش سے تعبیر کرتا ہوں۔ آپ بے شک اولاد کو روکھی سوکھی کھلائیں مگر اس کے دل و ذہن کو مطمئن روشن اور ان کی روحوں کو محبت کی روشنی سے بھر پور رکھیں۔ بظاہر سجا ہونا کے چاندی کے پنجرے میں سونے کی غذا کھانے والوں کے دل مردہ ہوں تو تن کی آرائش سے کیا حاصل۔ جس کھکھو کرگ جاں محسوس نہ کر سکے وہ سکھ کہاں رہتا ہے بلکہ جی کا آزار بن جاتا ہے۔ دل خوش ہو تو زندگی کا روکھا پھیکا روپ بھی سہانا لگتا ہے۔ روح تشنہ ہو تو جام و مینا میں بھی کشش نہیں رہتی۔“

”کس بحث میں الجھ گئے بھائی صاحب! آئیے باہر بیٹھتے ہیں لان میں۔“ ابراہیم صاحب کی بیگم شائستہ اپنے شوہر کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں سے گھبرا کر بہنوئی سے ملتی ہو کر بات چلتے ہوئے بول پڑیں۔

”ہاں بھئی۔ آپ بھی عجیب ہیں شیخ صاحب! بات کو لے کر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔“ یعنی نے بھی اپنی بہن کے چہرے کی گھبراہٹ اور بہنوئی کی پیشانی کی شکنوں سے بات کی سنگینی کا اندازہ لگا کر شیخ صاحب کو خفگی سے ٹوکا۔ ”دیکھیں تو۔ مالی گلابوں کی کیاری کی گوڑی کر رہا ہے۔ اس کے پاس کھڑے رہیں۔ اتنا ہی زمانہ بھر کا ہے۔ میں نے سیاہ گلابوں کے اتنے نایاب پودے منگوائے ہیں۔ کہیں ناس نہ مار ڈالے ان کا۔“

”اچھا جناب۔“ شیخ صاحب ہلا چون و چرا اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”آئیے ابراہیم صاحب لان میں بیٹھتے ہیں۔“ وہ خوش دلی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ جو شیخ صاحب کی جی حضور پر طنزیہ نظروں سے

آزادانہ منہ اٹھائے چل پڑیں۔“

نشین کے گاڑی نکال کر لے جانے کے بعد جب شیخ صاحب گیٹ بند کر کے دوبارہ ابراہیم صاحب کے پاس اپنی نشست پر بیٹھے تو بڑی دیر سے ماحول کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ابراہیم صاحب کی تنگ نظری اور محدود سوچ اظہار کا روپ دھارے بغیر نہ رہ سکی۔

”ایسی بات نہیں ہے بھائی صاحب! ہمارے بچے کسی غلط جگہ نہیں جاسکتے۔ ہمیں اپنے بچوں پر پورا پورا اعتماد ہے۔“

یعنی کو اپنے بہنوئی کا انداز فکر بہت کھلا مگر مصلحت کوئی کے پیش نظر دل کے جذبات چھپا کر خاصی نرمی سے ان کی بات کے جواب میں رد عمل کا اظہار کیا۔

ابراہیم صاحب کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ وہ بولے تو ان کا لہجہ حد درجے استہزائیہ اور کٹیلا تھا۔

”آج کل کے ماں باپ بھی عجیب طرح کے ماڈرن ازم کا شکار ہو گئے ہیں۔ فیشن زدہ طبقے کی فہرست میں اپنا نام لکھوانے کی دھن میں سب ادب آداب قاعدے قانون اور اخلاق و اصول فراموش کر دیتے ہیں۔ بچوں کو سر چڑھا کر بے جا آزادی دے کر انہیں بد تمیز خود سر اور منہ پھٹ بنا کر پیش کرنا گویا ان کی مجبوری بن گیا ہے۔ آخر تہذیب حاضر کے داعی جو ٹھہرے۔“

”معاف کیجئے گا بھائی صاحب۔ آپ کی سوچ سراسر تعصب اور کوتاہ نظری پر مشتمل ہے۔ نہ تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے طبقاتی خانوں کا کمپلیکس ہے اور نہ اپنی اولاد کو اس جنون میں مبتلا دیکھنے کا شوق رہا ہے۔“

شیخ صاحب کو اپنے لہجے کی تلخی چھپانے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ بیگم کے بہنوئی ہونے کے ناتے وہ ابراہیم صاحب کی ہرزہ سرائی برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

”اپنی اولاد پر نظر رکھنی چاہیے۔ آج کل آگ لگی ہوئی ہے زمانے کو شیخ صاحب۔“ ابراہیم صاحب کا انداز ناصحانہ پن لیے ہوئے تھا۔ ”پھر لڑکی ذات کو تو بالکل بھی ڈھیل نہیں دینی چاہیے۔ ذرا کھلی ہا نہیں ملی تو فوراً سے پیشتر پر پرزے نکال کر اماں باوا کی عزت سر بازار خاک میں ملانے کا باعث نہیں بنی بڑی کچی مخلوق ہے۔ میٹھی باتوں اور سنہری بہلاؤں میں آ جانے والی۔ بھلا اس کو اعتبار کی زنجیر سے کیسے باندھا جاسکتا ہے۔ بہت ناقابل اعتبار شے ہوتی ہے عورت۔ کڑے پہروں میں نہ رہے تو چوک مٹ عزتیں نیلام ہو جائیں۔“

انہیں دیکھ رہے تھے۔

ابراہیم صاحب عورت اور اولاد کو جوتی کی نوک پر رکھنے والوں میں سے تھے۔ کسی کو ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ ان کے خیال میں گھر کا سربراہ گھر کے ہر معاملے میں فیصلہ کرنے کا مکمل طور پر مجاز ہوتا ہے اور بیوی اور بچے اس کی رضا و خوشی کے خلاف سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔

”جی نہیں۔ میں اب نہاؤں گا۔“ وہ چڑ کر بولے پھر کرخنگی سے بیوی سے مخاطب ہوئے۔

”شائستہ میرے کپڑے نکال کر استری کرو جلدی سے۔“ ان کا لہجہ کھر درا اور حکمانہ تھا۔ یوں جیسے بیوی کو نہیں ملازمہ کو حکم دیا ہو۔ شائستہ سر جھکا کر تعمیل کے لیے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ ان خواتین میں سے تھیں جو ہر معاملے میں شوہر کی جنبش اور وہی منتظر رہتی ہیں۔ ان کا مرد مکمل طور پر ان پر حاوی تھا۔ نہ صرف بیوی پر بلکہ بچوں پر بھی مکمل کنٹرول رکھتا تھا۔ خاص طور پر بڑے بیٹے حارث اور اس سے ڈیڑھ سال چھوٹی گنناز کی تو ایک ایک سانس پر نظر رہتی تھی۔ حالانکہ بیٹا اب سولہویں برس میں تھا مگر باپ کے چاہر اور درشت رویوں کی بدولت ذہنی اعتبار سے بہت ناپختہ تھا۔ باپ کو دیکھتے ہی قدموں سے جان نکلنے لگتی اور ایک چنگھاڑ پر پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ ابراہیم صاحب کا جب دل چاہتا حارث کو دھنک کے رکھ دیتے۔ ایک دو سال پہلے تک تو گنناز بھی ان کے جسمانی تشدد کی زد میں رہی تھی مگر اب جب سے وہ بڑی ہوئی تھی۔ ان کا ہاتھ کچھ جھجکے لگا۔ البتہ تھپڑ اور لہجے کی فرعونیت ختم اپنی جگہ برقرار تھی۔

وہ لوگ اپنی خالہ کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ میٹھی کی ساس کا ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا۔ عیادت کے لیے سارا خاندان آیا۔ مجبوراً ابراہیم صاحب کو بھی پنڈی آنا پڑا۔ مگر وہ اپنے اطوار اسلام آباد نہیں رکھ کے آ سکتے تھے۔ سو وہ برقرار تھے۔

بات بے بات بیوی کی سب کے سامنے تذلیل اولاد پر ہاتھ اٹھانا اور ذرا سی بات پر جھاڑ کے رکھ دینا۔ اپنے رعب میں رکھنے کے چکروں میں ان کے جذبات و احساسات اور عزت نفس کو مسل کے رکھ دینا گویا وہ اپنا اولین تر فریضہ اور حق سمجھتے تھے۔

کہنے کو وہ پی ایچ ڈی کیے ہوئے تھے مگر انسانی جذبات کی الف سے بھی واقف نہیں تھے۔ ان کے نزدیک عورت ایک ناقص العقل اور کم تر مخلوق تھی جس کا واحد کام مرد کی تابعداری اور ولداری ہوتا ہے۔ اور مرد عورت کو جس حال میں رکھے عورت کو اس کا سپاس گزار ہونا چاہیے۔

اور یہ ابراہیم صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں موم کی نازک جیسی خصوصیات رکھنے والی عورت ملی

تھی۔

حد درجہ صابر قانع اور پردہ پوشی کے ہنر سے آشنا۔

ابراہیم صاحب کی زبان تو جوشعلے اگلتی تھی ان کے ہاتھوں کی جارحیت اور تشدد کے باعث شادی کے ان سترہ سالوں میں کتنی ہی بار شائستہ موت کی دہلیز چھو آئی تھیں۔ خاندان بھر میں ابراہیم صاحب کی فرعون صفتی اور سنگدلی کے چرچے تھے۔

مگر وہ شوہر پرست عورت لب بے رکھتی اولاد کو بھی باپ کی تعظیم و تعمیل کا درس گھول کے پلاتی رہتی تھی۔ گنناز سے تین سال چھوٹی زرگل تھی اور اس سے تقریباً ساڑھے نو سال بعد ماہ گل اور احمد جڑواں پیدا ہوئے تھے جو ابھی بہت چھوٹے تھے۔ دیے تو سب بچوں میں صبر و ضبط کا مادہ موجود تھا مگر زرگل سب سے زیادہ حساس، کم گوار اور زیرک تھی۔ وہ کم عمری سے ہی گھر کے جیل نمنا ماحول سے مانوس ہو چکی تھی۔ گنناز کے ضبط کا پیمانہ البتہ کبھی کبھار چٹک اٹھتا تھا۔



”نشین آئی! میں اندر آ جاؤں۔“ حارث کے جھجکتے ہوئے انداز پر اپنے کمرے کی وارڈ روب بند کرتے ہوئے نشین نے پلٹ کر دلچسپی سے دیکھا۔

”ہاں۔ ہاں۔ ضرور۔“ اس نے بخوشی اسے اندر آنے کی دعوت دے دی۔ اس کے لہجے میں نرمی اور محبت کے زیر اثر حارث اس کے کمرے میں آ گیا اور کچھ چٹکا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”دراصل مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ یونہی پانی پینے کی غرض سے باہر نکلا تو راہداری سے گزرتے ہوئے آپ کے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ اس لیے میں ادھر آ گیا۔ کہیں آپ کا سونے کا موڈ تو نہیں؟“

”ارے نہیں بھئی۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔ میں ایک بجے سے پہلے کبھی نہیں سوتی اور دیے بھی گرمیوں میں تو گیارہ بجے تک لوگ باہر واک کر رہے ہوتے ہیں۔ تم نے بہت اچھا کیا جو ادھر آ گئے۔ میں بھی بور ہو رہی تھی۔ مل کے گپ شپ لگاتے ہیں۔ تم لوگ شاید جلدی سونے کے عادی ہو۔ ورنہ میرا تو بہت دل چاہتا ہے اس ٹائم سب مل کر کوئی گیم کھیلیں یا باتیں کریں۔“

وہ بہت عام سے انداز میں کہہ رہی تھی مسکرا کر اسے دیکھتی ہوئی۔

”ہمارے گھر میں دس بجے کے بعد سب کو اپنے اپنے کمرے جا کر آرام کرنے کا حکم مل جاتا ہے۔ ابو جی کورات کو دیر تک جاگنا سخت ناپسند ہے۔“ حارث کے لہجے میں عجیب سی اکتاہٹ تھی۔ نشین ایک لمحے

کو چپ سی رہ گئی۔ اپنے سخت گیر اور جابر خالو کی شخصیت سے بخوبی واقف تھی۔  
 ”اچھا چلو خیر۔ فی الحال تو تم لوگ مہمان ہو۔ ہمارے یہاں تو یہ قوانین لاگو نہیں ہوتے۔ آؤ کارڈز  
 کھیلنے ہیں۔ شوق رکھتے ہو نا؟“

”جی۔“ حارث کا چہرہ اسرت سے گلنار ہو گیا۔

ذرا دیر بعد وہ دونوں بہت جوش اور انہماک سے کارڈز کھیلنے ہوئے زمانے بھر کی بے سرو پا باتوں پر  
 بحث کر رہے تھے۔ ہنس کھیل رہے تھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کارڈز بیڈ پر پھیلائے بیڈ کے ایک  
 سرے پر حارث تھا اور دوسری طرف ٹینی بیٹھی ہوئی تھی۔  
 پھر جیسے ایک برق کوندی تھی۔ کوئی خوفناک طوفان اٹھا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو آدمی رات کو؟“ ابراہیم صاحب نے دبے لہجے میں غزا کر اس کا دایاں  
 کان اپنی کرخت انگلیوں میں دبو چا تھا۔ ان کی قہر برساتی نظروں سے وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔  
 ”وہ۔ وہ ابوجی۔“ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے حواس باختہ ہو کر انہیں دیکھ رہا تھا۔

”چلو ذرا کمرے میں۔ تمہاری تو میں اچھی طرح خبر لیتا ہوں۔“ انہوں نے دانت پیس کر ایک زور  
 دار تھپڑ اسے رسید کیا۔

”خالو جان۔ پلیز۔“ حیران پریشان کھڑی ٹینی تڑپ کر حارث کی سمت بڑھی تھی۔ وہ ان کی۔  
 غضب ناک کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ بھلا جوان لڑکے پہ اس طرح کسی کے سامنے ہاتھ اٹھانا اور اس  
 کی عزت نفس مجروح کرنا کہاں کی انسانیت تھی۔

”ہم لوگ یونہی وقت گزاری کے لیے کارڈز کھیل رہے تھے۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ اور حارث کو میں  
 نے خود روکا تھا وہ تو سونے جا رہا تھا۔“ وہ یہی سمجھی تھی کہ حارث کو اس وقت جاگتے پا کر آگ بگولہ  
 ہو رہے ہیں۔

”بی بی! تم اپنے کام سے کام رکھو تو مہربانی ہوگی۔“ ان کی سرو نظروں نے ایک لمحہ کو ٹینی کو ٹھٹھا کر  
 رکھ دیا۔ کس قدر غیریت بھرا اجنبی لب و لہجہ تھا۔

وہ اسی طرح بیٹے کو پکڑے ہوئے قدم بڑھانے لگے۔ ساتھ میں باز پرس جاری تھی۔

”آدمی رات کو لڑکی کے کمرے میں اس کے بستر پر بیٹھنے کیا کر رہے تھے۔ بے شرم۔ بے غیرت۔  
 کیا سمجھتے تھے میری نظروں میں دھول جھونک کے رنگ رلیاں منالو گے۔ پاگل سمجھا ہوا ہے باپ کو مجھے تو  
 تم لوگوں کی رگ رگ کی خبر رہتی ہے۔“

اور حارث کے ساتھ ساتھ ٹینی کو بھی یہی محسوس ہوا جیسے زمین اپنے مدار سے ہٹ گئی ہو۔ وہ دونوں  
 کانوں پر ہاتھ رکھے شدید رنج سے زمین پر بیٹھ گئی وہ حارث سے کم از کم دس بارہ سال بڑی تھی پھر وہ تو  
 ابھی نو خیز لڑکا تھا۔ چودھویں برس میں تھا۔ انجان۔ ناواقف۔ معصوم اور سادہ ذہن کا مالک۔  
 حارث تو جیسے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اگلے دو دن تک وہ ٹینی کے سامنے نہیں آیا کہ اس سے نظر  
 ملانے کے قابل چھوڑا کب تھا باپ نے۔

تیسرے دن ٹینی سے دو سال چھوٹا احرا چانک بنا کسی اطلاع کے امریکہ سے گھر آن پہنچا۔  
 وہ امریکہ میں زیر تعلیم تھا۔ اونچے لے با توئی شوخ اور خوش مزاج سے خوبصورت نوجوان کو دیکھتے ہی  
 ابراہیم صاحب کی پیشانی پر نظر کی لکیریں کھینچ گئی تھیں۔ انہوں نے گلنار کو بلا کر سختی سے حکم سنا دیا۔  
 ”خبردار جو کمرے سے باہر۔ لڑکے کے آس پاس نظر آئیں مجھے۔“

وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے فلمی ہیرو کی طرح اسٹارٹ اور وکٹس پر سنائی والے شریر سے کزن سے مل  
 کر آ رہی تھی۔ دل میں مسرت اور بیچان کی نامانوس لہریں اٹھ رہی تھیں۔ زندگی بہار کے جھونکے کی مانند  
 لطیف تر محسوس ہو رہی تھی۔ مگر باپ شاید اس سے پہلے اس کے بنجر ویران دل میں کھلتے خوابوں کے  
 گلستان سے واقف ہو گیا تھا۔

وہ حد درجے سہم گئی۔ دل میں باپ کی دہشت ایسی بیٹھی کہ ٹینی کے ہزار اصرار کے باوجود رات کو  
 کھانے کی ٹیبل پر نہیں آئی تھی۔

اور اگلے دن ابراہیم صاحب نے کوچ کا حکم سنا دیا۔

”بھائی صاحب! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی ایک ہفتہ ہی تو ہوا ہے۔“ بیٹنی بیگم نے بصد التجا انہیں  
 روکنا چاہا تھا۔

”بہت رہ لیا۔ اب اپنے گھر کو بھی دیکھنا ہے۔“ انہوں نے کھر دے خشک لب و لہجے میں جواب  
 دیا۔ پیشانی پر ہمہ وقت براجمان رہنے والی ناگواری کی شکلیں ہنوز جگمگا رہی تھیں۔ انہوں نے خود بھی  
 اخلاق برتنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

بہنوئی کے اکل کھرے انداز پر بیٹنی بھی چپکی رہ گئیں۔ اب اور کہتیں بھی کیا۔ حالانکہ جانتی تھی شائستہ  
 کا بہت دل چاہ رہا ہوگا مزید رہنے کو مگر شوہر کے موڈ کے پیش نظر وہ بلا چون و چرا سامان باندھنے لگیں۔  
 ابھی کل رات ہی توفیقہ فیصلہ سناتے ہوئے شوہر صاحب نے فرمایا تھا۔

”بیگم! تمہاری بہن کے جوان بیٹے کی آمد سے مجھے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہماری جوان بیٹی ہے۔ آج

کل کی نسل میں تو یوں بھی شرم و حیا نہیں رہی وہ لڑکا باہر سے پڑھ کے آیا ہے۔ نہ آنکھ میں لحاظ ہے نہ چہرے پر شرافت۔ مجھے تو کل پوری رات نیند نہیں آئی۔ بار بار گھناڑے کمرے کے آگے ٹہکتا رہا ہوں۔ بس بہت ہوئی۔ کل سامان باندھ لو۔ پھر اپنے صاحبزادے کے کروت تو دیکھ ہی چکی ہو۔ مٹین سے چٹنگیں بڑھا رہا ہے۔ سخت بد لحاظ اولاد ہے تمہاری طرح تمہاری ادائیں اور بازاری پن آج تک نہیں گیا۔ اولاد کو بھی اسی رستے پر چلانا چاہتی ہو کیا؟“

اور وہ پتھر کی صورت بنی حسب معمول چپ چاپ سنتی رہیں سر جھکائے لب سے سب الزام سن لیے۔ شدت سے احتجاج کرتا دل البتہ رور و کر کہہ رہا تھا۔

”ابراہیم صاحب! کبھی تو شک اور بدگمانی کی بھیا تک عینک اتار کر دنیا کو دیکھیں۔ جو کچھ آپ سوچتے رہتے ہیں محض آپ کے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔ اور چونکہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو کبھی زندگی میں اپنی غلطی ماننے کا فعل سرانجام نہیں دیتے۔ اس لیے جس آنکھ سے دنیا کو دیکھتے ہیں اسی کو درست قرار دے کر سب کو اسی آنکھ سے زندگی دکھانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے خود بھی عذاب میں رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی عذاب میں رکھتے ہیں۔ ورنہ یمنی کی اولاد تو ایسی ہے کہ لوگ آرزو کیا کرتے ہیں۔ کامیاب پر اعتماد زندہ دل اور محبت بھرے جذبات رکھنے والی۔ کبھی اپنی اولاد کی طرف نگاہ کریں۔ انہیں کیا دیا ہے آپ نے۔ خوف بد اعتمادی بے اعتباری، سراسمگی، دہشت مایوسی، ناکامی بے چارگی۔

شائستہ کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ مگر لبوں پر حسب معمول ضبط کے کڑے پہرے تھے۔

اب تو عادت سی ہو گئی تھی۔ اپنے دل کو مار کر اپنی انا کو کچل کے اپنی خودداری کو تیاگ کر شوہر کی منت و خواہش اور جی حضور کی کرنے کی۔

وقت کچھ اور آگے بڑھتا گیا۔

مگر ابراہیم صاحب کے رویوں کی سرود سگناخ چٹان کو نہیں پچھلتا تھا سونہ پتھلی۔ وہی سخت گیر انداز وہی خون خشک کر ڈالنے والے جارحانہ تفتیشی تیور۔ وہی کڑک دار لہجہ اور وہی۔ جذبات کے لمس سے عاری سپاٹ چہرہ۔

گھر میں فون تھا مگر مانسوائے ابراہیم صاحب کے کوئی اس سے فائدہ اٹھانے کا مجاز نہ تھا۔ فون تالے میں بند رہتا تھا۔ اول تو بچوں کے کلاس فیلوز میں سے ابراہیم صاحب کے تفتیشی اور کڑخت انداز سے کتر اگر کوئی فون نہیں کرتا تھا اور بالفرض کوئی کر بھی لیتا تو لمبی چوڑی وضاحتوں کے بعد فون کرنے اور

فون سننے والے کو یہ سہولت حاصل ہوتی مگر اس طرح کہ ابراہیم صاحب ایکس مینشن کے ذریعے اپنی بیٹی یا بیٹے کا پورا فون سنتے تھے کہ کہیں ان کی اولاد غلط قسم کی دوستیاں تو نہیں کر رہی۔

بچوں کو دوستوں یا کلاس فیلوز کے ہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اور جو بھولے بھٹکے کوئی آجاتا تو کسی نہ کسی بہانے سے وہ سر پر سوار رہتے۔ اگر گھناڑے یا زرخل کی دوست ہوتی تو شائستہ کو پاس بیٹھ کر باتیں سننے اور دھیان رکھنے کا آرڈر دیتے تھے۔ کبھی بلا جواز ڈرائنگ روم میں آکر حادث کو اس کے دوست کے سامنے کسی بے محل بات پر ڈانٹ کر رکھ دیتے۔

جانے دوسروں کی عزت نفس تباہ کرنے میں انہیں کیا لطف آتا تھا۔ کون سی حس کی تسکین ہوتی تھی۔ یقیناً پس پردہ وہ احساس کمتری کا جذبہ کارفرما تھا جسے دبانے کے لیے وہ اپنے آپ کو برتر اور حاکم و مختار سمجھ بیٹھے تھے اور اس کے عملی ثبوت کے طور پر اپنی بیوی اور اولاد کو اپنے قدموں میں جھکانے کے خواہش مند رہتے تھے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنے گھر کو زچ رکھتے تھے۔ شائستہ شادی سے پہلے بہت سوشل قسم کی زندہ دل اور ہمدرد دل رکھنے والی خاتون ہوا کرتی تھیں۔ میل ملاپ بڑھانا اور محلے داروں کی خبر گیری رکھنا جیسے خود پر فرض سمجھا کرتی تھیں۔ مگر ابراہیم صاحب کی زوجیت میں آکر ان کے حکم کی تعمیل میں ان کے جذبات کا گلا گھونٹنا ہی پڑا۔ اب یہ عالم تھا کہ پاس پڑوس تو کجا اپنے عزیز رشتے داروں کی خوشی غمی میں شریک ہونے تک کی نوبت نہیں آتی تھی کہ ابراہیم صاحب ساری دنیا سے کٹ کر صرف اپنے گھر کی سلطنت تک محدود رہنا اور رکھنا پسند کرتے تھے۔

بچوں کا بچپن خوف پریشانی اور اعتماد و مسرت سے یکسر محروم فضا میں بسر ہوا۔ لڑکپن حسرت اور نا آسودگی کی نذر ہوا۔ گھناڑے حادث اور زرخل اپنے اپنے جذبات ایک دوسرے سے کہہ سن کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔ حادث بڑے جوش سے کہتا تھا۔

”دیکھنا جب بڑا ہو کر گھر بساؤں گا تو بہت خوشگوار ماحول دوں گا گھر والوں کو۔ جہاں اپنی مرضی سے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے اور آنے جانے کی مکمل آزادی ہو۔ ابوجی کی طرح گھر کو سنٹرل جیل ہرگز نہیں بنائوں گا جہاں سکون اور خوشی کا سانس لینے کو ترستے رہ جاتے ہیں۔“ اس کے خیالات بہت روشن تھے۔

ابراہیم صاحب کے خیال کے مطابق لڑکی لڑکے کو بیس سال کی عمر سے پہلے پہلے بیاہ دینا بہت ضروری تھا۔ ورنہ اولاد بقول ان کے خدا نخواستہ والدین کے نام پر بیٹھ بھی لگا سکتی ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کا کیا بھروسہ۔ سو جیسے ہی گھناڑے نے اٹھارہ کے سن میں قدم رکھا ان کی راتوں کی نیندیں حرام



ہونے لگیں۔ طرح طرح کے اوبام کا شکار ہو گئے۔ جنہیں بتاتا کر بیوی کا دل بھی ہولاتے رہتے۔ چونکہ ان کے پاس پڑوس اور عزیز رشتے داروں سے تعلقات ناروا کھینچے کھینچے رہے تھے اس لیے کوئی بھی ان کی طبیعت کے پیش نظر گلناز کے لیے رشتے کی بات لے کر نہیں آیا۔ ابراہیم صاحب نے خود سے بھی دو چار رشتے دیکھے مگر کوئی ڈھنگ کا نہیں مل رہا تھا۔ سب ان کے گھر کے جابر و قاهر ماحول سے خائف تھے۔ بالآخر جب گلناز نے بیسویں برس میں قدم رکھا تو ابراہیم صاحب صحیح معنوں میں ہوش میں آ گئے۔ ہوش ٹھکانے لگے تو دبے لہجے میں ایک روز بیوی سے کہنے لگے۔

”وہ تم نے بہت پہلے کسی سے سرسری سی بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ یمنی اور تمہارا ارادہ ہے آپس میں رشتے داری بڑھانے کا۔“ ان کا اشارہ احمر کی طرف تھا۔

”وہ تو بہت پہلے کی بات تھی۔“ شائستہ آزر دگی میں گھرنے لگیں۔

”مگر اب بھی تو بات بڑھائی جاسکتی ہے۔“

وہ عادت سے مجبور ہو کر تنگ گئے۔ مانتے پر تہو ریاں گہری ہونے لگی تھیں۔

”اب کا میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔“ شائستہ دامن بچا لگیں۔

”تم کسی کے ذریعے کہلو آؤ اس کو۔“ ابراہیم صاحب تحمانہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ شائستہ کا دل جل کر خاک ہونے لگا۔

بھلا ایسا کون سا پردہ تھا۔ سبھی خاندان والے ابراہیم صاحب سے واقف تھے۔ ظاہر ہے شادی صرف لڑکی سے تو نہیں کی جاتی۔ پورے خاندانی سسٹم کو دیکھا بھالا جاتا ہے۔ ابراہیم صاحب کے مزاج اور طرز تربیت سے سبھی تو بہ تلا کرتے دامن بچا جاتے تھے۔ پھر ان کی حاکمانہ اور درشت طبیعت کی وجہ سے بچوں کو کزنز وغیرہ سے گھٹنے ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ کوئی مردانہ کزن آتا تو گلناز اور زرگل گویا نظر بند کردی جاتی تھیں۔ ابھی پچھلے دنوں احمر دونوں کے لیے کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد آیا تھا اور شائستہ کے انتہائی اصرار پر ان کے ہاں ٹھہرا تھا۔ ابراہیم صاحب کے نظر میں تھانیدار کے مخصوص جذبات کا روپ دھارنے لگی تھیں۔ ہر لڑکیوں کی نگرانی، ماہ گل احمد اور حارث کو بلا وجہ احمر کے سامنے جھاڑ کے رکھ دیتے تھے۔ گھڑی گھڑی گلناز اور زرگل کے کمرے کے گرد چکر لگاتے رہتے۔ احمر سے حارث اور احمد کو بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ بقول ان کے امریکہ پلٹ آؤ اور رش امیر زادہ لڑکوں کے ذہن پر اگندہ کر سکتا تھا۔ احمر رخصت ہوا تو گھر والوں کی جان میں جان آئی اور اس جبری نظر بندی سے نجات ملی۔

حارث جوں جوں جوانی کی سرحدیں چھوٹا ہوا آگئی حاصل کر رہا تھا اس کے دل میں باپ کے غیر مانی طرز عمل کے خلاف شدت سے مزاحمت ابھرنے لگی تھی۔ اب وہ کبھی کبھی جواب دے ڈالتا۔ ابراہیم صاحب غضب کا آسمان چھوتے ہوئے شائستہ پر چڑھائی کر دیتے تھے۔ پھر بکتے بھکتے جونہی گھر سے باہر نکلتے، حارث اپنا غصہ نکالنے کو تن فن کرنے لگتا۔ انتقاماً وہ زیادہ تر وقت باہر گزارنے لگا۔ ایسے کوں سے زیادہ بننے لگی جو چار حانہ اور جو شیلے طور طریقوں کے مالک تھے۔ حارث کے اندر بچپن کی رد میاں بے بسی اور احساس ذلت مافی روش پہ چلنے سے تسکین پانے لگیں۔ اکثر وہ گلناز اور زرگل اپنے ل کی بھڑاس نکالنے کو اکٹھے بیٹھ کے اپنے اپنے دکھ روتے۔ زرگل بولنے سے زیادہ سننے پہ زور دیتی۔ ان بھی اس نے اپنے دل کو ہر طرح کے جذبات سے عاری بنا کر ساری توجہ پڑھائی کی سمت مبذول کر لی تھی۔ وہ میٹرک کے امتحانات کی تیاری کر رہی تھی۔

”وہ زرگل اپنی دوست کے ہاں جانے کی اجازت مانگ رہی ہے۔ پچھلی گلی میں رہتی ہے۔“

ایک شام شائستہ شوہر کی عدالت میں سرا سیمہ سی درخواست پیش کر رہی تھیں۔ جسے سننے ہی ابراہیم صاحب کی تیوریاں خونخوار ہو گئیں۔ اور چہرے پر غیض کی سرخی لہرانے لگی۔

”کیا کرنا ہے وہاں اس کو۔ اور یہ دوستیاں کب سے پال لیں اس نے۔“ ان کا لہجہ کڑک دار تھا۔

”دوست کہاں کلاس فیلو ہے۔ اس سے بہت ضروری نوٹس لینے ہیں۔“ وہ لجا چت سے بیٹی کی کالت کرنے لگیں۔ مگر ان کے شک کا کیا علاج۔

”یوں آدمی رات کو منہ اٹھا کے جانے کی کیا تک نفی ہے۔ دن کو نہیں یاد تھا اسے؟“

وہ خوا خواہ برا فروختہ ہونے لگے۔ عادت کے مطابق۔ حالانکہ ابھی شام کے پانچ بجے تھے۔ اور مغرب ہونے میں بھی کچھ وقت باقی تھا۔

”میں چپا کروا لیا تھا۔ وہ بچی گھر پر نہیں تھی۔“

”کل منگو الینا۔“ انہوں نے سرد مہری سے ہاتھ بلایا۔

”پرسوں پیپر ہے اس کا۔ اس کو ضروری چائیں۔“ شائستہ کو بیٹی کا مستقبل عزیز تھا سو ہمت کر کے بات آگے بڑھانے لگیں۔

”ہونہ۔ ایک تو ان کی پڑھائیاں جان کو آگئی ہیں۔ سارے زمانے سے انھوں نے ہی ناں جیسے۔“ وہ ہزار ہو کر بڑبڑانے لگے۔ ”سب سمجھتا ہوں میں کم بختو کا گھر میں دل نہیں لگتا۔ باہر جانے کی لگی رہتی ہے۔ کون کون ہوتا ہے اس لڑکی کے گھر میں؟“

اب تفتیش نیا رخ اختیار کر گئی تھی اور باہر دروازے سے لگی زرنگ کی آنکھوں میں بے بسی کا پانا بھرنے لگا۔ اف اللہ زندگی گزارنا بھی تو کس قدر دشوار ہے یہاں۔

”ظاہر ہے اس کے ماں باپ بہن بھائی ہوتے ہوں گے۔“ شائستہ شوہر کی حد درجہ شکی اور بدگمان فطرت سے عاجزی آگئی تھیں۔

”کس کے ساتھ جائے گی وہ؟“ بالآخر دو کد کے بعد سن ہی لی اس قہر کے دیوانے۔

”احمد ساتھ چلا جائے گا۔ یہ پچھلی گلی میں پہلا گھر ہی تو ہے۔“ شائستہ نے شکر کا سانس لیتے ہوئے جلت کہا۔

”کیا مطلب ہے؟ جوان لڑکی کو اکیلے بھیجوگی باہر گلی میں؟“ انہوں نے جلیلا کر بیوی کو گھورا۔ ”ساتھ جاؤ دونوں کے۔ اور ہاں حادث سے بھی کہو وہ بھی ہمراہ جائے گا اور ان کے گھر کے گیٹ پر کمر رہے گا۔“ انہوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

”پوری فوج ہی کیوں نہ لے جائیں۔“ صحن میں جھاڑو لگاتی گلناز نے دانت کچکا کر باپ کے کمرے کے کھلے دروازے سے آتی آواز پر رد عمل دکھاتے ہوئے زرنگ کو دیکھا تھا جو حسب عادت منہ جھکا کر دیوار بنی ساکت کھڑی تھی۔

حادث اس مسئلہ خیر ڈیوٹی پر سخت بھنایا تھا مگر باپ سے جرح کون کرتا۔



”شائستہ میری تو شروع سے یہی خواہش رہی تھی بھائی صاحب کے مزاج کے باوجود میرے دل میں تمنا تھی کہ گلناز کو اپنی بہو بناؤں گی مگر اب وقت اور حالات بدل گئے ہیں۔ تمہیں پتا ہے پچھلے چھ سالوں سے ہم لوگ امریکہ شفٹ کر گئے ہیں۔ امریکہ میں سٹیل ہے۔ شین بھی اپنے گھر کی ہو چکی۔ میرے بچوں کے مزاج اور عادات سے تو تم واقف ہی ہوگی۔ ہم نے انہیں صاف سترے شفاف پر اعتماد ماحول میں بڑی محبت اور شفقتوں سے پالا ہے۔ ان کی رائے کا بھرپور احترام کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ خدا نے اولاد کے کسی معاملے میں ہمیں مایوس نہیں کیا۔ امر سے پہلے میں نے شیخ صاحب سے بات کی تھی۔ انہوں نے صاف گوئی سے کہہ دیا کہ یہ رشتہ قطعی بے جوڑ ہوگا۔ ہمارے اور ابراہیم صاحب کے طرز تربیت میں بہت فرق ہے۔ انہوں نے جس طرح بچوں کی پرورش کی ہے اس ماحول میں پلنے والے بچے بذات خود نفسیاتی لحاظ سے بے حساب ذہنی الجھنوں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان میں اعتماد آگے بڑھنے کی صلاحیت اور زندگی گزارنے کے لیے مخصوص سماجی سرگرمیوں کا فقدان ہے بہر حال تم احمر

ہے پچھ لو۔ پھر میں نے احمر سے پوچھا کہ تم خالہ کے ہاں دو دن گزار کے آئے ہو۔ گلناز کے بارے میں کیا خیال ہے۔ احمر سنتے ہی ہنس پڑا۔ ممی جس ماحول میں وہ بچے رہتے ہیں وہاں ماسوائے اس کے وہ مانس اپنی مرضی سے اندر کھینچتے ہیں اور ان کے ہاں آزادی کا کوئی تصور ہی نہیں پایا جاتا۔ وہ لڑکی میرے ماتھے کیا چلے گی اگر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر آئینے میں ایک بار رو برو کر اپنی آنکھوں میں آنکھیں ال کر دیکھنے کی ہمت کر لے تو بڑی بات ہے۔ کہاں امریکہ کی تیز رفتار زندگی اور کہاں زمانہ جاہلیت کے گھر کا نقشہ پیش کرتا وہ ماحول۔ آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے۔“ میں معذرت خواہ ہوں شائستہ! مگر کیا دیکتا ہے۔“

یعنی تو اپنا موقف بیان کر کے معذرت کرتی ہوئی بیٹے کے ہمراہ واپس امریکہ لوٹ گئیں مگر ابراہیم صاحب کے گھر میں یہ واقعہ عظیم طوفان کا پیش خیمہ بن گیا۔

چند سال جوشتر خوابوں کی دنیا میں قدم رکھنے والا شہزادہ جب ان کے گھر آیا تو گلناز کے تخیل کی دنیا ب نئے گلاب کھلنے لگے تھے۔ وہ جذبہ جسے محسوس کر کے وہ پہلے پہل ٹھنک کر خود میں سمٹ جایا کرتی فی۔ اب بیکراں ہو کر جسم و جان کی پچھلی ہوئی طلب کی ہتھیلیوں میں سمٹ آیا تھا۔ پھر خبر ہوئی کہ اس لسلے میں شائستہ نے یعنی کو کہلوایا ہے اور باپ بھی خواہش مند ہے تو آرزوں کے گلزار مہک اٹھے جن کی دہوا سے مست کر گئی تھی۔ کتنے ہی تمناؤں کے چراغ لودینے لگے تھے۔

مگر پھر سب چراغ پھول اور خوشبوئیں ماند پڑ گئیں۔ ہر رنگ پھیکا پڑ گیا خود اس کی زندگی کی طرح۔ وہ گم صم رہنے لگی۔ راتیں آنسوؤں سے بھیگی رتیں اور صبحیں یاس آمیز خاموشی کی نذر ہونے لگیں۔ کچھ عرصہ بعد یہ خاموشی عجیب سی اضطراب آمیز دیوانگی میں ڈھلنے لگی۔

گلناز کے تیور اور لب و لہجہ تلخ اور جارحانہ ہوتا گیا۔ کبھی کبھی جنون کے عالم میں چیزیں توڑ دیتی۔ تب بے بات الجھ پڑتی۔ اور کبھی بیٹھ کے رونے لگتی۔

شائستہ کی جان پر بن آئی۔ شوہر سے بیٹی کے بگڑے تیور چھپانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرنے تے تھے، مگر کب تک۔

یہ طوفان آ کر رہا۔

”کیا بات ہے؟“ کیا آج تمہاری آنکھوں میں موتیا تر آیا تھا۔ جو دھیان سے سالن نہیں بنایا۔ نمک ناپوری شیشی الٹ دی ہے گویا۔“ پہلا نوالہ لیتے ہی ابراہیم صاحب کو جلال آ گیا تھا۔ وہ کھانے کی سہکھ کر واپس مزنی گلناز کو پکار کر کاکٹ دار لہجے میں بولے تھے۔

اس کی بے ہوشی طول پکڑ گئی تو لامحالہ حارث ڈاکٹر کو بلا لایا۔

اس نے عمومی چیک اپ کے بعد فوری طور پر کسی نیوروجن سے رابطہ کرنے کو کہا۔ تین چار دن تک وہ اسپتال میں رہی۔

پھر ہوش میں تو آ گئی مگر ان لوگوں کے لیے وہ بے ہوش ہی تھی۔ وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی دنیا کی تجلیاں اب اس کے دل و ذہن پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ ہر غم سے نجات مل گئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق انتہائی ہیجانی دباؤ کے باعث دماغ کی ایک شریان پھٹ جانے سے خون اندرونی حصے میں جم گیا تھا۔ جو ایریا متاثر ہوا تھا وہ براہ راست یادداشت اور حساس اعصابی نظام کو کنٹرول کرتا تھا۔

اب وہ آزاد تھی۔ ہر فکر و غم سے۔

وہ پاگل ہو چکی تھی۔

میں برس کی خوبصورت بھرپور دوشیرہ۔ جو دیوانی ہو کر لباس و حجاب سے بے پرواہ باہر نکل پڑتی تھی جسے اب واحد علاج کے طور پر کمرے میں بند رکھنا پڑتا تھا۔ اتنا تیز گھاؤ تھا کہ ابراہیم صاحب کی پر جلال جاہلانہ ہستی ڈول گئی۔ سارا مطلقہ نظریہ میں ڈھل گیا۔ گھریلو معاملات میں کنٹرول خود بخود ڈھیلا پڑ گیا۔ اب وہ زیادہ تر خاموش اپنے کمرے میں پڑے رہتے۔

ایسے میں حارث کو موقع مل گیا۔ ماں تو پہلے ہی رگ جاں بنا کر رکھتی تھی باپ کے کرتوتوں کے پھل نے جوان بہن کی زندگی برباد کر ڈالی۔ تو باپ سے تنفر اور بے زاری مزید بڑھ گئی۔ اب وہ ان کے کمرے میں بھی قدم نہیں رکھتا تھا۔ کبھی سامنا ہوتا تو منہ پھیر کے گزر جاتا۔

احمد اور ماہ گل تو پہلے ہی باپ کے ڈر سے سبے ایک کونے میں دیکے رہتے تھے۔ وہ کہاں پاس آتے تھے۔

بس ایک زرگل تھی جو کھانے کی ٹرے چائے یا پانی پہنچانے کا فریضہ سرانجام دینے کی غرض سے دن میں دو بار کمرے میں جھانک لیتی یا پھر غموں کی ماری شائستہ تھیں جو ان کی ایک پکار پر اب بھی وفا کی دیوبندی سر جھکائے آ جاتی تھیں۔

گھر میں قبرستان کا سانس ناٹا طاری رہتا تھا۔ جسے صرف گناہ کی دیوانہ وار بے ہنگم چیخیں کبھی کبھار توڑ ڈالتی تھیں۔ حارث نے تو جیسے گھر میں نکنا خود پر حرام کر لیا تھا۔

سارا دن گھر سے باہر رہتا۔ ایم۔ اے کے کر کے اس نے ایک اخبار میں ڈھائی ہزار روپے کی جاب کر لی۔ حالانکہ ابراہیم صاحب نے بہت واو پلا کیا مگر حارث اب تابعداری کی منزلوں سے آگے گزر

جواب میں گناہ نے عجیب غریب انداز میں بے باکی سے ان کی سرخ انگارہ نگاہوں میں دیکھا پھر قدرے تیز لہجے میں بولی۔

”خود بنالیا ہوتا۔“

”ہائیں۔“ ابراہیم صاحب تو ایک طرف خود شائستہ بھی اس کے حدود رجب گستاخانہ انداز پر ششدر گئیں۔

”بدتمیز بد لحاظ لڑکی۔ کیا بکواس کر رہی ہو؟“

ابراہیم صاحب پل بھر میں شعلہ بن کر بھڑکنے لگے۔ خطرناک تیوروں سے اس کی سست بڑھے تھے کہ اس نے کھانے کی ٹرے اٹھائی اور دوسرے لمبے ساری ٹرے ابراہیم صاحب پر الٹ دی۔

”گناہ! شائستہ کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ الٹی خیر۔ باپ بیٹی کے معرکے رشتے کا تقدس بچا لینا۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے مشتعل گناہ کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھیں۔ مگر اس میں ابراہیم صاحب اس تک پہنچ چکے تھے ان پر جیسے خون سوار تھا تراخ تراخ گناہ کے پھول رخساروں پر طمانچہ برسا دیئے۔

”خبردار جو مجھے ہاتھ لگا یا؟“

الاماں۔ وہ خوبصورت سی چمکیلی شاخ کی مانند لڑکی کسی غیر مرئی نادیدہ طاقت کے زیر اثر برق بن گئی تھی کمرے کی ایک ایک چیز اٹھا کر باپ پر اچھالنے لگی۔

پھر کہیں سے ماچس ہاتھ آ گئی۔ بیڈیٹ کو تیلی دکھا دی۔ شکر ہوا کہ حارث اور زرگل شائستہ کے اور باپ کی لٹکار سن کر اندر لپکے۔ حارث نے ابراہیم صاحب کے ساتھ مل کر جنون میں ہوش و حواس بے گانہ بنی گناہ کو بازوؤں میں جکڑ کر مزید اقدام سے باز رکھا۔

زرگل نے ہانپتے ہانپتے بیڈیٹ پر پانی کا جگ ڈال کر آگ بجھائی۔ تھوڑی سی تاخیر بھی جا رہی ہو سکتی تھی۔

”ہائے ظالم۔ سنگدل برباد کرو یا سب کچھ۔ وہ دیکھو جل رہا ہے سارا گھر۔ شعلے اٹھنے دو ناں۔ بجھاتے ہوا نہیں۔ جلنے دو۔ تم سب بھی جل جاؤ۔ مر جاؤ سارے کیا فائدہ زندہ رہنے کا۔ مجھے بھی ما

وہ دیکھو لوگ ہنس رہے ہیں۔ آگ پر پانی نہ ڈالو۔ لوگوں کو ڈالو اس میں۔“

اور پھر اسی طرح چیختے ہوئے وہ حارث کے توانا بازوؤں میں بے ہوش ہو گئی۔ جنون میں اپنے اور دوپٹے سے غافل ہو گئی تھی۔

چکا تھا وہ مقامی رپورٹر بن کر مطمئن تھا۔ باپ کی سرنش پر کان دھرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔  
ابراہیم صاحب ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔ ان کے اقتدار کا سورج ڈوب چکا تھا۔  
اور پھر ایک دن اسی طرح چپکے سے آنکھیں موند گئے۔ نا آسودہ۔ پشیمان، پریشان اور نامراد۔  
گھر میں ان کے جانشین کے طور پر گویا حادثہ گدی سنبھال چکا تھا۔



وہ پچھلی گلی میں اپنی کلاس فیلو رفعت سے ملنے گئی تھی احمد کے ہمراہ وہ بی اے کر چکی تھی اور اب کو  
جواب کے سلسلے میں رفعت سے بات کر کے آرہی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک رفاہی ادارے میں انتظار  
سنبھالنے کے لئے لڑکی کی پوسٹ آئی ہے اخبار میں۔ زرگل جلد از جلد کام سے لگنا چاہتی تھی گویا کہ  
نیوشنز وغیرہ تو وہ تین چار برسوں سے کر رہی رہی تھی۔

”کہاں سے آرہی ہو تم؟“ وہ سہ پہر چار بجے کے قریب سوچوں میں ڈوبی گھر پہنچی تو حادثہ نے  
ناگوار سے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے سختی سے پوچھا۔

”رفعت کے ہاں گئی تھی بھائی۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیتے ہوئے چادر اتاری۔

”بہت ضروری تھا جانا کیا؟“ وہ چپا کر بولا۔ تیور کڑے تھے۔

”ضروری تھا تو گئی تھی۔“ وہ کچھ برہمی سے اسے دیکھنے لگی۔

باپ کے بعد اب بھائی کسر پوری کر رہا تھا۔ سچ ہے باپ یہ پوتہ نسل پہ گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا  
تھوڑا۔

حالانکہ ایک زمانے تک وہ باپ کے عتاب کا نشانہ رہا تھا۔ اور اب جب خود با اختیار بنا تھا  
لا شعوری طور پر باپ کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ وہی جاہ و جلال اور شکی فطرت، ماہ گل کبھی چھت پر کھڑی نظر  
آ جاتی تو بلا جھجک تھپڑوں سے تو ضاع کر دیتا۔ زرگل کالج کے علاوہ گھر سے باہر جانے لگتی تو ہزار قدغن لگا  
تھا۔ وہی ترشی، وہی تندہ، یقین نہیں آتا تھا یہ وہی حادثہ ہے جو کہا کرتا تھا کہ۔

”دیکھنا جب میری باری آئے گی تو میں بہت خوشگوار ماحول دوں گا گھر والوں کو جہاں اپنی مرضی  
سے آنے جانے، اٹھے بیٹھنے کی آزادی ہو، ابوجی کی طرح سینٹرل جیل ہرگز نہیں بناؤں گا۔“

مگر وقت آنے پر اپنا زمانہ بھول بیٹھا تھا۔ خاص طور پر ماہ گل اور احمد کے ساتھ بالکل اسی طر  
سلوک کرتا تھا۔ جیسے ابراہیم صاحب گناہ کے اور اس کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ سب دعوے وقت کے  
دریا میں بہا دیئے تھے۔

وہی بات تھی کہ۔

وہ جن کو شکوہ تھا اوروں کے ظلم سہنے کا  
خود ان کا اپنا بھی انداز جارحانہ تھا

زرگل اس کے کڑے تیوروں سے کچھ زیادہ مرعوب نہیں ہوتی تھی۔ خصوصاً جب سے اس کے  
”بائے“ کھلے تھے۔

وہ اخبار میں کچھل رپورٹر تھا۔ نت نئی چٹخارے دار خبریں اور اسکیئنڈلز گھڑنا اس پر ختم تھا۔ کسی ”بڑی“  
بت کو رنگ رلیاں مناتے دیکھ لیا، اور خبر لگانے سے قبل اس کو آگاہ کر دیا۔ بس وارے کے نیارے  
باتے تھے۔ وہ شخصیت عزت بچانے کے لیے اس کا منہ بھر دیتی تھی نوٹوں سے۔ اسی طرح کسی سے  
ہلے کر کسی دوسرے کے خلاف خبر چھاپ کر دام کھرے کر لیتا تھا۔ وہ اسکیئنڈل ڈھونڈنے کے لیے  
مہنت کرتا تھا۔ ثبوت کے طور پر ساتھ ملوث شخصیات سے رابطہ کرتا تھا اس لیے من چاہا ”صلہ“ حاصل  
باتا تھا جہاں نت نئے اسکیئنڈلز جن میں سیاسی، سماجی اور فلمی اسکیئنڈلز بھی شامل ہوتے تھے۔ اس کے  
ارک مقبولیت میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہاں اخبار کے مالک کی نظروں میں اس کا مقام بڑا جا رہا تھا۔  
زرگل کچھ عرصہ قبل اس گورکھ دھندے سے آگاہ ہوئی تھی۔ اس نے ماں اور بھائی کے سامنے بہت  
یلا بچایا۔ بھائی کو لڑا، مگر وہ ڈھٹائی سے مکر گیا۔ الٹا اسے جھوٹا ٹھہرانے لگا۔ مگر وہ حقیقت جان چکی  
ما۔ اب حادثہ کے بھڑے میں نہیں آتی تھی۔ وہ اب اس سے پیسے بھی نہیں لیتی تھی جو وہ جیب خرچ  
طور پر اسے ہر ماہ دیا کرتا تھا۔

”یہ ناجائز کمائی ہے۔ میں اس میں حصہ دار نہیں بنوں گی، اور سن لیں۔ میں بی اے کے بعد جاب  
دوں گی۔“

شائستہ اور حادثہ نے آسمان سر پر اٹھالیا، مگر وہ پیچھے نہیں ہٹی۔ اور آج بھی اسی سلسلے میں رفعت  
مشتورے کے بعد حتمی فیصلہ کر کے اٹھی تھی۔ صبح وہ حادثہ کے جانے کے بعد ”امن گاہ“ نامی رفاہی  
اس کے ایڈریس پر پہنچ گئی۔ یہ بے سہارا معاشرے میں تنہا رہنے والی اور جاب کرنے والی لڑکیوں کا  
گن تھا۔ ماحول ہوش کی طرح تھا۔ ایک مشہور سماجی شخصیت بیگم سرفراز نے خواتین کی بہبود کے لیے یہ  
لاکھ لاکھ لاکھ۔ انتظام کلی طور پر ایڈمن انچارج مسز سبحانی کے ذمے تھا انہیں دیگر انتظامی امور کے لیے  
معاون لڑکی کی ضرورت تھی۔ ضروری معاملات طے کر کے اسے جاب پر رکھ لیا گیا۔



وہ بہت سکون اور اطمینان کے جذبات لیے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ قطع نظر اس بات کے کہ حار نے سن کر کیا طوفان مچانا تھا۔ اور ماں کے بگڑے تیور کیسے بحال کرنے تھے وہ طے کر چکی تھی کہ پیچھے نہ ہٹے گی۔

امی شاید سو رہی تھیں۔ ماہگل نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے کھانا کھا کر صحن میں بھاگنے لگے کا سوچ ہی رہی تھی کہ باہر تیل ہوئی۔

”حارٹ گھر پر ہوتا سے بلا دیجئے گا۔“ بظاہر بڑے مہذب اور بے نیاز انداز میں درخواست کی تھی۔ مگر درخواست گزار کا چہرہ دیکھ کر کاٹ دار نگاہ ڈال کر رہ گئی تھی۔

سانولی رنگت، سیاہ پرکشش آنکھوں اور مضبوط قد و قامت والا یہ لاپرواہ بنا کھڑا شخص اجلال احمد حارٹ کا ساتھی۔ دونوں ایک ہی اخبار میں کام کرتے تھے۔ حارٹ کے اخباری ساتھیوں اور یار دوستوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ خصوصاً ابراہیم صاحب کی وفات کے بعد وہ جیسے ساری پچھلی حسرتیں بھرتا تھا۔ جی بھر کے من مانی کرتا تھا۔ جب سے حارٹ کے کرتوتوں کا پتا چلا تھا وہ اس کے اخباری دوستوں سے بھی خدارکھانے لگی تھی۔ اور اجلال تو ویسے بھی اسے پسند نہیں رہا تھا۔ نظر باز اور بدتمیز سا۔ بات کم گھورتا زیادہ تھا۔ گو کہ اس کی نظروں میں سو قیامتیں نہیں ہوتا تھا، مگر جس طرح جو شیلے انداز میں جھمکتا۔ وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا دیتا تھا۔ اجلال سے چڑنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی حارٹ کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ تین چار سال سے دوستی تھی ان میں۔

”اگر وہ تشریف رکھتا تو میں آپ کو یہاں کھڑی نظر نہ آتی۔“ چھپاتے چھپاتے بھی لہجے کی تلخی؟ پڑی تھی۔

”اوہ۔“ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے ایک اچھتی نگاہ زرگل پر ڈالی۔ نظر میں کچھ ایسی ممتعت تھی۔ کہ وہ ہونٹ بھیج کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

چہرے پر ناگواری کی لالی جھلکنے لگی تھی۔ وہ مصر دباتے ہوئے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

”کب تک آجائے گا؟ کچھ بتا کر گیا ہے۔“ وہ کی رنگ ہاتھ میں جھماتا ہوا سنجیدگی اختیار کرتے پوچھنے لگا۔

”مجھ سے زیادہ آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ یار غار جو ظہر ہے۔“ وہ لفظ چبا چبا کر بولی۔ لہجے کی کاٹ تھی۔ ”وہ جس قسم کے کاموں میں مصروف رہتا ہے وہاں گھر سے باہر رات گزارنی پڑا۔ بھی اس کے لیے کیا مضائقہ۔“

”تم بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔ بی۔ اے کے بعد کیا ارادہ ہے تمہارا؟“ وہ اس کا استہزائیہ انداز نظر انداز کر کے نرمی سے دریافت کرنے لگا۔

”آپ نے مزید کوئی بات کہنی ہے تو بتائیے۔“ اس کے کہنے کا مقصد تھا کہ حارٹ کے نام کوئی پیغام دینا ہے تو دو دروازہ بند کرنے لگی ہوں۔ اس کے آنکھوں میں چمک بیدار ہو گئی۔

”کہنے کو کہہ گزروں، مگر کیا تم سننے کی تاب لا پاؤ گی؟“ وہ براہ راست اس کی پچھلی ہوئی خوبصورت آنکھوں میں دیکھتا ہوا متبسم لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔ اس کے انداز کی شرارت نے زرگل کو تپا کے رکھ دیا۔ ابھی کچھ کہنے کو تھی کہ پیچھے سے چھیل گھیننے کی آوازیں کر چکی۔ امی اس طرف آرہی تھیں۔

”کون ہے دروازے پر؟“ وہ دروازے کی طرف آئیں تو اجلال نے جھٹ سلام داغ دیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد وہ اپنی ناسانسی گاڑی میں روانہ ہو گیا۔ شائستہ جانتی تھیں اسے۔ وہ اکثر حارٹ سے ملنے آتا رہتا تھا۔

زرگل امی کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے صحن میں بوسیدہ سے تخت پر ان کے ہمراہ بیٹھ گئی۔ بالآخر بات شروع ہو گئی۔ کہ بہر حال کنارے تو لگنا ہی تھا معاملہ۔

امی بہت خفا ہو رہی تھیں۔ انہیں بیٹے کی ناراضگی کا خوف تھا۔

”اللہ کا واسطہ ہے زر۔ ماں کی حالت پر رحم کھاؤ۔ کیوں اس عمر میں کانٹوں پر رول رہی ہو۔ میری لیر لیر زندگی تیرے سامنے ہی تو رہی ہے۔ پہلے اپنے مرد کے مظالم سے۔ پھر جوان بیٹی کا غم۔ اور اب بیٹے کے تیور۔ کہاں تک امتحان لو گے میرے صبر کا تم لوگ۔ بخش دو اب مجھے۔ اور سہنے کی تاب نہیں رہی مجھ میں۔ جانتی تو ہوا چھی طرح حارٹ بھی باپ پہ گیا ہے۔ آپ سے باہر ہو جائے تو قیامتیں اٹھاتا ہے۔“ وہ بے چارگی اور آرزوگی کے طے جلے انداز میں شاکی لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔

زرگل نے ایک بے بس ترحم آمیز نگاہ ماں پر ڈالی۔

”امی۔۔!“ اس نے آہستگی سے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا اور درد مندی سے بولی۔

”خدا گواہ ہے۔ یقین کیجئے میں اپنی ذاتی غرض و غایت یا ضرورت کے لیے یہ قدم نہیں اٹھا رہی۔ یہ سب کچھ کرنے کی وجہ ہماری اجتماعی بہتری ہے امی! آپ ایک لمحے کو امیتا کے جذبات پس پشت ڈال کر ایک منصف کی نگاہ سے حارٹ بھی کی مصروفیات کا جائزہ لیں۔ سچ بتائیں کیا آپ کے ذہن میں یہ سوال کبھی نہیں ابھرا کہ ایک معمولی سا مقامی رپورٹر ہونے کے باوجود وہ اتنے ٹھانڈے ہاتھ سے کیسے رہ لیتا ہے۔ پانچ پانچ ہزار کا ایک سوٹ خریدا ہے۔ ہوٹل کا موٹر سائیکل ابھی پچھلے سال اس نے خریدا ہے۔“

زرگل جیسے ہر شے سے بے پرواہ ہو کر اپنی دھن میں مگن رہتی تھی۔

□

اخبار کے ہال میں ایک سنانا سا چھایا ہوا تھا۔ آدی تو بہت نئے مگر سب کے سب کاموں میں مصروف تھے۔ ایک کونے میں پیسٹنگ ٹیبل پر کاپی پیسٹرز قینچیاں گم اسٹک اور بٹر پیپر زکھڑکاتے مسٹر پر بٹر پیپر پھیلا رہے تھے۔ ادارتی اور تفریحی صفحات کی پیسٹنگ سرشام ہی شروع کر دی جاتی تھی۔ کہ دوسرے شہروں میں ڈاک بھیجنا ہوتی تھی۔ سات بجے تک ڈاک کا کام پٹا کر لوکل پیپر کی تیاری شروع ہوتی تھی۔ پیسٹنگ ٹیبل سے ذرا فاصلے پر بیضوی ترتیب میں لکڑی کے جزاؤں ٹیبل لگے ہوئے تھے جہاں صفحات کے انچارج کمپیوٹر روم سے آنے والے بیانات اور سرخیاں پروف ریڈرز سے چیک کروانے کے بعد خود ایک بار دیکھ کر فائنل نر کر کے کاپی پیسٹر کے حوالے کر رہے تھے۔ اسی جگہ اکا دکا رپورٹر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ معارف پشمن سے فون کال ہال میں پاس کی گئی۔ اجلال فون کے قریب تھا اس نے ریسیور اٹھایا اور پھر میسج سن کو حارث کو بلایا۔ حارث کیمرہ سیکشن میں کیمرہ مین کو تصویریں دیتے ہوئے مطلوبہ سائز نوٹ کروا رہا تھا۔ مصروف سے انداز میں اسی طرح تصویریں ہاتھ میں پکڑے فون تک آیا تھا۔

”چیف سیکریٹری رؤف علی بات کریں گے۔“ دوسری طرف سے پی۔ اے کی مودبانہ آواز سنائی دی۔

”رؤف علی۔ اوہ۔“ حارث کے ہونٹوں پر ابھر آنے والی مسکراہٹ آنکھوں تک پہنچ گئی۔ وہ محتاط سا ہو گیا۔ ایک نظر ہاتھ میں پکڑی تصویر پر ڈالی۔ رؤف علی کے ساتھ شہر کی مشہور ماڈل گرل ناظمہ نہایت نازیبا حالت میں تھی۔ یہ سین کسی گیسٹ ہاؤس کا تھا۔

تین دن سے حارث اس چیف سیکریٹری کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ تب ”گوہر مقصود“ ہاتھ میں آیا تھا۔ ”مسٹر حارث! میں رؤف علی بات کر رہا ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد ایرپیس پر ایک سرد جھنجھلائی ہوئی کوفت زدہ آواز ابھری، انداز میں حکم نمایاں تھا۔ مگر چھپاتے چھپاتے بھی پس پردہ پریشانی اور دھڑکا حارث کی زیرک حیات سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

وہ بڑے فرخت انگیز انداز میں مسکرایا۔

”جی سر! حکم کیجئے، بندہ کو کیسے یاد فرمایا۔“ اس نے سادہ و معصوم انداز میں سوال کیا۔

”کبواس بند کرو۔“ وہ بے انداز میں غرایا تھا۔

حارث اس کی غراہٹ کے پس پردہ ہلکورے لیتے ہوئے خدشات سے بہت حظ اٹھا رہا تھا۔ ایسے

کھانے پینے رہنے کے لیے عمدہ اور قیمتی اشیاء کا استعمال۔ ایک ایک ہزار کے پرفیوم استعمال کرتا ہے چال ڈھال سے کسی گبڑے ہوئے رئیس کا ساتھ دیتا ہے۔ والٹ میں ہزار ہزار کے نوٹ یوں بھرے رہتے ہیں جیسے وہ محض کاغذ کے معمولی سے ٹکڑے ہوں یہ سب کہاں سے آتا ہے۔ مقامی رپورٹر کی تنخواہ حد سے تین ہزار ہوتی ہے، چلو سینئر ہو جانے کی وجہ سے ایک ڈیڑھ ہزار مزید بڑھ گئی ہوگی، ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا سوچا جاسکتا ہے۔ پھر یہ شان و شوکت یہ عیش۔ آخر اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے اور کیسے کماتا ہے۔“

ای ایک لمحے کو چپ سی رہ گئیں یہ بات تو ممتاز کے دوسوں میں نمایاں ہو کر تیرتی رہتی تھی۔

”ای! اگر حارث بھی اس روش پر نہ چل رہے ہوتے تو آپ کے سر کی قسم! میں روکھی سوکھی کھا لیتی! مگر قدم گھر سے باہر نکالنے کا نہ سوچتی کہ مجھے شروع سے ہی صبر و ضبط سے بری بھلی برداشت کر لینے کی عادت رہی ہے، مگر حارث بھی اس کی کمائی ناجائز ہے، کھلی بلیک میلنگ ہے، جس کا پیسہ ہم استعمال کرتے ہیں۔ ایسے میں کوئی تو ہو جو ڈولٹی شسٹی کو سہارا دے سکے۔ گھنا ز آپی کا حال آپ کے سامنے ہے۔ ماہ گل اور احمد بہت چھوٹے ہیں ایسے میں اور کون ہے جو حالات کو سنبھالا دے سکے۔ صرف یہ سوچ کر قدم گھر سے نکالے تھے میں نے۔ امی پلیز! مجھے اپنی رضامندی کی مضبوطی عطا کریں۔ میں ہر محاذ پر لڑوں گی۔“

”حارث کو کیسے سمجھاؤں گی میں۔“ وہ کچھ کچھ قائل ہو کر ہارے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔

زرگل کے اندر اطمینان پھیلنے لگا۔ ان کا ہاتھ دبا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نظر انداز کر دیں امی! سن کے خاموش رہیں۔ مجھے بھی یہی پالیسی اپنانا ہوگی۔ اسے مالک و مختار بن کر احساس نہیں، تو ہم تو شعور رکھتے ہیں۔ بس آپ اپنا دل صاف کر لیں اور کل مجھے اپنی دعاؤں کے ہمراہ رخصت کیجئے گا۔ جا ب کا پہلا دن ہے کل۔“

حارث نے بہت ہلچل مچایا تھا۔ چیخ چلا کر اپنی برہمی کا اظہار کیا، مگر زرگل کان لپیٹے ڈھٹائی سے سنتی رہی۔ دو چار دن بعد بالآخر حارث کو بادل خواستہ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ کہ وہ ماہ گل، احمد یا ماں کی طرح زرگل کو ایک جارحانہ نظر سے چپ نہیں کروا سکتا تھا۔ خوف زدہ نہیں کر سکتا تھا۔

حالانکہ زرگل شروع سے بہت صابر، کم گوار اور بے ضرر لڑکی رہی تھی، مگر تعلیم کے بخشنے ہوئے اعتماد اور ذہانت کے آگے حارث بے بس رہ گیا تھا۔ تاہم اب زرگل اس کی چشم عنایت سے محروم ہو چکی تھی۔ اول تو مخاطب ہی نہ کرتا اور جو کرنے پر مجبور ہو جاتا تو بھی انتہائی تحقیر و خنجر سے لبریز انداز میں شعلے برساتے انداز میں بات کرتا۔

مواقع پر وہ ہمیشہ بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔

حارث کی اذیت پسند طبیعت کھل کھل جاتی تھی۔

”تم نے وہ ثبوت کہاں سے حاصل کیے ہیں؟“ وہ دانت پیس کر پوچھ رہا تھا، لہجہ مدہم تھا کہ ایسے مواقع پر رازداری برتنے کے لیے یہی حکمت عملی اپنانی پڑتی ہے۔

”سر! آپ کی خوشبو کی کشش لے گئی ہمیں بھی کھینچ کر۔“ حارث نے اتنے گرم جوش انداز میں محبت سے کہا جیسے مرید بننے میں بس ذرا سی کسر تو رہ گئی تھی۔

اس کا دل اونچے اونچے قہقہے لگانے کو پھل رہا تھا۔ چیف سیکریٹری کی نگاہ میں یقیناً کل کے اخبارات میں لگنے والی تباہ کن سرخیاں اور ہوشربا تصاویر گھوم رہی ہوں گی۔ چیف سیکریٹری کے ادھ مواہونے کے خیال سے وہ غمور ہوا جا رہا تھا۔

اصل میں اس نے چیف سیکریٹری ہی کے لیول کا ایک اور بندہ بھانسا تھا۔ پچھلے ہفتے ”حسب معمول ثبوت حاصل کر کے ان تصاویر کی ایک کاپی اس بندے کو ارسال کی جس نے تصاویر دیکھتے ہی حسب توقع اخبار میں فون کھڑکا دیا۔ ہوتا تو یہی تھا کہ حارث اس بندے سے ڈیل کر کے اپنی ڈیمانڈ بتاتا تھا۔ اور مطلوبہ رقم حاصل کرنے کے بعد تصاویر ضائع کر دیا کرتا تھا۔ مگر اس بندے کے ساتھ معاملہ مختلف ہو گیا۔ وہ شخص چیف سیکریٹری رؤف علی کے بہت خلاف تھا اس نے چال چلنے کے لیے حارث کو بھی ساتھ ملا لیا۔

”تم صرف پچاس ہزار طلب کرتے ہو۔ میں تمہیں اس سے دگنی رقم دے سکتا ہوں، مگر کام تمہیں اس کے الٹ کرنا ہوگا، یعنی یہ رقم اسکیڈنل نہ چھاپنے پر نہیں بلکہ اسکیڈنل چھاپنے پر ملے گی۔“ اس شخص کی پیش کش پر حارث ایک لمحے کو متذبذب ہو گیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بات کی وضاحت کرنے کو کہا۔

پھر اس نے بتایا تھا کہ چیف سیکریٹری کی بھی ناظمہ سے بہت دوستی ہے۔ ”تم اس کی ناظمہ کے ساتھ تصویر اور اسکیڈنل چھاپ دو تو منہ مانگا انعام دوں گا۔ تم جانتے ہو میرا ذاتی شوروم ہے۔ تم چاہو تو سوزو کی کار اپنی پسند کی لے سکتے ہو اس کام کے عوض میں اس حد تک بھی پیش کش کر سکتا ہوں۔“

اور حارث کو تو جیسے بیٹھے بٹھائے قارون کا خزانہ مل گیا تھا۔ وہ تو ویسے بھی بڑے عرصے سے گاڑی خریدنے کے چکروں میں تھا۔ لالچ نے آنکھوں پر پنی باندھ دی تھی۔ اور یہ کام وہ کر گزرا تھا۔ اس کے لیے دو تین دن گھر سے باہر ہونا پڑا تھا۔ کل کے اخبار میں رؤف علی کا سارا کچا چٹھا کھل جانا تھا۔ اسی لیے وہ حارث پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ حارث کی آنکھوں میں نئی گور گاڑی لشکارے مار رہی تھی۔ کل وہ اس کی ملکیت ہوگی۔

چیف سیکریٹری نے بہتری آفرز کیں، مگر اس نے پائے جنبش سے ٹھکرا دیں۔ بھلا وہ اسے کیا دے سکتا تھا؟ زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس ہزار۔

اگلے روز بڑے اہتمام سے اسکیڈنل شائع ہوا۔ چیف سیکریٹری کی شامت آگئی۔ وہ معطل کر دیا گیا تھا۔ ”مسٹر حارث! یاد رکھنا میں انتقام لوں گا۔ تم نے اپنی سی کر لی۔ اپنا ڈار کر گزرے ہو۔ اب میرا وار برداشت کر کے دکھانا پھر میں مردمانوں گا۔“ اگلی شام کورؤف نے حارث کو فون کیا تھا۔

”اوہو۔ ہوسرجی! اتنا غصہ کیوں کرتے ہیں۔“ وہ بڑے چڑانے والے انداز میں محظوظ ہوتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”تم انتظار کرو مسٹر حارث!“ غراتے ہوئے وحشیانہ اسرار لہجے میں کہہ کر فون شیخ دیا گیا تھا۔

”آئے۔ ہائے۔ بے چارہ۔“ حارث نے ٹانگیں لمبی کر کے پھیلاتے ہوئے بے چارگی سے سر ہلایا اور پھر ایک دم ہنس پڑا۔ تصور میں رؤف علی کا تلملانا چٹکھانا غضب ناک چہرہ گھوم رہا تھا۔ حضرت اپنی ہی بوئیاں نوچ رہے ہوں گے۔

”کاش میں یہ نظارہ دیکھ سکتا۔“ وہ پھر ہنسا تھا۔



انقلاب وہیں آتا ہے جہاں بنیاد کمزور ہوتی ہے، وہ درخت سب سے پہلے جڑ سے اکھڑتا ہے جس کی بنیادیں کمزور رہی ہوں۔

انقلاب بات زمانہ۔ مثلاً ماحول، حالات، شخصیات اور طرز عمل کی تبدیلی کی شدتیں۔ سب سے زیادہ کمزور دل گردے والے بندے پر اثر انداز ہوتی ہیں مضبوط اعصاب والے بہر حال سہہ لیتے ہیں۔ سو فطری امر ہے جو بنیادیں دھل جائے کمزور پڑ جائے۔ اس پر مکان تعمیر کرنا ریت کا گھر وندہ بنانے کے مترادف ہوا کرتا ہے کیونکہ۔

گلناز بہت کمزور اعصاب کی مالک تھی بہت جلدی تھک بھی گئی۔ حوصلہ چھوڑ کر سستانے کے لیے بے خبری کی سرسنت و سرشار ادویوں کی مکین بن بیٹھی۔ انہیں تنہا اور خالی کر کے۔

زرگل کے اعصاب کی پختگی اور اس کا سیلف کنٹرول اس کی راہ میں حائل ہو گیا تھا جیسے۔ وہ تو بس اپنے ہی دائرے میں گم رہنے والی لڑکی تھی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے لیے سوچتی تھی۔ ہمیشہ اپنی ذات کی نفی کر کے سوچ کے دھارے اپنے فرائض کی سمت موڑ دیا کرتی تھی۔

بظاہر کسی تاریخی قلعے کی طرح ویران، خاموش اور ساکن نظر آنے والی زرگل کے اندر ایک حساس دل

آباد تھا۔ جو وہ وقت سے پہلے ہی مچھور ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ وہی صورت حال تھی کہ  
بچپن اس طرح گزرا کہ کھلونے نہ ملے  
اور جوانی میں بڑھاپے سے ملاقات ہوئی

اس نے جب ”امن گاہ“ میں قدم رکھا تو شروع شروع میں بہت سے لوگوں نے اس کے چہرے  
پر رقم سادگی سکوت اور جاذوبیت کو بھولپن اور معصومیت جان کر فائدہ اٹھانے کے لیے ہمدردی اور تعاون و  
تسلیم کے جال پھینکے تھے۔ میڈم سبحانی کا دست راست انعام علی تو اب تک اس ”کیس“ پر لگا ہوا تھا  
منہا پانے کے لیے۔ اس کے علاوہ ہوسٹل میں قیام پذیر ملازمت پیشہ لڑکیوں کے ملنے جلنے والوں  
چاہنے والوں اور ملاقاتیوں میں سے بھی کچھ نے کوشش کی تھی۔ مگر وہ رد عمل کے طور پر چپ کا اسرار میں  
لپٹا مجسمہ بنی اپنے کام میں مگن رہتی تھی۔

مگر ایک شخص ایسا تھا جس کے لیے ہتھیار ڈالنا اس کی غیرت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ بدستور لگا ہوا تھا۔  
اس مہم پر مکمل یقین اور زعم کے ساتھ۔

اس کا اکثر ”امن گاہ“ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میڈم سبحانی سے خاصی دوستی تھی۔ شروع شروع میں  
زرگل کو یہاں دیکھ کر یکدم ٹھنک سا گیا تھا۔ بلکہ قدرے ناخوشگوار اور فکر مند انداز میں اس کی ملازمت  
پر خیال آرائی کی تھی۔

”بھلا تمہیں جاب کرنے کی کیا ضرورت تھی حارث کیسے مان گیا۔ کیا اس کو پتا ہے۔“

”یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔“ وہ آرام سے اس کے استفسار کا جواب گویا بی گئی تھی۔ وہ بھی سر جھٹک کر  
چل دیا۔ کسی بات کے لیے وہ اس پر دباؤ نہیں ڈالتا تھا۔ وہ کتنی ہی تلخی اور کڑھکی سے بات کرتی ’اجلال کا  
انداز پر سکون اور متبسم رہتا تھا جیسے لطف لے رہا ہو۔

اس دن بھی جانے کہاں سے۔ خوار ہوتا ”امن گاہ“ کے استقبال پر نمودار ہوا تھا۔

”میز بانو! ہوشیار ہو جاؤ۔“ بٹاش آواز اور ٹیبل پر انگلیوں کی دستک نے بے طرح کسی سوچ میں  
ڈوبی زرگل کو چونکا دیا۔ وہ نشست بدلتے ہوئے سیدھی ہو گئی۔ اور ایک اچھتی نگاہ اس پر ڈال کر خوشخواد  
سامنے پڑے رجسٹر پر جھٹک گئی۔

”کتنی آرام دہ جاب ہے۔ پتا نہیں یہ ”سماجی“ لوگوں کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آ جاتا ہے جو ایسے  
ادارے کھول کو مفت ملازم انورڈ کر لیتے ہیں۔“ وہ مقابل کے مزاج اور برداشت سے قطع نظر دو ٹوک

خیال آرائی کرنے کا شائق تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ زرگل کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں بننے کا عمل شروع ہو چکا ہے مگر وہ بدستور چپ  
تھی اور اس کی یہی چپ تو اجلال کو بے رحمی سے گفتگو کرنے پر اکساتی تھی۔ ایک قفل تھا جو نو فتاسی نہ تھا۔

”احتساب کا عمل اس معاشرے پر لاگو کیا جاسکتا تو سب سے پہلے آپ جیسے پر گرفت نہ ہوتی کیا؟  
ایک کلرک کے گریڈ کی تنخواہ پانے والے معمولی رپورٹر نے ماڈل کی قیمتی گاڑی میں گھومتے ہیں۔ فانیو  
اشارز ہوٹلوں میں ڈنر کرتے ہیں۔ امپورٹڈ جوتے اور کپڑے استعمال کرتے ہیں ان سے پوچھنے والے  
کہاں سوئے ہوئے ہیں؟“

وہ اپنی تلخی چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکی تو آہستگی سے کہہ بیٹھی۔ جواب میں اجلال کے ہونٹوں پر  
معنی خیز مسکراہٹ ابھری اس نے اپنا وزن ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے ایک  
بھر پور نگاہ اس کے تپے ہوئے چہرے پر ڈالی تھی۔

”ضروری تو نہیں اس فیلڈ میں آنے والے سبھی لوگ جدی پشتی فقیرانہ حالت میں رہے ہوں۔ یہ  
گاڑی جو تے کپڑے اور آن بان مورٹی اور خاندانی بھی تو ہو سکتی ہے۔ ویسے ”تجربہ“ برا نہیں لگا۔ اس  
میں مزید جان پڑ جاتی۔ اگر تجرباتی نگاہ گردن سے تھوڑا اوپر چہرے پر اور آنکھوں کے رنگوں پر بھی کچھ  
لمحے غور فرمائی۔ کچھ علامتی افسانے ان میں رقم تھے۔ انہیں بھی پڑھ لیا ہوتا۔“ بات کرنے کا انداز تو ہلکا  
پھلکا ہی تھا مگر نگاہ اور لہجہ کا اتار چڑھاؤ کچھ ایسی بے باکانہ حدت لیے ہوئے تھا کہ وہ کٹ کر رہ گئی۔ خود  
کو جواباً کچھ بولنے سے لاچار محسوس کرنے لگی۔

اجلال اس کے گالوں پر اترتی آتشیں حرارت کو محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ حیا بار ہوتی تھی تو اس کے  
چہرے پر انوکھے ہی نظارے دیکھنے کو ملتے تھے۔ پلکیں تیز تیز چھپکاتی اٹھاتی گراتی ہونٹوں کے کونے  
چبائی ہو کھلاہٹ میں کان کے پاس کی لٹ کو خوشخواد پیچھے اڑتی اور دھڑکھٹتی نگاہ بچاتی ہوئی وہ دیکھنے  
کی چیز گنتی تھی۔

”آپ کچھ اور کہنا ہے؟“ وہ ناگواری دبا کر ایک دم خشک لہجے میں بولی۔

”کیا تم سننے کی تاب لاؤ گی؟“ اس کے جان چھڑانے والے سپاٹ انداز پر اجلال کو سابقہ ملاقات  
یاد آ گئی۔ وہ حسب سابق اسی نگاہ اور لہجے میں جواب دیتے ہوئے گویا تنگ کرنے کی انتہائی حد کو چھو  
گیا۔

زرگل نے ایک برہم نگاہ اس پر ڈال کر کچھ کہنا جا پھر سر جھٹک کر رجسٹر آگے کر لیا گویا مکمل طور پر اس



اس کا نام ختم ہو گیا تھا۔ دیر ہو جاتی تو۔ خواخواہ حارث کا پارہ چڑھنے لگتا تھا۔ کہتا کچھ نہیں تھا اس کو۔ بس چیزوں کی شامت آ جاتی یا خواخواہ ای ماہ گل اور احمد پر برس پڑتا۔  
 ”حق تو پھر بھی تسلیم کرتے ہیں لوگ۔“ وہ درز دیدہ نگاہ ڈال کر معنی خیزی سے بولا اور اس کے ساتھ ہی باہر چلا گیا۔

”کاغذی ثبوت تو نہیں دکھا سکتا البتہ حلف اٹھا سکتا ہوں تمہاری تسلی کے لیے یہ گاڑی ”صحافی کمائی سے نہیں والد صاحب کی کمائی سے خریدی گئی ہے۔ پیٹرول البتہ اپنی جیب سے ڈالتا ہوں مگر اتنا تو معاف ہو سکتا ہے ناں۔“ آؤ تمہیں گھر چھوڑ دو۔“  
 ٹھنڈے سایہ دار درخت کے نیچے کھڑی اپنی چمکتی دکتی نسان سنی کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ قریب سے گزر کر فٹ پاتھ پر قدم رکھتی زرگل سے مخاطب ہوا تھا۔

”شکریہ۔“ اس نے کچھ توجہ نہ کی۔ بے تاثر لہجے میں جواب دے کر آگے بڑھ گئی۔ اجلال نے کچھ لمحے کو جاتی زرگل کی پشت پر نظر جما کر کچھ سوچا پھر سر جھٹک کر گاری اشارت کرنے لگا۔  
 زرگل کو خوش قسمتی سے جلد ہی دیگر اسٹاپ سے گاڑی مل گئی۔ گھر کے پاس ہی اسٹاپ پر اتری تو شام ڈھل رہی تھی۔

”زراؤ۔ وہاں ناز۔“ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی۔ پچھائیں کھاتی شائستہ بیگم کی ردی حالت دیکھ کر اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔  
 ”کیا ہوا آپ کی کو؟“ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ دل کسی اندیشے تلے دبا دھک دھک کرنے لگا تھا۔

”اُمی! کون سی آزمائش ٹوٹی ہے اب کے۔“  
 مٹی کا نرم گرم مہینہ تھا۔ دو پہریں سنسان ہونے لگی تھیں۔ لوگ دو پہر کو لمبی تان کے سوتے تھے کہ اب دن ڈھلنے میں بہت وقت لگتا تھا۔ شائستہ کی بھی آنکھ لگ گئی۔ گلنازا اپنے دھیان میں باہر کے دروازے کے سامنے بنی سینٹ کی سیرجی پر آن بیٹھی تھی۔  
 ”میبی ہے ناں حارث کا گھر۔ اور یہ لڑکی بھی غالباً اسی گھر کی لگتی ہے۔“ رؤف علی گاڑی میں اپنے ہمراہ نامی گرامی غنڈوں کو بھی لایا تھا۔

”ہاں استاد! لگتا تو میبی ہے۔ شاید بہن یا بیوی ہوگی۔“  
 پچیس چھیس سال کی بھرپور لڑکی گلنازا لان کے کپڑوں میں دوپٹے سے قطعی بے نیاز اپنے لمبے لمبے

کی موجودگی کی نفی کرنا چاہی تھی۔  
 ”جب گھر سے باہر نکل کر میدان عمل میں کودتے ہیں تو جذبات کے اتار چڑھاؤ کو بھی گھر بھول آیا کرتے ہیں۔  
 یہ زندگی ہے اور مسئلے مسائل اس کا جزو لا ینفک ہیں۔ ان پر پریشان ہونا یا پریشان کرنا کسی طرح بھی ان سے نجات نہیں دلا سکتا۔“  
 ”میں یہ سبق بہت پہلے پڑھ چکی ہوں۔ بہتر ہوگا آپ خود پر ان کو لاگو کر کے دیکھیے۔ خاص طور پر اپنی رومینٹک نیچر پر۔“ اس کی سنجیدگی نے زرگل کو ایک لمحے کو متحیر کر دیا تھا پھر وہ بگڑ کر بول اٹھی۔  
 وہ جواب میں بے اختیار مسکرایا۔  
 ”تم نے یہ بات کہہ کر دوبارہ اپنی جذباتیت کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔“

”رومینٹک ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا تم مجھے اس اصطلاح کا مطلب سمجھا سکتی ہو؟“ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا پھر اس کے نظر چرانے پر خود ہی جواب میں شروع ہو گیا۔  
 ”رومانیت سے مراد ہے حس لطیف کے عمل کو کس شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ رومان پسندی دراصل آپ کی ذات کی حسایت کو ظاہر کرتی ہے کہ آپ فطری رویوں سے کس طرح انسپاز ہوتے ہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی حد تک رومانک ہوتا ہے حسن فطرت کے دلکش سرسبز نظارے سب کی نظر کو بھاتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے پھول سے بچے کے برے لگتے ہیں۔ خوبصورتی سے سجایا خوشگوار ماحول کس کو اچھا نہیں لگتا۔ یہ فطری حسایت چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں اور رویوں کو محسوس کرنے سے پتا چلتی ہے۔ کیا آپ کے پر خلوص دوست کا محبت بھرا ایک جملہ ایک مسکراہٹ ایک چھوٹا سا تحفہ آپ کے دل میں روشنی نہیں بھر دیتا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر سمجھ لیجئے وہ شخص پیدا کنی طور پر ”دل“ سے محروم رہا ہوگا۔

اگر احساس کی لطیف شدتیں رومینٹک ہونے کے الزام سے منسلک ہیں تو ہاں میں رومینٹک ہوں۔“  
 اس نے اس کی بے پروائی سے استعمال کی گئی رومینٹک کی اصطلاح پر اتنا لبا چوڑا وضاحتی بیان داغا کہ فی الواقع زرگل کہہ کر اب پچھتا رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ موصوف اس ضمن میں مقالہ پیش کر دیں گے ورنہ احتیاط کرتی۔

”معاف کر دیجئے بھول گئی تھی کہ اخبار والے خود کو برحق ثابت کرنے کے لیے پاتال کھال ڈالنے میں۔“  
 وہ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جان چھڑانے والے انداز میں کہہ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ پانچ بجنے کو تھے۔

ریشمی بالوں کو پھیلائے مگن ہی ان سے کھیل رہی تھی ہونٹوں پر ریشمی مسکراہٹ تھی۔

یہ لڑکی حارث کے گھر کی تھی۔ رؤف علی کچھ دیر موٹھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچوں کے تانے بانے بناتا رہا پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ دو آدمی اترے۔ انہوں نے گلناز کو بازو سے پکڑا اور جیب کی طرف لے آئے۔

وہ معصوم کیا جانتی تھی اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ہنستی ہوئے بلاچون و چرا گاڑی میں بیٹھ گئی۔ رؤف علی غنڈوں کو حارث کے گھر لوٹ مار کروانے کے لیے لایا تھا مگر گلناز کو دیکھ کر ارادہ بدل دیا۔ جو چیز وہ اس کے گھر سے لوٹ کر لے جا رہا تھا وہ روپے پیسے اور زیورات سے کہیں زیادہ قیمتی تھی۔ اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ انتقام لینے کے لیے۔

گاڑی ایک دھچکے سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اس کا رخ گیسٹ ہاؤس کی طرف تھا۔ جہاں وہ کمرابک کروا چکا تھا۔



حارث کو اطلاع مل گئی تھی۔ آج وہ سابق چیف سیکریٹری صاحب دوبارہ ”موج میلہ“ کرنے کے لیے کمرابک کروا چکے ہیں۔ حارث پہلے سے موجود تھا۔ آج وہ جی بھر کے رؤف علی کو زچ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ریسیپشنسٹ کو کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی عالی حضرات اپنی مہمان کے ہمراہ کمرے کی طرف جائیں مجھے بتا دینا آج وہ کمرابند ہونے سے پہلے ہی رؤف علی کے روبرو ہو کر اس کو سلگتا چیختا منہ چھپاتا دیکھا چاہتا تھا۔ وہ نظر بچا کر گیسٹ ہاؤس کے پچھلے اسٹور میں چا چھپا تھا۔

کچھ دیر بعد لڑکے نے اسٹور کے دروازہ آہستگی سے بجا کر جائے وقوعہ پر پہنچنے کا اشارہ دیا۔ وہ بے دھڑک نکلا اور لڑکے کے بتائے ہوئے کمرے کا دھاڑ سے دروازہ کھول دیا۔

بید کی طرف بڑھتے ہوئے رؤف علی کو دیکھ کر جیسے اس کی رگ سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ ”رؤف علی“ ایک وحشیانہ غراہٹ اور غضبناک چنگھاڑ کے ساتھ وہ اس کی طرف لپکا۔ رؤف علی نے صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے پھرتی سے ریواور نکال لیا مگر حارث اس سے کہیں زیادہ چونکا نکلا۔ اس نے گلناز پر پہلی نگاہ پڑتے ہی اپنا اعشاریہ بیس بور کا پستول نکال لیا تھا۔ رؤف علی کو مہلت ہی نہ مل سکی۔

ٹھائیں ٹھائیں ٹھائیں

تین گولیاں شعلوں کی طرح رؤف علی کے وجود کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر گئی تھیں۔ آواز نہ صرف

ہاؤس بلکہ اس کے ارد گرد کے رہائشی مکانات میں بھی گونجی تھی۔ ایک افراتفری سی مچ گئی۔ حارث رکنا نہیں تھا۔ برق کی سی تیزی سے گلناز کو کندھے پر لاد کر کے باہر گاڑی میں ڈالا۔ اور آندھی فان کی طرح اپنی ایف ایکس اڑاتا گھر پہنچا۔ گلناز کو گیسٹ سے اندر ڈھکیں کر اسی اندھا دھند انداز میں ڈی بھگا تا وہ بڑھتا چلا گیا تھا۔

اس نے چھپنے کی کافی کوشش کی۔ مگر دو روز بعد پولیس اس تک پہنچ ہی گئی۔ گواہوں کی کمی نہ تھی۔ یعنی بدین تھے۔ پھر آلہ قتل کی موجودگی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ۔ سیدھا سادہ واضح قتل کا کیس تھا۔ وہ رفتار ہو گیا۔ اخبار بھی اس ضمن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ اس خبر کی تصدیق کے اگلے روز چیف ایڈیٹر اہدایت پر اخبار میں یہ خبر لگا دی گئی تھی کہ حارث ابراہیم کا اس اخبار سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ یہ جاب دڑ چکے ہیں لہذا وہ ادارے کے ملازم نہیں ہیں۔ اخبار کی ریپوٹیشن کا مسئلہ تھا اس لیے چیف ایڈیٹر نے ملت علی اپنائی تھی۔



بے زمین لوگوں کو  
بے قرار آنکھوں کو  
بد نصیب قدموں کو  
جس طرف بھی لے جائیں  
راستوں کی مرضی ہے  
بے نشان جزیروں پر  
بدگمان شہروں میں  
بے زباں مسافروں کو  
جس طرف بھی بھڑکادیں  
راستوں کی مرضی ہے  
روک لیں یا بڑھنے دیں  
تھام لیں یا گرنے دیں  
وصل کی لکیروں کو  
توڑ دیں یا ملنے دیں

راستوں کی مرضی ہے  
اجنبی کوئی لاکر ہمسفر بنا ڈالیں  
ساتھ چلنے والوں کی راکھ بھی اڑا ڈالیں  
یا سافیتیں ساری  
خاک میں ملا ڈالیں

یہ نظم جیسے اس گھر کی تقدیر کے اوپر ہی لکھی گئی تھی جہاں من کی مرضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا پہلے باپ پھر بھائی اور پھر تقدیر کی غلامی۔ گھر والوں کا کردار تو بے جان مہروں اور خاموش تماشاخروں سے زیادہ اور کچھ نہیں رہا تھا۔

”امی! پلیز دوا لے لیں۔“ وہ بہت نرمی سے ماں پر جھکی تھی جو تین دن تک ہوش و حواس کی دنیا غافل رہی تھیں۔ غنوغی سے لحاظی طور پر جاگتیں تو پہلی پکار حارث کے لیے ہی لبوں پر چلتی تھی۔ مگر وہ اب یہاں کہاں۔ وہ تو سلاخوں کے پیچھے تھا۔ وقت سے دولت و طاقت چھین لینے چکروں میں عمر کا سودا کر بیٹھا تھا۔

”کیا کروں گی دوا کھا کر؟“ انہوں نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی اور بے زار کن لہجے بولیں۔

”لے جا اپنی اس دوا کو۔ زہر لا دے تھوڑا سا میرے لیے۔“  
”امی! کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔ کیا ہم آپ کے کچھ نہیں لگتے؟ اس نے بہت دکھ سے ماں کا ٹخرا ہوا خزاں رسیدہ چہرہ دیکھا تھا۔ اندر کہیں غم کے بھالے سے اثر تھے۔ شائستہ نے ایک دم آنکھیں کھول دیں پھر مضطرب سے تھکے تھکے انداز میں ہولے سے اٹھ بیٹھیں۔ سر بری طرح چکرار ہاتھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”گناہ کیا ہے زر؟“ انہوں نے یکفخت ہر اسماں ہو کر مٹی کا چہرہ دیکھا تھا۔  
”کمرے میں ہے۔ دروازہ لاک کر دیا ہے میں نے۔“ اس نے ماں کو اطمینان دلاتے ہوئے پلائی۔ شائستہ کے چہرے پر کرب کی لکیریں بننے لگیں۔

”یا خدا! اتنی کڑی آزمائش۔ ہم تو پہلے ہی کاٹیج پہنچے ہیں۔ مغل تو پہلے ہی قدموں تلے نہیں ہونے گرا۔ تو نے انکار ہی کیجھا ڈالے۔ قدموں میں بھی اور پہلو میں بھی۔“

وہ ضبط نہ کر سکیں تو دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگیں۔ اپنے کڑیل جوان بیٹے کی بربادی

گھر بھولنا ہی نہ تھا۔  
زر گل ان کے قریب بیٹھ گئی اور ہولے ہولے جسم دبائے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا تسلی کے لیے کن الفاظ کا سہارا لے۔

”امی! بھائی نے خود اپنے اعمال کی بدولت یہ انجام مول لیا ہے۔ کتنا کہتی تھی میں ان سے اور آپ سے۔ آپ نے بھی تو نہیں روکا انہیں۔ دوسروں کی عزتیں اچھالنے کے شوق میں اپنی عزت گنوا بیٹھیں۔“  
”مت کر اس طرح کی باتیں۔ میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔“ وہ بے بسی سے بھدمنت بولیں۔

”وہج ہی چھاپتا تھا۔ کیا بگاڑا تھا کسی کا اس نے۔“ وہ ماں تھیں۔ ماں جو اولاد کی ہر بری بھلی کو ممتا کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

”دکھ تو یہی ہے۔ خرید ہوا بچہ چھاپنے اور بنایا ہوا جھوٹ بیچنے کا دھند ان کے نزدیک پیشہ تھا۔ پیسے لے کر بولا ہوا بچہ اور نہ بولا ہوا بچہ دونوں ہی نیکی سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ایک کا پیسہ لے کر چھاپ دیتے تھے اور ایک سے پیسہ لے کر دبا جاتے تھے۔ ان کا مسئلہ سچائی کی اشاعت نہیں تھا پیسے کی مقدار سے بستہ تھا۔ ڈیمانڈ سے کم ہوتا تو خبر لگا دیتے تھے اور زیادہ ہوتا تو خبر دبا جاتے تھے۔ اس پیشے کے تقدس کو کھڑا ڈالتا تھا۔ دوسروں کی ٹوہ میں رہنا اور ان کی ذات کے انتہائی حساس اور پس پردہ حقائق کو سرعام پھانسا تو ہمارے مذہب میں بھی جائز نہیں ہے۔ پھر وہ کون سی صحافت کرتے رہے تھے۔ بلیک میلنگ کی فاف۔ اپنے پیشے اور اختیار کا ناجائز اور مافی استعمال اسی انجام پر منتج ہونا تھا۔“

”کیسی بہن ہو۔ بھائی سولی پہ لٹکنے کو ہے اور تمہیں وعظ سوچ رہے ہیں۔“ شائستہ اس کی ہچی کھری نما برداشت نہ کر سکیں۔ جل کر بول پڑیں۔

”مجھے نہیں پتا کہ اچھا اور کیا برا۔ میرا بیٹا میرا چاند۔ میری جان جیل میں ہے۔ ہرگز رتا دن اسے بندے کے قریب کر رہا ہے اور زندگی سے دور۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔ مالک مجھے حوصلہ دے۔ مر ڈاؤں گی میں۔ اب نہیں سہارا مجھ میں۔“ وہ بلکنے لگیں۔

زر گل کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ پہاڑ جتنا حوصلہ اور برداشت رکھنے والی ماں رو رہی تھی مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ مٹی کے بس تھی۔ حارث کے اخبار کے چیف ایڈیٹر نے اسے جاب سے الگ کر کے ہر تعلق ختم کر لیا تھا۔ نعمان کا کوئی بندہ اس شہر میں نہیں رہتا تھا۔ سب دوسرے شہروں میں تھے اور کسی کو پتا بھی چلا تھا تو ہانپوٹے کے لیے نہیں آیا تھا۔

گل عمو کا کیس تھا اور مجرم جرم کا اعتراف کر چکا تھا۔ یعنی شاہدوں کے بیان کے مطابق قاتل کی

تصدیق ہو چکی تھی۔ ایسے میں کوئی وکیل بھی اتنا کمزور کیس لڑنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ عدالت کی طرف سے متعین کردہ وکیل صفائی کا انداز اس قدر ڈھیلا اور رکمی تھا کہ وکیل استغاثہ نے پہلے دور میں ہی اس ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ کچھ دن ہی رہتے تھے فیصلہ ہونے کو۔ اور اس متوقع لرزہ خیز فیصلے کے تصور مضبوط اور بلند حوصلہ شائستہ کو توڑ ڈالا۔ وہ بستر پر ڈھسے ہو گئیں۔ آج تیسرے دن ان کی حالت کچھ بہتر تھی۔

”امی! آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک ہے تو میں گلی والے جنرل اسٹور سے سودا سلف لے آؤں۔“

”تم جاؤ گی؟“ وہ ایک دم ٹھنک کر رہ گئیں۔ انداز میں تذبذب تھا۔

”اور کس نے جانا ہے اب۔ احمد چھوٹے موٹے سودے تو لے آتا ہے مگر گھر کی دوسری چیزیں

بچن کا سامان کیسے لائے گا۔ اسے کچھ علم ہی نہیں ہے۔“

”یہ تو بت آگئی ہے۔“ انہوں نے سر آہ بھری۔

”کبھی تمہارے باپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔ وہ بیٹیوں کو گھر کے کھلے آنگن میں نہیں

دیتا تھا۔ مبادا کسی کی نظر نہ پڑ جائے اور تمہارا بھائی ہوتا تو قیامت تک تمہیں بازار میں قدم رکھنے

اجازت نہ دیتا۔ زمین آسمان ایک کر ڈالتا۔ تم کیسے خرید کے لاؤ گی سودا۔ تمہیں تو کچھ تجربہ بھی

ہے۔“

زرگل کے چہرے پر ایک دکھ بھری استہزائیہ کیفیت رقم ہو گئی۔

”وقت ہر کام سکھا دیتا ہے امی۔ کاش ابوجی نے ہمیں اعتماد بھری فضا میں سانس لینے کا موقع دیا

تو آج آپ کو یہ دھڑکے نہ لگے ہوتے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہر کام کرنے دیا جائے مگر اتنا ضرور ہے کہ

طرح کے ماحول میں ہر قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے والدین کو بچے کو سکھنے کا بھرپور

دینا چاہیے کہ کیا خبر زندگی کے کس موڑ پر اس جنم کی ضرورت پڑ جائے۔ کاش انہوں نے ہمیں انسانوں

دنیا میں رہ کر ان سے ربط مضبوط بڑھانے کا موقع دیا ہوتا تو آج ہم اپنے ہی سائے سے اتنا بدگلا

ہوتے۔ دھڑکوں میں زندگی نہ گزارتے۔ اکیلے اس صدمے کو نہ سہہ رہے ہوتے۔ ہمارا بھی کوئی

نغمہ گسار ہوتا۔ کوئی دلا سادینے والا تعاون کرنے والا حوصلہ بڑھانے والا ہمارے پاس موجود ہوتا۔

بد نصیب ہیں ہم کہ ہمارے ہمسائے تک ہم پہ ٹوٹنے والی قیامت پر پرسہ دینے نہیں آئے۔ کسی

کے رکھی ہوئی تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔“

وہ متاسف لہجے میں کہتی ہوئی تھملا اٹھا کہ ماہ گل کو دروازہ بند کرنے کی ہدایت کرتی ہوئی باہر نکل

”آہا۔ آئیے جناب۔ تشریف لائیں۔“ شفیع جنرل اسٹور پر پہنچی تو اسے دیکھتے ہی اس کا مالک شفیع محمد لپک کر گرم جوشی سے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھا تھا۔

وہ سر ہلاتی ہوئی اسٹور میں داخل ہو گئی اور اپنی مطلوبہ خریداری کرنے لگی۔ آج دوسری بار وہ یہاں

آئی تھی۔ پہلی بار پرسوں احمد کو ساتھ لے آئی تھی۔ یہ جنرل اسٹور گھر سے کچھ فاصلے پر تھا سو وگین اسٹاپ

بک جاتے ہوئے راستے میں ہی پڑتا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اس نے اس طرف توجہ ہی نہ دی تھی کہ کبھی

ضرورت ہی نہ پیش آئی تھی۔ حادثہ اکٹھے ہی پندرہ دن کا سودا سلف لے آتا تھا۔ زرگل کے آنے کا تو

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب تو جیسے اس کے پیر میں پیسے لگ گئے تھے۔ شکر تھا جاب کے دوران کا

اعتماد اور راستوں سے شناسائی آج کام آ رہی تھی۔ وہی ماں کو لے کر پنڈی اڈیا لہ جیل میں حادثہ سے

ملوانے کے لیے لے جاتی تھی۔

”اور کیسی ہیں آپ؟“ ادھیر عزر پکی رنگت کا ترے فرہی مائل اڑے اڑے بالوں والا شفیع محمد خوش

اخلاقی کے مظاہرے کے طور پر اس کی طرف چلا آیا تھا۔ اتفاق سے اسٹور میں رش نہیں تھا۔ کاؤنٹر پر اس

کا اسٹنٹ بیٹھ گیا تھا۔

”بس جی اللہ کا شکر ہے۔“ وہ چائے کی پتی کا ڈباڑیک سے اٹھاتی ہوئی اپنے مخصوص سرسری لہجے میں

بولی تھی۔

”کیا کرتی ہیں پڑھتی ہیں کیا؟ میں نے اکثر آپ کو یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔“ اس

نے دلچسپی سے پوچھتے ہوئے جواز بھی بتا دیا۔

”نہیں جاب کرتی ہوں۔“ وہ پینے کی وال والا جارڈھونڈنے کے لیے متلاشی نگاہ ادھر ادھر دوڑاتی

بے دھیانی سے جواب دے رہی تھی۔ پھر شفیع محمد نے اسی بااخلاق اور پرشوق انداز میں بہن بھائیوں کی

تعداد پوچھ ڈالی۔ یہ بھی تصدیق کروائی کہ اکثر گلی میں دکھائی دینے والی پاگل سی لڑکی اس کی بہن ہے۔

”زندگی کے مسائل انسان کو چین سکون سے رہنے ہی نہیں دیتے۔ مگر کیا کریں کہ زندگی بھی تو گزارنا

ہے بہر حال۔“ وہ اسی بے دھیانی سے مروت بھرے انداز میں کہہ کر دیسی صابن کی مکیا اٹھانے لگی۔ اس

کی تمام تر توجہ شاپنگ کی طرف تھی۔ سامان گھر لے جا کر اسے امی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔ پھر شام

کو کپڑے دھونے تھے۔ تین دن سے وہ امن گاہ نہیں جارہی تھی مگر کل تو بہر حال جانا ہی تھا۔ اس سے

زیادہ چھٹی نہیں لے سکتی تھی۔

”اس اسٹور کے بالکل ساتھ سیاہ گیٹ والا مکان میرا گھر ہے۔ میں یہیں رہتا ہوں۔ اکیلا ہوں۔“



ماں باپ تو کب کے وفات پا چکے۔ بہن بھائی اپنے اپنے گھر کے ہو گئے۔ بیوی تھی جس کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا۔ اب بالکل اکیلا ہوں اور بہت دکھی ہوں۔“

”ہاں جی تنہائی بھی ایک بڑا دکھ ہے۔“ شفیع محمد کے شہنشاہی رخ بستہ آہیں بھرنے پر اسے مروت میں کچھ تو کہنا تھا۔

”اور یہ تنہائی انسان کب تک برداشت کرے کبھی دل چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو بہت نرمی اور محبت سے دل کی باتیں سنے۔ دکھ سکھ میں ساتھ دے۔ یہ تنہائی بہت ستاتی ہے مجھے۔“

پھر اس کے چہرے پر نگاہ ڈال کر مخاطب ہوا۔

”سارے دن کی تحکمن اور بور روٹین بندے کے اندر سے سکون نچوڑ لیتی ہے۔ اگر آپ براہ مانیں اور آپ کا دل چاہے تو کچھ دیر کو میرے پاس آ جایا کریں۔ پاس ہی تو گھر ہے میرا۔ بیٹھ کے اچھی سے منووی دیکھ لی جائے پی ٹی تھوڑی سے گپ شپ بھی ہو جائے گی اور تحکمن بھی اتر جائے گی۔ آپ کو کسی قسم کی ضرورت ہو کوئی کام ہو مسئلہ ہو تو مجھ سے کہیں بندہ ہی بندے کے کام آتا ہے۔“

سامان کے لفافے میٹنی زرگل کو ایک جھٹکا سا لگا۔

زرگل نے ایک بہت تلخ اور استہزائیہ نگاہ اس پر ڈالی اور سر جھٹک کر کاؤنٹر پر حساب کتاب کرنے آ گئی۔

”بوجھ زیادہ ہے۔ کہیں تو چھوٹے کو کہہ دوں وہ سامان گھر تک پہنچا دے گا۔“ وہ بڑی اپنائیت سے گویا ہوا تھا۔

”نہیں۔ شکریہ۔ میں اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی ہوں۔“ اس نے بالکل کھردرے سپاٹ انداز میں دو ٹوک جواب دیا اور تیزی سے تھیلہ اسنبھالتی ہوئی موٹر گئی تھی۔



”میں نے بہت کوشش کی حارث کے سلسلے میں مگر بات نہیں بن سکی۔ میرے ایک جاننے والے وکیل دوست کے ساتھ کافی ڈسکشن ہوئی اس نے کیس کا جائزہ لے کر اسے ہوپ لیس قرار دے دیا تھا۔ افسوس کہ ہم حارث کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ میری تو خواہش تھی بڑے سے بڑا وکیل کروا کے حارث کی گردن چھڑائی جاسکے مگر تقدیر نے ساتھ ہی نہیں دیا حارث کا۔ جس دوست کے ساتھ میری بات ہوئی تھی وہ بانی کورٹ کا بہت مشہور اور منجھا ہوا تجربہ کار وکیل ہے۔“ وہ امن گاہ آئی تو حسب سابق اجلال سے ناگرا ہو گیا۔

وہ حارث کے متعلق پوچھتا ہوا فکر مند نہ لہجے میں اپنی کوشش اور ان کا مایوس کن نتیجہ سنار ہاتھا۔

”اچھا۔“ وہ مختصر ابولی۔ اس کی نظر اور لہجے سے اجلال کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ اسے اس کی ”لفافی“ اور ”دھاوا“ سمجھ کر طنزاً کہہ رہی ہے۔ مگر اجلال نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی نہ سچائی کے ثبوت کے طور پر مزید کوئی بحث کی۔ اس سے گھر والوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ مثال منول کے سے بے دھیان اور لا پرواہ انداز میں حسب سابق مختصر اُبتانے لگی۔ آج وہ پہلے کی نسبت خاصا سنجیدہ تھا۔

”اور تم یہاں سیٹ ہونا۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے ناں۔“

”مسئلہ کیا ہوتا ہے۔ گزرا چل رہا ہے۔“ وہ بمشکل تمام بے زاری چھپا کر آہستگی سے بولی۔ اجلال کو جانے کیا بات یاد آئی تھی جو وہ جاتے جاتے ایک دم پلٹ آیا تھا۔ اس کے لہجے میں کوئی بات تھی جو اس نے نہیں بتائی تھی مگر زرگل کے دل میں کھٹک رہی تھی۔ وہ خواہش کے باوجود پوچھنا گوارا نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بعد سوچ میں گم اجلال خود ہی بولنے لگا۔

”زرگل! میرا خیال ہے تم یہ جاب چھوڑ دو۔“ اجلال نے شاید پہلی مرتبہ اسے باقاعدہ نام لے کر اتنے سنجیدہ بلکہ متفکر سے فیصلہ کن انداز میں مخاطب کیا تھا۔

”کیسے چھوڑ دوں۔ کیا ڈھیر لگا ہوا ہے باہر؟“ وہ تیوریاں چڑھا کر بڑھی سے اسے گھورنے لگی۔ انداز میں تفتی تھی۔

”ناظمہ بڑے عرصے سے حارث سے بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہی ہے۔ اور اب جبکہ اسے خبر ہو چکی ہے کہ حارث جیل میں ہے وہ زیادہ آزادی اور جوش سے حارث کے گھر والوں سے..... اور پھر وہ تمہارے بارے میں جانتی ہے۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر مضطرب لہجے میں بولا۔ زرگل نے کچھ خاص اہمیت نہیں دی اس کی بات کو۔

”میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟“

”تم نے نہ سہی حارث نے اس کا خاصا نقصان کیا ہے۔ شو بزم میں اس کا مقام بن گیا تھا۔ عنقریب قلم لائن میں جگہ ملنے والی تھی مگر اس اسکیڈنل کی وجہ سے اس کی شہرت اور مقبولیت داغدار ہو گئی ہے۔ ہر چند کہ سبھی جانتے ہیں اس فیلڈ میں کوئی پاک دامن نہیں پائی جاتی مگر یہ سب کچھ پس پردہ ہوتا ہے اپنی پارسنائی کا بھرم سبھی کو عزیز ہوتا ہے۔ عوام کی نظروں میں معصومیت کا ڈرامہ رچائے رکھنا ہوتا ہے تاکہ سر آنکھوں پہ بٹھائی جاتی رہیں۔ وہ پہلے بھی دھندا کرتی تھی اور اب بھی کر رہی ہے مگر عوامی سطح پر رڈف ملی

سے میل ملاپ کے کھلم کھلا شواہد سامنے آنے پر اس کے ”ان“ رہنے کے چانسز محدود ہو گئے ہیں۔ اس نقصان کا سبب حادثہ ہے اور ناظمہ اس کی بوٹیاں نوچنے کو بے تاب ہے۔“

ہر چند کہ اجلال کے اندیشے بجاتھے مگر زرگل انہیں اہمیت دینے سے قاصر تھی وہ یوں بھی اس کی باتوں پر کان دھرنے کی عادی نہیں تھی۔ اسے اس قابل ہی نہیں سمجھتی تھی۔

”کیا کر لگی وہ؟ اب میرے خلاف تو ایسا اسکینڈل بنانے سے رہی“ زرگل کے بے فکری سے کندھے اچکانے پر اجلال کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

”تم انتظار میں رہنا جب وہ ایسا کر گزرے گی۔“ دانت پیٹتے اور شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے وہ سلگ کر بولا تھا۔

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس ادارے کی سرپرست اعلیٰ بیگم سرفراز رؤف علی کے رشتے کی بہن ہے اور کسی زمانے میں اس کی محبوبہ بھی رہی ہے۔ خاندانی جھگڑے کے باعث دونوں کی شادی نہیں ہو سکی۔ مگر بیگم سرفراز کے دل میں اب بھی اپنے محبوب کے لیے نرم گوشہ ہے۔ وہ انگلینڈ سے پاکستان آ چکی ہے اور اس واقعے کی اطلاع بھی اسے موصول ہو گئی ہے اور ناظمہ کو بیگم سرفراز کی رہائش گاہ پر آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔“

زرگل ایک لمحے کو الجھن میں پڑ گئی۔ اسے لامحالہ معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

”مگر بیگم سرفراز ایک محبت وطن اور ہمدرد دل رکھنے والی سماجی خاتون ہیں۔ وہ اس گورکھ دھندے میں کیوں پڑنے لگیں۔ کم از کم مجھ سے انہیں کیوں پر خاش ہونے لگی۔ وہ کل ادارے میں تشریف لائی تھیں۔ مجھ سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔“

پھر زرگل کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کل جب میڈم سبجانی سے اس کا تعارف کروایا تھا تو بیگم سرفراز کی سردمہر آنکھیں ایک لمحے کو اس پر تنگ گئی تھیں۔

”اچھا تو آپ ہیں معروف صحافی حادثہ کی بہن۔“ انہوں نے کچھ چپھتے ہوئے سرد انداز میں اس کا جائزہ لیا تھا۔ اس وقت اس نے غور کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اپنی سوچ کو اونچیکو اور ریشٹل بناؤ۔ ہر شے کو جذبات کی سطحی نظر سے مت پرکھا کرو۔“ اجلال کے ہونٹوں پر استہزاء سے مسکراہٹ ریگ گئی تھی۔

”ان بڑے بڑے سیاسی و سماجی ناموں کی حیثیت کھوکھلے ستونوں سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ خیر میرا فرض تھا تمہیں آگاہ کرنا“ آگے تم خود سے دار ہو۔ سنو دوستی میں اس قدر سوداگری بھی جرم ہے۔ گو

کہ ہم میں دوستی نہیں مگر ایک تعلق خاطر تو ہے ناں۔ اسی کے پیش نظر میری بات کا یقین کر لو۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔

”میں اپنا فائدہ خود بہتر جان سکتی ہوں۔“ اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ بہر حال انفارم کرنے کا شکریہ۔“ وہ کسی طور اس کا احسان لے کر قرض نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے اتنی ڈھنائی سے حق جھٹاتا ہے۔ ذرا سی مدد لے لی تو سر ہی چڑھ جائے گا۔ پھر اس کی لن ترانیوں پر زرگل کو کوئی خاص یقین بھی نہیں آیا تھا۔

اجلال نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے ایک لمحے بغور اس کا چہرہ جانچا۔ وہی بے نیازی اور نولٹ کے تاثرات سے مزین سپاٹ گریز پا چہرہ۔

”مرضی ہے تمہاری۔“ وہ گہری سانس لے کر مزید بحث کے بغیر چابیاں اٹھاتا اندر میڈم سبجانی کے اسٹنٹ انعام علی سے ملنے چل دیا۔

زرگل سر جھٹک کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ ان دنوں بیگم سرفراز باقاعدگی سے ادارے کی خبر گیری کے لیے آتی تھیں کچھ دنوں سے ناظمہ کا بھی آنا جانا تھا۔ غالباً وہ یہاں رہائش پذیر ہونے کا ارادہ رکھتی تھی حسن اتفاق تھا کہ جب بھی ناظمہ ”امن گاہ“ آتی اجلال کو کسی نہ کسی طرح خبر ہو جاتی۔ وہ بھی آن ٹیپتا۔ بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے ناظمہ اور بیگم سرفراز سے میل ملاپ کرتا تھا۔

”ہو نہ مجھے جانے کون کون سے جاسوسی فلمی ”ڈراواے“ دیے جا رہے تھے اور خود دونوں سے ایک ساتھ ”نپٹ“ رہا ہے۔ بیٹنگیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ بھلا مرد اپنی فطرت بدل سکتا ہے۔ یہ بھی تو بھیا کا ”ہم نوالہ ہم پیالہ“ رہا ہے۔ اپنی اصلیت دکھانا ہی تھی۔“

گزشتہ چند روز سے بیگم سرفراز زرگل پر خاصی مہربان ہو گئی تھیں۔ اس کے رہے سبے خدشات بھی جاتے رہے۔ انعام علی آج کل بیگم سرفراز کا سایہ بنا ہوا تھا۔ اس روز بیگم سرفراز نے اسے ”امن گاہ“ کے ایک خصوصی کمرے میں بلایا۔ سجاوٹ اور فرنیچر کے اعتبار سے سے بیڈروم ہی لگ رہا تھا مگر اس کے ایک کونے پر مودی کیمرہ رکھا ہوا تھا۔ سامان کچھ اس طرح کا تھا جیسے کسی فلم کی شوٹنگ کی تیاری ہو رہی ہو۔

”آؤ زرگل۔“ بیگم سرفراز کے بلانے پر اس کے ٹھٹکے ہوئے قدم صوفے کی سمت بڑھ گئے جہاں وہ براہمان تھیں ان کے انداز میں نرمی اور مٹھاس تھی۔

”ناظمہ ایک فلم میں کام کر رہی ہے کچھ شوٹنگ یہاں ہونا تھی۔ ابھی کچھ دیر بعد آئے گی۔ میں نے

بوتیک سے اس کے ڈریسز منگوا لیے ہیں۔ میں چاہ رہی تھی تم پہن کر ان کی فننگ دیکھ لو تمہارا اور ناظمہ کا قد وقامت ملتا جلتا ہے۔ اگر فننگ ٹھیک نہ ہو تو واپس کر کے دوسرا سائز منگوالیں، ورنہ عین ناظم پر مصیبت پڑے گی۔ ناظمہ سے میری بڑی اچھی جان پہچان ہے۔ میں چاہتی ہوں اسے کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہ ہو۔ آفٹر آل وہ میرے ادارے میں رہائش پذیر ہونے والی ہے، کل کو وہ مشہور ہیروئین بن جائے گی ادارے کا نام روشن کرے گی۔“

”ایک تو ان اعلیٰ شخصیات“ کو نام و نمود کی بہت حرص ہوتی ہے۔“ اس کے ذہن میں اجلال کا کہا ہوا فقرہ مکرایا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ہنس دی اور بیگم سرفراز کے دوبارہ اصرار پر کپڑے لے کے ہاتھ روم میں چلی گئی۔ وہ چاہتی تھیں زرگل پہن کر انہیں دکھا دے۔

بلیک جارجٹ کے باریک لباس کے ہمراہ شیز ندرتھی۔ زرگل نے ہچکچاہٹ کے عالم میں بیگم سرفراز کی توجہ اس سمت دلائی، مگر انہوں نے تسلی سے کہا۔

”یہاں میرے علاوہ اور کون ہے۔ ایک منٹ کو تمہیں پہن کر ہی تو دکھانا ہے۔“

وہ بادل خواستہ وہ چست اور کافی حد تک قابل اعتراض لباس پہن کر بازو سینے کے گرد لپیٹے جھبکتے ہوئے ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور جیسے اس کی آنکھوں کے آگے اندر جھکا گیا۔

بیگم سرفراز غائب تھیں۔ مووی کیمرہ آن تھا، اسکرین روشن تھی اور کمرے میں انعام علی کھڑا تھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے دوبارہ ہاتھ روم میں گھسنا چاہا مگر انعام علی تیار تھا۔ زرگل کی نازک کلائی اس کی گرفت میں آگئی اور وہ اسے کھینچتا ہوا عین کیمرے کے سامنے لے آیا۔

ایک لمحے کو تو اسے اپنے حواس مفلوج ہوتے ہوئے محسوس ہوئے، یوں لگا جیسے وقت قضا آن پہنچا ہو، پھر مزاحمتی تو تین مجتمع کرتے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

”یہ کیا چکر ہے“ وہ غرا کر اس پر الٹ پڑی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے بڑی سادگی معصومیت سے زرگل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب

دیا۔

”دراصل میڈم کے خیال میں تم بڑی قیامت شے ہو۔ اور یہ تو عوام کے ساتھ ظلم ہوگا کہ ایسا فتنہ سامان حسن پردہ سیمیں پر نمودار ہو کر داد تحسین نہ پاسکے، اسی لیے یہ اہتمام کیا گیا ہے تمہارا یہ حسن ہمیشہ کے لیے کیمرے کی آنکھ محفوظ کر لگی۔ پھر یہ نظارہ کیسٹ کی شکل میں گلی گلی میں دیکھا جاسکے گا۔“

زرگل کے اعصاب پر جیسے کوئی بم پھٹا تھا اسے سماعت میں سائیں سائیں کی آوازیں گونجتی محسوس

ہونے لگیں۔ ایک زبردست قسم کا خوف و ہراس ریزہ کی ہڈی میں سرایت کر گیا تھا۔ وہ سارا کھیل سمجھ گئی اس سے انتقام لینے کے لیے یہ کھیل رچایا گیا تھا۔

بیگم سرفراز کے محبوب کی جان لینے والے قاتل سے انتقام پورا ہو جاتا۔

اور ناظمہ شوہر میں ویلیو ڈاؤن ہو جانے کا غم حارث کی بہن کی رسوائی کے ذریعے غلط کر سکتی تھی۔ سب خسارے اکیلی اس کی ذات کے لیے تھے۔ وہ بند بچرے میں پھڑپھڑانے والے پرندے کی طرح بے بس دکھائی دینے لگی۔ اس کے ذہن میں بچاؤ کی کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی۔ زرگل خوف و دہشت کی تصویر بنی تھر تھر کانپتی دیوار سے لگی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔

وہ محض چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ جب اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ خود زرگل کو بھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ انعام علی نے جھٹک کر اپنے اعصاب کی غنودہ کیفیت سے نجات پانے کی کوشش کرتے ہوئے بدستور اس کی جانب پیش قدمی کی، مگر اس کے قدموں میں دم نہیں رہا تھا۔ بالآخر وہ لہرا کر زمین پر آ رہا۔ اور اسی ٹائپ زرگل بھی گئے یہ ہاتھ رکھے تیور اکرا قالین پر گر چکی تھی۔ دونوں ہوش و حواس سے غافل ہو چکے تھے۔ کمرے میں پراسرار سا سکوت طاری تھا۔ مووی کیمرہ ہنوز اپنے کام میں لگا ہوا تھا شام کے چھ بج رہے تھے۔ ”امن گاہ“ پر سکوت طاری تھا۔ بیگم سرفراز ناظمہ کے ہمراہ کب کی یہاں سے جا چکی تھیں۔ ان کے خیال میں انعام علی کافی تھا، اگلے مرحلے کے لیے۔

اجلال کے کان میں گئے جدید ترین ٹیپ ریکارڈ کے اسپیکر پر جیسے ہی خاموشی چھائی وہ پھرتی سے ہاتھ روم کے روشن دان کا شیشہ توڑ کر اندر آ گیا۔ اندر کا منظر اس کی توقع کے مطابق تھا۔

دونوں بے ہوش ہو چکے تھے۔

وہ پہلے انعام علی کی سمت بڑھا اور اس کے بازو میں ایک انجکشن لگا دیا۔ اب وہ مزید چھ گھنٹوں کے لیے ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکا تھا۔ پھر وہ مووی کیمرے اور اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ ریل کھینچ کر ضائع کر دی۔ کیمرے کو الٹ پلٹ کے کھول کر اچھی طرح تسلی کر لی کہ ریل کا کوئی ٹیس باقی تو نہیں رہ گیا۔ ریل ضائع کر کے وہ زرگل کی طرف آیا۔ وہ قالین پر بے ہوش پڑی تھی۔

صوفے پر پڑی اس کی چادر اس پر ڈال کر جگ لے کر اس کے قریب آ گیا، اور پانی کے چھینٹے منہ پر مارنے لگے۔

اس نے کمرے کے باہر کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے راستے بے ہوش کر دینے والی گیس اندر داخل کی

تھی اس گیس کے استعمال سے دس پندرہ منٹ کی بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ زیادہ طاقت کی گیس اس لیے نہیں استعمال کر سکتا تھا کہ اس سے انعام علی کے ساتھ ساتھ زرگل کو بھی نقصان پہنچتا۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ گئی۔ چند لمبے سرکودنوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے ہونے کا یقین کرتی رہی۔ پھر ارد گرد کے ماحول پر نظر پڑی اور پھر اجلال کو سامنے پا کر وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

”آ۔ آپ یہاں۔“ اس کے حلق میں کانٹے سے اُگ رہے تھے یوں لگ رہا تھا، قوت گویائی کہیں رکھ کے بھول آئی ہو۔ اس کی نظروں میں بے یقین سا ہراساں استفہام تھا مگر اجلال کا ذہن باہر نکلنے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ وہ بہت محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ نظروں میں اضطراب آمیز ہوشیاری تھی۔

”سوال و جواب بعد میں کر لینا۔ فی الوقت یہاں سے نکلنے کی کرو۔“ وہ چونکے انداز میں اٹھ کر دروازے تک گیا۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ پھر اس کے قریب آیا۔

”باہر صرف چوکیدار ہے۔ تم اس طرح یہاں سے نکلو جیسے معمول کی طرح جایا کرتی ہو۔ اسے کوئی شبہ نہ ہونے دینا۔ چہرہ نارمل رکھنا۔ اور۔ لباس۔ اسے تو بدل ڈالو۔“ سرگوشی سے کچھ اونچی آواز میں اسے ہدایت دیتے ہوئے معاً اس کی نگاہ اس پر پڑی۔ تو ناگواری سے رخ موڑ کر تیوریاں چڑھا کر کہنے لگا۔

زرگل ابھی تک بے دھیانی میں تھی، جونہی خود پر نگاہ پڑی، کٹ کر رہ گئی۔ جی چاہا شرم سے زمین میں جاسائے۔ وہ برق کی سی تیزی سے ہاتھ روم میں گھسی اور اپنا لٹکا ہوا لباس تبدیل کر کے باہر آ کر اپنی چادر لپیٹ لی۔

”میں ہاتھ روم کے راستے دیوار پھاند کر باہر جاؤں گا۔ تم جیسے ہی گیٹ سے نکل کر بائیں طرف مزدگی کوئے پر میری نسان کھڑی ہوگی۔ جلدی کرو اس سے پہلے کہ بیگم سرفراز صورت حال جاننے کے لیے اپنا کوئی آدمی بھیج دے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

اجلال جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے باہر نکل گیا تھا۔ اور اب گاڑی سے فیک لگائے فکر مند نظروں سے ”امن گاہ“ کے گیٹ کی طرف نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ ایک ایک لمبے کی تاخیر اعصاب پر گراں گزر رہی تھی۔ کہیں وہ پھنس نہ گئی ہو۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے خدشات کو حقیقت سمجھ کر دوبارہ ”امن گاہ“ کی طرف بڑھتا، وہ گیٹ سے نمودار ہوتی دکھائی دی۔ چادر لپیٹے ایک ہاتھ میں پرس تھا، وہ نروس انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ جوں ہی بائیں طرف متلاشی نگاہ دوڑائی اجلال بے قراری سے ہاتھ ہلاتا ہوا نظر آ گیا۔

فرنٹ سیٹ پر وہ یوں ڈھیر ہوئی تھی جیسے قدموں میں جان نہ رہی ہو۔

”اس حالت میں گھر جاؤ گی تو گھر والے پریشان ہو جائیں گے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر خود کو ریلیکس کرلو۔“ گاڑی روز اینڈ جیمین گارڈن کے گیٹ وے پر جا کر رکی تھی۔

وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں بے جان قدموں سے اس کے پیچھے چلی آئی۔ وہ اپنے حواسوں میں کہاں تھی، جو اعتراض و انکار کرتی۔

یہ پارک کچھ اس قدر وسیع و عریض تھا اور کچھ ایسے زاویے پر بنایا گیا تھا کہ دور دور تک ویرانہ دکھائی دیتا تھا۔ اکادکا لوگ نظر آ رہے تھے۔

زرگل کو اپنے اڑے اڑے حواس مجتمع کرنے میں بہت دیر لگی۔ وہ دانستہ چپ چاپ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ دانستہ اس کی سمت متوجہ نہیں تھا، اسے خود کو سنبھالنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ جانتا تھا اس وقت خاموشی ہی اسے پرسکون کر سکتی تھی۔

”آپ کو کس طرح خبر ہوئی؟“ بہت دیر بعد اس نے بھیکے ہوئے شکستہ لہجے میں سر جھکا کے پوچھا۔ اب وہ نظریں ملانے کے قابل ہی کہاں رہی تھی۔

”میں نے اسی مقصد کے لیے خاص طور پر ناظرہ سے دوستی بڑھائی تھی، تاکہ ان کے عزائم سے باخبر رہوں۔ شو بڑ کی تتلیاں جتنی حسین ہوتی ہیں اتنی ہی عقل سے پیدل اور عاقبت نااندیش ہوتی ہیں۔ انہیں بس داد و ستائش اور مال و متاع سمیٹنے سے غرض ہوتی ہے۔ میرے تعریف کرنے اور میریٹ میں تین روز تک لٹچ اور ڈنکر روانے پر وہ خود بخود موم ہو گئی۔ باتوں باتوں میں میں نے اس سے اگلا لیا کہ وہ اور بیگم سرفراز کیا ڈراما کھیلنا چاہتی ہیں۔ میں نے موقع پا کر آج صبح ٹیپ ریکارڈ کمرے میں فٹ کر دیا تھا میڈم کی حرکات و سکنات پر تو کئی دنوں سے نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ ”امن گاہ“ آئی تو اس کے پیچھے پیچھے میں بھی چلا آیا۔ ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے اندکی صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔ موقع پا کر میں نے میڈم کے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد بے ہوش کر دینے والی گیس کمرے میں داخل کر دی۔ ویسے تو براہ راست حملہ کر کے بھی انعام علی کو بے دست و پا کر سکتا تھا۔ مگر اس طرح وہ مجھے پہچان لیتا، اور بیگم سرفراز تک بات پہنچنے کے بعد معاملہ سنگین ہو جاتا، اس لیے یہ احتیاط کرنا پڑی باقی صورت حال تو تمہارے سامنے ہے۔“

وہ رمان سے ہلکے پھلکے انداز میں بات مکمل کر کے سگریٹ سلگانے لگا۔

”یہاں کتنا سکون اور تنہائی ہے۔ جیسے برسوں سے بے آباد اور سنسان رہا ہو۔“ وہ ارد گرد نگاہ دوڑاتا تھرہ کر رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔



”فکر نہیں کرو۔ بیگم سرفراز مزید کچھ نہیں کر سکے گی۔ الٹا اس پر اسرار صورت حال پر چکرا کر رہ جائے گی۔ انعام علی کی بے ہوشی۔ مودی کیسہ کی توڑ پھوڑ اور چوکیدار کی بے خبری پر سمجھ جائے گی کہ تمہارے پیچھے کوئی طاقت و فورس ہے جو عین ناظم پر تمہیں۔ چھڑا کر لے گئی ہے۔ وہ تصادم سے بچنے کے لیے خاموش رہے گی اور ناظمہ میں تو ویسے بھی دم نہیں ہے وہ تو بیگم سرفراز کے سہارے اتنی بہادر بنی ہوئی تھی۔ اسے چپ دیکھے گی تو خود بھی پیچھے ہٹ جائے گی۔ مگر بہر حال چند روز تمہیں احتیاط کرنا ہوگی۔“

وہ اس کی خاموشی کو پریشانی پر محمول کرتے ہوئے نرمی سے اس کی تسلی کروا رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ تو طے تھا کہ وہ ”امن گاہ“ میں دوبارہ قدم نہیں رکھے گی۔

”تمہیں جاب کی فکر ہے ناں۔ میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ میرے ایک دوست کی مسز نے حال ہی میں ایک پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکول کھولا ہے اسے درس و تدریس کے علاوہ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے ایک پڑھی لکھی اور قابل بھروسہ لڑکی کی ضرورت ہے۔ میں نے اس سے تمہارے تجربے اور تعلیمی کارکردگی کا ذکر کیا تھا۔ وہ بخوشی تیار ہو گئی تھی۔ مجھے چونکہ پہلے سے اندازہ تھا اس صورت حال کا اس لیے اس سے کہہ دیا تھا کہ پوسٹ خالی رکھے۔“

اس کے انداز میں کسی قسم کا احسان دکھا دیا ترس بھری ہمدردی نہ تھی۔ بڑے ہلکے پھلکے معمول کے سے رواں نرم انداز میں بتا رہا تھا۔ لہجہ بڑا سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ طنز مسخر یا تنک مزاحی کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے یہ تنک نہیں جتایا تھا کہ دیکھو میری بات نہ مان کر کتنے خسارے میں رہی ہو۔ آخروہی ہونا جو میں نے کہا تھا۔

”کیا خیال ہے گھر چلیں۔ تمہاری امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ خاصی دیر ہو گئی ہے۔“

وہ ارد گرد پھیلنے اندھیرے پہ نگاہ ڈال کر کچھ تشویش بھرے انداز میں کہتے ہوئے اٹھنے کو پر تو لے لگا۔ مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں۔

جواب میں وہی سکوت طاری تھا۔ اجلال نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔

”زرگل!“ اس نے پھوار سے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”ارے یار! حوصلہ کرو۔ ہو جاتا ہے ایسا کچھ زندگی میں۔ دل پر مت لو۔ یہ سب ٹھیک ہے۔“

اس نے محض اس کی تشفی کے لیے ہاتھ بڑھا کر ہولے سے اس کا سر تھپتھپایا تھا۔ مگر دوسرے لمحے جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔

زرگل جیسے ٹوٹ کر اس کے کندھے سے آگئی اور پیشانی ٹکا کر کچھ اس طرح پھوٹ پھوٹ کے روئی کہ وہ امتحان میں پڑ گیا۔

اس نے گھبرا کر چپ کرانے کے لیے کچھ کہنا چاہا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اچھا ہے اس طرح اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ اتنا بڑا غیر متوقع واقعہ ہوا تھا۔ اعصاب پر سکون ہونے میں وقت تو درکار تھا۔ وہ چپ چاپ تسلی کے سے انداز میں اس کا سر سہلاتا رہا۔ ساتھ ساتھ محتاط نظروں سے ادھر ادھر بھی دھیان رکھے ہوئے تھا کسی جاننے والے کی نظر پڑ گئی تو واقعی اشتہار بن جانا تھا۔

بالآخر وہ سنبھل گئی۔ اور آہستگی سے اس سے الگ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اجلال نے بغور اسے دیکھا۔ سرخ گال، سرخ آنکھیں، سرخ ناک، شفق کے ڈوبتے ہوئے الوداعی رنگوں نے اس کے سراپے کو بھی سرخ ارغونی رنگ میں ڈھانپ لیا تھا۔ وہ اس سے نظریں چرائے ہوئے تھی۔

اجلال بھی خاموشی سے چل پڑا۔ گاڑی میں بھی مکمل سکوت رہا۔ گاڑی مانوس راستوں سے گزرتی ہوئی گھر سے کچھ فاصلے پر وینگ اسٹاپ کے پاس پہنچی ہی تھی کہ وہ بول پڑی۔

”بس یہیں روک دیں۔“ وہ گھر کے آگے اتر کر ارد گرد کے لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ ادھر ہی اتر گئی۔ گاڑی سے اترنے سے پہلے ایک لمحے کو نگاہ اجلال کی سمت ڈالی وہ بھی اس سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ نگاہوں کا تصادم ہوا وہ کھڑا رہا جب تک وہ اپنے گھر کے دروازے تک نہیں پہنچ گئی۔

پھر طویل سانس لے کر ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ دل پر ایک بوجھ سا پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔



نیا استری شدہ جوڑا اپنے قسم قسم کے کھانے نفعن میں بھر کر اسے شاپنگ بیگ میں ڈال کر وہ بڑی ترنگ سے دروازے کی طرف بڑھی تھیں جب زرگل نے جھپٹ کر ان کا راستہ روکا تھا۔

”امی! کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ لہجہ سراسیمہ اور خوف و ہراس میں ڈوبا ہوا تھا۔

”کہاں جاؤں گی اپنے بیٹے کے پاس جا رہی ہوں۔ اسے کھانا دینے۔ وہ بھوکا ہو گا ناں۔ جیل میں ڈھنگ کا کھانا کہاں نصیب ہوتا ہے۔“ وہ تنک کر بولیں۔

”بھیا! اب جیل میں نہیں ہیں امی! پلیز اندر آ جائیں۔“ وہ سسکیاں روکتے ہوئے بھرائے ہوئے

ایسا اڑنے لگی تھیں۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ جیسے وہ یقین و بے یقینی کے گرداب میں پھنس کر رہی تھیں۔ وہ پھر ماں سے لپٹ گئی اور پھر۔

وہ لرزہ خیز حقیقت شائستہ پر آشکار ہو رہی تھی۔  
”حادث! میرے بچے! میری جان! ان کی دھواڑیں! آہیں اور پکاریں آسمان کا کلیجہ شق کرنے لیں۔ پاس پڑوس سے لوگ آگئے۔ کچھ خواتین نے مل کر انہیں سنبھالا۔

بستر پر لٹایا اور پانی وغیرہ پلا کر حوصلہ دلا سادے لگیں اور زرگل بے جان سے انداز میں آنگن میں لگے نیم کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر ڈھسے گئی اور دونوں گھٹنوں میں منہ چھپا کر سیل غم اشکوں کی دھند میں بہانے لگی۔

کوئی معمولی واقعہ تو نہ تھا۔ کڑیل جوان بھائی پھانسی کے پھندے سے گزر کر ان سے بہت دور جا چکا تھا۔ کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔ ہمیشہ کے لیے بے سائبانی عطا کر کے پہلے وہ جیل میں تھا تو کچھ سہارا تھا۔ یہ نئی تھی کہ وہ زندہ ہے۔ نگاہ کے سامنے ہے مگر اب۔ اف یہ ظالم دور۔ یہ غم۔ یہ اضطراب۔  
درد گرا آدمی ہوتا

تو گریباں پکڑ کر کہتے اُسے

اس طرح کرتے ہیں لاچاروں سے؟

اس طرح رہتے ہیں بے چین دلوں کے اندر؟

دل میں رہنا ہے تو کچھ ٹھیک سے رہنا سیکھو

ہم تمہیں سب سے ہیں کچھ تم بھی تو سہنا سیکھو

ایک تھوڑی سی خوشی آئے تو جل جاتے ہو

درد گرا آدمی ہوتا۔

پھر جشتوں، کٹھنائیوں کا ایک سلسلہ سا چل نکلا۔

زرگل پہلے پہل تو خوف و وحشت سے نڈھال ہو کر گھر میں بند رہی تھی۔

”امن گاہ“ میں پیش آنے والے اس روح فرسا واقعے کے بعد اس کا سارا حوصلہ پانی ہو گیا تھا۔ گھر سے باہر پاؤں نکالنے کے خیال سے ہی سانسیں رکے لگتیں پھر اس کے چار دن بعد حادث کو پکائی ہو گئی۔ قہر در قہر ٹوٹا تھا۔ ماں ہوش سے بے گانہ ہوئی۔ ماہگل اور احمد خوف و ہراس اور سراسیمگی کے مارے ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر روتے رہتے۔ گلنا زغریب تو پہلے ہی خود سے بے خبر رہتی تھی۔

لجے میں ماں کے ہاتھ بے نقب پکڑنے لگی، مگر انہوں نے ڈانٹ کر اس کے ہاتھ سے نقب دوبارہ کھینچ لیا۔  
”لڑکی تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ میرا بیٹا ادھر بھوکا بیٹھا ہوگا۔ میرے انتظار میں ہوگا اور تجھے اٹھکیلیاں سو بھر رہی ہیں۔ میں نے دو کھل بھی ساتھ لے لیے ہیں۔ جیل کی کوٹھری کی زمین کتنی سخت ہوتی ہے پتا نہیں میرے بچے کو نیند بھی آتی ہوگی یا نہیں۔“ وہ بڑے تفکر سے آہ بھرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ انداز میں متا کی تڑپ چمک رہی تھی۔

ماں کی یہ حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی کیجیے میں چھید ڈال رہی تھی۔ حادث کو پھانسی لگے پانچ دن گزر چکے تھے۔ مگر شائستہ کی حالت سنبھل کے نہیں دے رہی تھی۔

”ای! چلیں۔ اندر آئیں میں آپ کو حادث بھائی کی تصویریں دکھاتی ہوں۔“ وہ انہیں بمشکل تمام بازوؤں میں بھر کر اندر لے جانے کی سعی کرنے لگی انہوں نے اس کو جھٹک دیا۔

”تصویریں کیوں؟ میں اپنے بیٹے کو دیکھوں گی۔ اپنی آنکھوں سے۔“ انہوں نے تڑپ کر کہا اور شعلہ برساتی نظروں سے اسے گھورنے لگیں۔ ”کیوں بار بار میری راہ میں آ رہی ہے تو۔ چل اندر بیٹھو اور کنڈی لگالے۔ میں حادث کو دیکھ کر ابھی آتی ہوں۔“

”ای! وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“ وہ ہلکے ہلکے کر رو دی۔ اور ماں سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ شائستہ کی پر جوش کیفیت اس کی سسکیوں سے ہولے ہولے سرد پڑنے لگی۔ ان کے اعصاب ڈھیلے ہو گئے۔

”حادث یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے۔“ انہوں نے خواب کی سی کیفیت میں سوال کیا۔ اس سوال نے جیسے اس کے کلیجے پر گھونسا برسا دیا۔

”ای۔ ای۔ ای۔ وہ“ اور پھر اسے خود پر قابو نہ رہا۔ لفظوں نے زبان کے ساتھ چھوڑ دیا اور حواس ضبط کا درس بھولنے لگے۔ شائستہ نے ایک لمحے کو حیرانی سے ہلکی سسکی بیٹی کو دیکھا۔

”تو کیوں پریشان ہے بتانا مجھے کیا ہوا میرے حادث کو۔“ وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

”باپ سے ناراض رہتا تھا۔ اسی لیے کبھی گھر بھی نہیں آتا تھا۔ کہیں وہ اب ہم سے تو ناراض نہیں ہو گیا؟“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں مضطربانہ بیٹی کا سر تھپکتے ہوئے پرسوج انداز میں کہہ رہی تھیں۔

”ای! حادث بھیا اس دنیا سے جا چکے ہیں۔“ اس کی چیخیں نکل گئی تھیں۔  
”کیا بکتی ہو تم۔“ انہوں نے ایک دم اسے اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے تڑپ کر کہا۔ چہرے پر

سواسی کو ہمت کرنا تھی۔ بھائی کے رسوائے زمانہ انجام کے بعد چند روز کی رکی تعزیت کے بعد کسی اپنے پرانے قریب پھٹکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لوگ یوں دیکھتے جیسے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔ چھوٹ کے مریض ہوں۔ کوئی ملتا بھی تو بدک کر پرے ہٹ جاتا۔ ایک تماشا سا بن گیا تھا۔

امی کی حالت سنبھلی تو حارث کے چالیسویں پر آنے والے اجلال سے پرائیویٹ اسکول ایڈریس لے کر اگلے روز سر پر کفن باندھ نکل کھڑی ہوئی۔ پہلے محلے کے بچے اس کے پاس ٹیڑ پڑھنے آ جاتے تھے، مگر جب سے حارث گرفتار ہوا تھا والدین نے بچوں کو ہٹا لیا۔ اس لیے آمدنی کا ذریعہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

”کائنات پبلک اسکول“ کی ہیڈ مسز مسعود اجلال کے ریفرنس کی بدولت خاصی گرم جوشی ملیں۔ ضروری معاملات طے کرنے کے بعد اسے پانچ ہزار تنخواہ پر رکھ لیا گیا۔

”آپ کا ہوسٹل کا انتظام سنبھالنے کا خاصا تجربہ رہا ہے اور درس و تدریس بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا ہے آپ نے اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ کی بدولت بہت مختصر عرصے میں یہ اسکول چل اُٹے گا۔“ اور اس نے مسز مسعود کو مایوس نہیں کیا۔

جیسے تیسے دن گزر رہے تھے مگر اسے گلناز کی طرف سے بہت پریشانی تھی۔ ایک بار اجلال۔ تجویز دی تھی کہ انہیں پاگل خانے میں داخل کرادو۔ مگر یہ سنتے ہی وہ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ مر کے بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ کم از کم نظر کے سامنے تو تھی۔ کیا ہوا جو ہوش مندی سے دور تھی۔ پھر امی بھی قیام تک ایسا نہ ہونے ویتیں۔ مگر پریشانی بہر حال بدستور موجود تھی۔ امی بہت سراسیمہ رہنے لگی تھیں۔

”مجھے تو بیماری نے ایسا نچوڑا ہے کھڑے ہوتے ہی چکر آنے لگتے ہیں۔ سارا دن گلناز کی طرا سے ہول اٹھتے رہتے ہیں۔ حالانکہ دروازے پر تالا ڈال کے رکھتی ہوں مگر اس کو کیا خبر جنون میں بھی کر سکتی ہے۔“

شائستہ اس دن کچھ زیادہ ہی پریشان تھیں۔ ”امی! واحد حل یہی رہ جاتا ہے کہ۔“ وہ ایک جھجک کر چپ ہو گئی پھر بولی۔

”کہہ آئی کو زنجیر سے باندھ دیں۔“

”ایسا نہ کہو۔“ شائستہ بے ساختہ تڑپ کر کہہ انھیں دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ یوں لگا جیسے کسی دل کو ٹپھی میں سمجھنچ دیا ہو۔ جن ہاتھوں نے گودی دی۔ کھلایا تھا وہ اب زنجیریں باندھیں گے۔ ”اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے امی۔“ وہ زنجیدگی اور افسوس کے طے جلے انداز میں بولی۔ شائستہ

پب رہیں۔ ایک سرد آہ ہونٹوں سے نکل کر اداس فضا میں گھل گئی تھی۔

اگلے روز جب وہ گلناز کے ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ کو لوہے کی زنجیر سے باندھ رہی تھی تو اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو گلناز کے دامن اور زنجیر کو بھگور رہے تھے۔ گلناز حیرت سے کبھی زنجیر کو دیکھتی اور بھی اس کی آنکھوں سے بہتے پانی کو۔

”روتی کیوں ہو۔؟“ وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔ ”کیا تمہیں بھی اس بڑھے نے اجازت دیا ہے۔ میرا دل تو جلا دیا تھا۔ کیا تمہارا دل بھی آگ میں ڈال دیا ہے بولو نا۔ چپ کیوں ہو۔“ وہ سادگی سے اصرار کر رہی تھی۔

زرگل نے نچلا ہونٹ دانٹوں تلے دبا کر گلناز کو دیکھا۔ روشن گلابی خوبصورت چہرہ مگر کس قدر مایاک قسمت لے کر آئی تھی وہ۔ وہ زیادہ دیر تک اسے دیکھنے کی تاب نہ لاسکی۔ مضحل ملول قدموں سے باہر چلی آئی۔

اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ گزشتہ دنوں کے واقعات نظروں میں پھر نے لگے وہ ابوجی کی مطلق لٹائی وہ ظلم و جبر کا دور حارث کی رد عمل کے طور پر اپنائی جانے والی تباہ کن پالیسی اور اس کا انجام۔ لقطہ قطرہ درد سے بھیگتا چلا گیا۔

مضحل کیسے ہوئے

کس نے کیا تھا اداس

چلتے چلتے جو کسی روئی ہوئی یاد سے ٹھوکر کھائی

ہولے ہولے سے سسکتی ہوئی تنہائی میں

لڑکھڑایا جو کسی بیتے ہوئے دن کا خیال

لملگی روشنیاں رات کو بڑھا دیتی ہیں

ڈھانپ لیتی ہیں گھٹائیں جو کبھی سورج کو

آنکھ بھی ایسے خیالات سے بھجھ جاتی ہے

دل کی ویران سڑک اور مٹوشی ہر سو

ایک پتا بھی کھڑک جائے تو ڈر جاتی ہے

نم بیدار تمنا کی خلش کون سے

ہاتھ میں تھا سے ہوئے اجڑا ہوا ہجر ہوا لاتی ہے

چھو کے رخسار گزر جاتی ہے

اور کوئی زرد دلا سا بھی نہیں دیتی ہمیں۔

خشک آنکھوں میں لگا جاتی ہے ہر بار نئے غم کی خراش

بہنے لگتی ہے خزاں کا جل سے

بھولنا اس سے تو بہتر ہے اگر بس میں ہو

کون ان سنگ زدہ راہوں میں ٹکراتا پھرے

جا بجا بھرے ہوئے لمحوں سے

پوچھتا کون پھرے

کس نے کیا اتنا اداس

مضحل کیسے ہوئے

کون ہمیں یاد آیا۔

فٹ پاتھ کی گھاس قدموں تلے روندتی سر جھکائے چلتی ہوئی زرگل کے ذہن میں بے ساختہ یہ نظم  
چکرانے لگی تھی۔ وہ تھکے تھکے اچھے قدم اٹھاتی ”کائنات پبلک اسکول“ کے گیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔



چھاجوں چھانج بارش برس رہی تھی، بمشکل نچوٹی بانپتی کا پتی وہ گھر پہنچی تھی، مگر گھر میں ایک قیامت  
اس کی منتظر تھی، گناہ گھر میں نہیں تھی۔ وحشت کا کوئی ریلہ اتنا تیز آ کر جنون کے ساحل سے ٹکرایا تھا۔ کہ  
لوہے کی زنجیر توڑ کر گھر سے باہر نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا زرد دوپٹہ بھی ٹوٹی ہوئی زنجیر کے سرے سے  
پلٹا ہوا تھا۔

زرگل کا دل دھک سے زہ گیا۔ نہیں۔ باخدا۔ اب اور تاب نہیں کسی قیامت کی۔

”امی! آپ تو خود کو سنبھالیں۔ میں دیکھتی ہوں۔“ وہ حواس چھوڑتی ہاں کے کندھے تھام کر بے  
بسی سے کہہ رہی تھی۔ شائستہ کو جب ماہ گل نے خبر دی کہ آپ اپنے کمرے میں نہیں ہیں تو انہوں نے  
دیوانہ وار اٹھ کر اسے تلاش کرنے کے لیے لپک کر باہر جانا چاہا تھا مگر دروازے تک پہنچ کر کزدی سے  
چکرا کر وہیں ڈھس گئیں۔ بمشکل تمام ماہ گل اور احمد نے سنبھالا۔

برستی بارش میں انہیں گھسیٹ کر کمرے تک لائے تھے وہ جوں کی توں کچھڑ میں لت پت برآمد  
سے لگی بیٹھی تھیں۔ زرگل انہیں بہلا پھسلا کر اندر لائی، کپڑے تبدیل کروا کے رضائی اوڑھائی اور اب

گناہ کی تلاش میں نکلنے کو تھی کہ شائستہ نے جھپٹ کر بازو پکڑ لیا۔

”نہیں۔ نہیں۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“ انہوں نے وحشت بھری نظروں سے اسے

دیکھا۔ اتنا طوفان ہے باہر۔ کہیں تم بھی اس کی لپیٹ میں نہ آ جاؤ۔“ ان کا لہجہ انجانے خدشات سے

کانپ رہا تھا۔

”امی! مجھے جانے دیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی طوفان اس گھر کو اپنی لپٹ میں لے لے۔“ اس نے

زی سے ماں کا ہاتھ ہٹا دیا۔

”کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ ایسی لا چاری اور بے بسی دیکھنے کو ملے گی۔ میرے بچے رل گئے

ہیں۔ وہ بیٹیاں جنہیں کبھی آنگن کی ہوائ نے نہیں چھوا تھا، آج جانے کس کس کی نگاہیں چھوٹی ہوں گی

ن کو۔“ شائستہ دونوں ہاتھوں میں منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

زرگل ایک لمحے کو پتھر کی ہو کر رہ گئی۔ ایک لفظ منہ سے نہ نکل سکا۔ الفاظ جیسے کہیں گم ہو گئے تھے۔

اس ہاتھ کا دباؤ ماں کے کندھے پر ڈال کر تشفی کراتی رہی، پھر کوئی چارہ کار نہ پا کر گھر سے باہر نکل آئی

برستی بارش میں چھتری لیے وہ گوگو کے عالم میں ایک موڑ مڑ گئی۔ وہ سمت کا تعین نہیں کر پاری تھی۔

شفیع جنرل اسنور کے قریب سے گزرتے ہوئے معاً اس کی نگاہ ٹھٹھکی اور قدم ٹھنک کر رہ گئے شفیع محمد

کے گھر کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک زنانی جوتی کچھڑ میں لت پت پڑی تھی۔

”اوہ میرے خدا! ایک لمحے کو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل دھڑکنے لگا ہوا ہو۔ وہ لمحوں

میں پہچان گئی تھی۔ یہ گناہ کی جوتی تھی۔ دیوانگی کے عالم میں وہ دوڑتی، بھاگتی یہاں تک پہنچی ہوگی۔

بٹلنے سے جوتی پاؤں سے نکلی اور اسی لمحے شفیع محمد ادر متوجہ ہوا ہوگا۔ اور۔

اس سے آگے اس سے کچھ سوچا نہیں گیا۔ وحشت کے عالم میں وہ شفیع محمد کے گھر کا گیٹ دھڑ

جڑانے لگی۔ کچھ توقف کے بعد گیٹ کھلا۔

”کون ہے بھائی، کیا صبر نہیں ہوتا۔“ اس نے جونہی گیٹ سے باہر جھانکا ہڑبڑا کر رہ گیا۔ زرگل کو

ماننے پا کر چہرے پر دوڑ جانے والی سراسیمگی اور گھبراہٹ اس سے چھپی نہ رہ سکی۔ زرگل کو جیسے پتے

لگ گئے۔ وہ گولی کی طرح اس کو پرے دھکیل کر دیوانہ وار اندر لپکی تھی۔ شفیع محمد بھی پیچھے لپکا۔

جونہی نگاہ بینڈ پر بکھرے گناہ کے ٹوٹے ٹکڑے وجود پر پڑی، قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی دل

ٹک سے رہ گیا تھا۔ گناہ کا لٹا پٹا دھلا ڈھلا انداز اس ”واردات“ کی تکمیل کا زندہ ثبوت تھا جس کے

خوف سے ماں بیٹی ادھ موٹی ہوئی جا رہی تھیں۔



گلناز کو خود پر گزری قیامت کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ بے نیازی سے صحت پر لوہے کی کڑیاں گن رہی تھی۔

”تم نے ذلیل انسان۔ میری بہن کو وہ بھوکا شیرنی کی طرح غزا کر شفیع محمد کا گریبان پکڑا جھنجھوڑنے لگی۔ وحشت سے دل اتنا لرز رہا تھا کہ جی چاہ رہا تھا اس درندے کی بوئیاں نوچا لے۔

وہ پہلے پہل کی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا اس برستی شام میں وہ بے بس بے سہارا لڑکی کیا کر سکتی تھی۔

”اگر اپنی خیریت چاہتی ہو تو چپ چاپ یہاں سے چلی جاؤ۔ اور اپنا منہ بند رکھنا۔ کان کھول کر سن لو اگر تم نے اپنی زبان کھولنے کی کوشش کی تو تم بھی محفوظ نہیں رہو گی۔ ٹھیک ہے پولیس میں رپورٹ درج کر دینا۔ مگر اس صورت میں تمہیں ایک کی نہیں دو بہنوں کی عزت لوٹنے کے الزام میں میرے خلاف مقدمہ درج کرانا ہوگا۔“ وہ یکھت سرد لہجے میں گویا ہوا۔

زرگل کے دل کی دھڑکنیں تھمتھکیں گئیں۔ اسے لگا جیسے صحت اس پر آ رہی ہو۔ یہ تو اس نے سوچا جو نہیں تھا کہ وہ اس وقت اس کے گھر میں بے یار و مددگار اس کے رحم و کرم پہ تھی۔ وہ ہوس کا پتلا اس کی عزت و عصمت کا شیشہ بھی چکنا چور کر سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے بدن میں پھریری ہی دوڑ گئی۔ وہ ہچکچا کر پیچھے ہٹ گئی۔

پھر ایک بار ان پر غضب کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ جوان بیٹی کی بربادی کا غم نیم جان کرنے کو کیا کم تھا کہ اس سانچے کے ٹھیک دو ماہ بعد وہ جان لیوا انکشاف رہی سہی روح بھی کھینچ کر لے گیا۔

اس دن صبح سے ہی گلناز مضطرب تھی۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ دوپہر کو الٹیاں کرنے لگی۔ شائستہ تشویش ہوئی۔ وہ اس کے پاس آ بیٹھی۔ اپنی جہانمیدہ نگاہوں سے بیٹی کا سر ٹٹولا پھر جیسے کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ایک اندیشہ سانپ کی طرح ذہن میں سرسرا نے لگا۔ انہوں نے ایک بھروسے کی تجربہ دانی کو بلوایا۔ اس نے اس اندیشے کی تصدیق کر دی اور یہ بھی کہ ”جڑ مضبوط ہو چکی ہے اب کچھ کرنے کرانے کا وقت نہیں رہا۔ جان کا خطرہ ہوگا۔“

اس دن شائستہ نے خدا سے جی بھر کے شکوے کیے۔ اتنی آزمائش اتنی کٹھنائیاں۔ یا خدا کوئی بھی ہوگی۔ ایک عظیم رسوائی کا ناگ منہ کھولے گھر کے بچے کچھے ڈھانچے کو نکلے کو تھا۔ زرگل کو ہی بتا سکتے تھیں۔ دونوں ماں بیٹی ہی تو ایک دوسرے کی راز دار اور غم خوار تھیں۔

اس نے سنا تو وہ بھی کلیجہ پکڑ کے رہ گئی۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے آنے والے رسوا کن لحوں کی چاپ ابھی سے سنائی دینے لگی تھی۔

شائستہ نے اپنے طور پر بہتری کوشش کی، مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بیٹی کی جان تو نہیں لے سکتی تھیں۔ اس معصوم کو خبر ہی نہیں تھی اس کی بدولت گھر والوں کو کس قیامت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔



اس دن بڑی مدت بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ڈیڑھ دو ماہ قبل کراچی کے بیورو آفس میں کچھ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے اخبار کے مالک کے حکم پر کراچی گیا ہوا تھا۔ اسلام آباد واپس لوٹا تو پہلی فرصت میں کائنات پبلک اسکول آیا تھا۔ چھٹی کا ٹائم ہونے والا تھا۔ وہ مسز مسعود کی ٹیبل پر رجسٹر رکھنے اور اپنی روائی کا بتانے آئی تو وہ ان کے آفس میں موجود تھا۔ مسعود بھی ادھر ہی تھا۔ تینوں میں اپنائیت اور بے تکلفی سے گپ شپ ہو رہی تھی۔

اس کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اجلال ہونٹوں پر آئی بات بھول گیا۔ بھرپور نگاہ سے اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ سیاہ ہنر رنگ کے سادہ سے لباس میں وہی بے نیازی، ٹھہراؤ اور دلکشی لیے وہ۔ مسز مسعود سے الوداعی مکالمات ادا کر رہی تھی۔ اس پر ایک سرسری نگاہ کے بعد دوسری نہیں ڈالی تھی۔ گویا جانتی ہی نہ ہو۔

وہ اس کی احتیاط پر زیر لب مسکرایا۔ یہی محتاط و مضبوط اور منجمد انداز تو اس کو دوسروں سے ممتاز بناتے تھے۔

وہ گیٹ سے باہر کچھ فاصلے پر کھڑی گاڑی کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ جب اجلال اس کے پیچھے ادھر چلا آیا۔

”لوگ تو ایسے ہو گئے ہیں جیسے کبھی آشنائی ہی نہ رہی ہو۔“ وہ قریب آ کر قدرے شوخی سے مخاطب ہوا کیا حال چال ہیں کیسی ہو؟“ وہ پر شوق نگاہ سے اس کا اداسی میں لپٹا دلکش چہرہ جانچ رہا تھا۔

”کیسی نظر آ رہی ہوں۔ آپ ہی بتا دیجیے۔“ کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ تھکے ہوئے بے زار کن انداز میں آہستگی سے گویا ہوئی۔ اعصاب پر اتنی تھکن تھی کہ اس کی موجودگی و ملاقات بھی اس وحند کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

”میں کہہ تو دوں، مگر کیا تم سننے کی تاب لا پاؤ گی؟“ اس نے بغور دیکھتے ہوئے وہی پرانی بات یاد

دلائی تھی۔ اسی گمبیر قدرے شرارتی سے چلبے انداز میں۔ زرگل اتنی ابھی ہوئی تھی کہ غصے یا حجاب کا مظاہرہ کرنا بھی فراموش کر گئی۔ اپنے اندر ہی اتنی کہانیاں بکھری ہوئی تھیں لوگوں کے چہرے کے افسانے کیا پڑھتی۔

”آؤ کہیں چل کر بیٹھے ہیں۔ اتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اطمینان سے بات ہوگی۔“  
 ”نہیں۔ بات کرنے کی نہ فرصت ہے نہ موڈ۔ پلیز۔“ وہ ناگواری چھپاتے ہوئے جھنجھلا کر بس کے انتظار میں سڑک کی طرف دیکھنے لگی، اجلال کی موجودگی اس وقت کوفت میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ کچھ ایسی سر پر آن پڑی تھی کہ بھائی ہی نہ دیتا تھا کوئی سراہا تھا ہی نہیں آ رہا تھا۔ ہردن عذاب کا نیارخ لے کر طلوع ہوتا تھا۔

”کیا بات ہے زرگل۔ تم بہت پریشان نظر آ رہی ہو۔“ وہ لحوں میں اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتے اضطراب اور کش مکش سے اس کے اندر کا بھید پا گیا تھا۔ وہ غور سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کا جائزہ لے کر سنجیدگی سے بولا۔ ”مجھے بتاؤ کیا مسئلہ ہو گیا کوئی۔“  
 ”اگر ایسا ہو بھی تو کیا کر سکیں گے آپ۔“ وہ شکستگی سے بولی۔

”تم بتاؤ تو سہی۔ آؤ میرے ساتھ تفصیل سے بات کرتے ہیں کہیں بیٹھ کر۔ تمہاری پریشانی سے تو مجھے تشویش ہونے لگی ہے خدا خواستہ۔“

”کہنے سننے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔“ وہ ہٹ دھرمی سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔  
 ”دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا ہے اور دل ہلکا ہو جائے تو مناسب متبادل تدبیر بھی ذہن میں آ ہی جاتی ہے۔ تم بتاؤ تو سہی۔“ وہ رسانییت سے بولا۔

”کیا بتاؤں۔“ وہ دل پر پڑے بوجھ سے ٹنڈھال ہو کر بالآخر پھٹ پڑی۔ ”میری پاگل بہن کو ایک برستی بارش میں خود سے بیگانہ دیکھ کر کسی نے عزت لوٹ لی۔ اور مزید آزمائش کے لئے خدا نے اس کے ناکرہ گناہوں کا پھل اس کی کوکھ میں ڈال دیا۔ کچھ وقت جاتا ہے کہ زمانے کی نظریں یہ بھیا تک حقیقت پالیں گی۔ رسوائی کے متوقع پتھروں کے زخم۔ ہمارے ہیں ہم لوگ۔ کیا بتاؤں مزید۔ بولیں ہے کوئی علاج اس کا آپ کے پاس۔“ وہ بغیر کے بتاتی چلی گئی تھی۔

اجلال کو یوں لگا جیسے وزنی آتشیں پتھروں کے اعصاب کو جٹھانے لگے ہوں۔ چہرہ شدت جذب سے سرخ پڑ گیا تھا۔ ہوہوٹ کا شتا ہوا نظر جھکا کر رہ گیا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ۔ کب ہوا ایسا۔ یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ پلیز۔ دیکھو اب

خند نہ کرو۔ چلو کہیں نہیں جاتے۔ مگر گاڑی میں تو بیٹھو، تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔ راستے میں بات کر لیں گے اس طرح سر راہ کھڑے ہو کر اس قدر حساس ٹاپک پر بات کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

وہ چپ چاپ گاڑی میں آ بیٹھی، کیا بتاتی مزید۔ وہ زبان، وہ حوصلہ کہاں سے لاتی، اس جانکاہ حادثے کی تفصیلات بتانے کے لیے اجلال خود ہی مختلف سوالات کرتا گیا۔ وہ مارے باندھے جواب دیتی رہی۔ اس نے آخر میں یہی بتایا تھا کہ گھنا زنگی میں بے ہوش پڑی ملی تھی اور وقوعہ میں ملوث شخص کا کوئی نام و نشان نہیں ملا۔

اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ کس نے کیا اور کب کیا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ وہ اس حادثے کے بعد دوبارہ بھی شفیق محمد کے پاس کہ اگر برباد کر ہی دیا ہے تو اسے اپنالو۔

”بھلا ایک پاگل کو کیوں عذاب کی طرح خود پر مسلط کروں۔ ہاں اگر تم ہاں کر دو تو میں آج ہی رشتہ لانے کو تیار ہوں۔“ وہ کینگی سے ہنساتا تھا۔ اور وہ اس کے منہ پر تھوک کر واپس چلی آئی تھی۔

”جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ گزر جانے والے واقعے پر بچھتاؤ اور غم زدہ ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو لحات واپس نہیں آ سکتے ان پر ماتم کر کے کیوں ان لحوں کو ضائع کریں جو ہمارے ہاتھ میں ہیں اور جن میں کچھ کیا جاسکتا ہے، ہمیں اس مسئلے کے حل کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ تمہاری امی کے خیال میں کون سا ایسا حل ہے جس سے بات منظر عام تک آنے سے بچ جائے۔“

وہ اس سے نظر ملانے بغیر پوچھ رہا تھا۔  
 ”اوہ۔ کوئی اور حل۔“ وہ بجا طور پر تشویش محسوس کر رہا تھا۔

”اور کیا ہو سکتا ہے؟“ زرگل نے تھکی تھکی سی سانسیں اندر کھینچیں۔ ”ایسی صورت میں زمانے کی اٹھتی انگلیاں دبانے کے لیے واحد حل شادی ہی ہوا کرتا ہے مگر ایک پاگل لڑکی سے کون ہوش مند شادی کر سکتا ہے اس حقیقت کا تو ہمیں بھی ادراک ہے۔ اسی لیے امی نے یہ حل نکالا تھا کہ کسی ہمدرد اور درد مند رکھنے والے بندے سے کہہ کر اسے نکاح کے لیے آمادہ کر لیا جائے ڈیلوری ہو جائے تو وہ گھنا ز آ پی کو جب جی چاہے طلاق دے سکتا ہے۔ یہ نکاح تو بس کاغذی ہوگا۔ رسوائی سے بچنے کے لیے۔ امی نے اپنے ایک بھروسے کے عزیز کو اس سلسلے میں کہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اب ہر ایک سے باری باری کہہ کر تمنا شتا تو نہیں لگا سکتے۔ اس طرح تو مزید بات پھیلنے کا اندیشہ ہوگا۔ اسی لیے بے بس ہو کر چپ ہو رہے ہیں۔ کوئی حل بھائی نہیں دے رہا۔“

دامن کا نصیب نہ بنائے۔

وہ کچھ ایسے دل گیر انداز میں بولا تھا کہ فی الواقع زرگل شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ اس نے کبھی آج سے پہلے اجلال کو اتنا ٹوٹا ہوا اور جذباتی شکست و ریخت کا شکار نہیں دیکھا تھا۔

کم از کم اب تو اسے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔

ثابت ہو چکا تھا کہ حادثہ کے حصول زر کے فلسفے سے قطع نظر وہ اپنے کام سے کام رکھنے کا عادی تھا اور پوری دیانت داری سے اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ پھر بے درپے حادثات پر اس کے خلوص بھرے تعاون نے اس کے جذبات کی سچائی اور بے لوث طبیعت کا ثبوت دے دیا تھا۔ زرگل معذرت کے لیے الفاظ سوچنے لگی۔ تبھی اس کا اسٹاپ آ گیا۔

”ایک اور بات جذبات کی صداقت کو آزمائش سے مرہون نہیں کرتے کہ آزمائش پورا اترنا یا نہ اترنا ہمیشہ ہی جذبات کی پرکھ کا پیمانہ ثابت نہیں ہوتا۔ بعض اوقات جذبات کی سچائی کے باوجود آزمائش کے وقت دعوے ادھر سے رہ جاتے ہیں۔ بہر حال تم نے اپنی نادانی کے سبب یا شاید اپنی کسی حس کی تسکین کے لیے میرے ضبط کے تار چھیڑے ہی ہیں تو اطمینان رکھو۔ میں یہاں بھی تمہیں خود سے جیتنے نہیں دوں گا۔ ایک محاذ پر ہارنا تھا تم سے کہ وہاں فطری طور پر بے بس تھا مگر اب نہیں ہاروں گا زندگی کو تو کیا زندگی کی ایک شام بھی نہیں ہار سکتا۔ دو دن بعد میں تمہیں حتمی جواب دے دوں گا۔“ گاڑی روکتے ہوئے اس نے سرخ جلتی ہوئی نگاہ اس کے پشیمان چہرے پر ڈالی تھی۔

اس وقت تو وہ اس کی مبہم باتیں سمجھ پائی تھی۔ جب گھر آ کر اس بارے میں اپنی طرف سے ماں کو خوشخبری سنائی تو وہ مذہذب میں پڑ گئیں

”وہ تو بہت اچھا لڑکا ہے کسی نیک ماں کی اولاد ہوگا۔ مگر ڈیڑھ دو مہینے پہلے ہی تو اس نے مجھ سے بات کی تھی تمہارے متعلق کراچی جانے سے پہلے۔ اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے یہاں۔ اس لیے خود ہی ایک دن آیا تھا رشتے کے لیے اور میں نے جواب میں ہاں کر دی تھی۔“

ماں کے انکشاف پر وہ ایک لمحے کو دم بخود رہ گئی تھی۔

”آپ نے مجھ سے اس بابت کچھ پوچھا نہیں؟“ اس نے شاکہ انداز میں انہیں دیکھا۔

”بیٹی! تو جو وقت بیت جائے شکر ہے اس کی ذبات کا۔ حالات ہی ایسے نہیں رہے تھے۔“ انہوں نے سرد آہ کھینچی۔ ”کیا پوچھنا بتانا۔ پھر وہ حادثہ کا دوست تھا اتنی مدت سے آتے جاتے دیکھا ہے اسے وہی حادثہ کی فوجی کے بعد بھی یہاں آتا جاتا رہا۔ خیر خیر پوچھنے کے لیے۔ ورنہ اور کس

”خیر۔ بہر حال ایک پوائنٹ تو ملا معاملہ آگے بڑھانے کو۔ ہم تلاش کرتے ہیں یقیناً دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔ اسے کون سا ساری عمر ساتھ نبھانا ہے۔ محض چند ماہ ہی تو اپنے نام کا تحفظ دینا ہوگا۔“

”کون ہے اتنا عالی ظرف اور حوصلہ مند۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کون پرایا گناہ اپنے سر لیتا ہے۔ پھر وقت طور پر ہی سہی ایک پاگل لڑکی نے شادی کے بعد وہ خود دوسروں کے لیے تماشا بن کر رہ جائے گا۔ اتنا جذبہ اور کشادہ دلی لوگوں میں ہوتی تو آج کرہ ارض جنت بن چکی ہوتی۔ کون یہ انتہائی قدم اٹھائے گا۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟ تم چند ماہ کے لیے اپنا نام اسے دے سکتے ہو؟“

اجلال ایک دم پتھر کا ہو کر رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی جرأت سے اس کا گریبان پکڑ لے گی۔ زرگل کو خود بھی بہت دیر بعد اندازہ ہوا کہ اس نے کیا ہم پھوڑا ہے اس کی سماعت پر۔

”تمہیں اندازہ ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔“ کچھ ٹائیے بعد بالآخر گویا ہوا۔

”ہاں۔ اور اب اندازہ کرنا چاہتی ہوں کہ تم کتنے پانی میں ہو۔“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”کیا تم مجھے چیلنج کر رہی ہو؟“ اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”نہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر سیدھی ہو گئی۔ ”میں نے تو تمہارے ہمدردی جتانے پر ایک بات کہی تھی۔ تمہیں بڑا دعوہ ہے مجھ سے تعلق خاطر کا۔ میری ذات اور میرے مسائل کے بارے میں بہت پریشانی اور فکر کا اظہار کرتے ہو۔ میں دیکھنا چاہتی تھی ان میں کتنی سچائی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے پھر میرا مسئلہ حل کرنے کے لیے تمہیں یہ جو بڑا مان لینا چاہیے۔“

وہ کس قدر بے رحمی اور پتھر لے سے بے نیاز انداز میں آرام سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کے یہ جملے کسی کے خلص اور ہمدرد دل پر کیسی چوٹ لگا رہے ہوں گے۔ ایسی نزاکتوں کا احساس تو وہ کرتا ہے جس کا اپنا دل ان جذبات سے گداز ہو چکا ہو۔ شاید ادھر یہ کیفیت نہیں تھی۔ تبھی روانی سے کہہ دیا گیا تھا۔

اجلال کچھ لمحے بغور اس کا چہرہ پڑھتا رہا۔ اس کے ہونٹ بھنج گئے تھے۔

”سنوگل! من میں بوٹی مرشد لگتا ہے۔ بجا کہ ہر کسی کو ولایت نصیب نہیں ہوتی مگر اس کا احترام تو وہ ہر دل میں اتارتا ہے۔ جذبات کا جواب دینے کی توفیق نہ ہو۔ نہ کسی مگر تعظیم اور اہمیت تو ہو۔ مسائل کو کچھ دے نہیں سکتے تو اس کے کشکول میں پتھر بھی مت ڈالے۔ مگر اور تمہارے کانے تو پھیلے ہوئے

نے پلٹ کے دیکھا اخبار والوں نے تو بھول کر بھی قدم نہیں رکھا۔ اور عزیز۔ رشتے داریوں آنکھیں پھیر گئے ہیں جیسے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔“

”بہر حال امی! میرا خیال ہے آپ کی معاملے میں ان پر دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے مان ہی جائیں۔“ وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”ہم کون سا ہمیشہ کے لیے ان پہ ذمے داری ڈال رہے ہیں۔ صرف چند ماہ کا کاغذی سہارا دے دیں۔“

”مگر میں تمہارے لیے ہاں کر چکی ہوں۔ آخر تمہاری بھی تو شادی کرنا ہے۔“

”چھوڑیں امی! ابھی اُس بارے میں سوچیں ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ ماہ گل اور احمد بہت چھوٹے ہیں۔ پھر آپ اور گلناز آپ کو اس طرح چھوڑ کر میں کہیں بھی نہیں جاسکتی۔“ اس نے مصمم لہجے میں جواب دیا۔

”ہر شے میں فطرت نے مچائش رکھی ہے۔ کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ میں سمجھتی تھی ابراہیم صاحب اور حارث نہ ہوتے تو گھر کیسے چلتا مگر دیکھ لو آج وہ دونوں ہی نہیں رہے مگر گھر چل رہا ہے۔ یہ دنیا ایک گول دائرہ ہے جس سے ہر ایک کو گزرنی ہی ہوگا۔ ہم اپنے اپنے دائرے کو مکمل کرنے تک اس گردش کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جانے پر مجبور ہیں میری بچی۔ میں نے تو پہلے بھی اولاد کی کوئی خوشی نہیں دیکھی نہ بیٹے کے سر پر سہرا سجانے بیٹی کے ہاتھ پیلے ہوئے۔ اب کیا تمہاری دفعہ بھی یونہی سنا رہے گا۔ نہیں کوئی خوشی تو دیکھ لوں۔“

وہ یاس بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو چپکنے لگے تھے۔

”وہ تو بعد کی بات ہے۔ دیکھی جائے گی۔ فی الحال آپ کی مسئلے پر سوچیں۔“ وہ ٹالنے کے سے انداز میں بولی۔ ”میرا خیال ہے وہ آپ سے وقتی طور پر کاغذی بندھن باندھنے پر راضی ہو جائیں گے۔“ اتنا تو وہ جانتی تھی اپنی زبان کا پکا ہے۔

”میں اس سے بات کروں گی اور اس سے وعدہ کروں گی کہ مخصوص مدت گزر جانے کے بعد تمہارے ساتھ اس کی شادی خود کروں گی۔“

”امی۔“ وہ ان کے دو ٹوک اور حتیٰ لہجے پر گہرا سی گئی۔ یہ معاملات تو پھر بھی طے ہوتے رہیں گے۔ مجھے شادی کی کوئی جلدی نہیں اور پھر ضروری نہیں کہ۔“

”نہیں۔ بالکل ضروری ہے کہ تمہاری شادی اسی سے ہو۔ آخر وہ اسی وجہ سے تو یہ قربانی دے رہا ہے۔“ شائستہ نے پورے یقین کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔ ”اگر وہ تمہاری عزت کے لیے اتنا

پہاڑ جیسا ظرف اور حوصلہ رکھتا ہے تو اس کڑی آزمائش سے گزر جانے کے بعد اس کے لیے ہماری طرف سے کوئی انعام تو ہوا اور اس کی بہترین صورت تمہارا اور اس کا رشتہ ہی ہو سکتا ہے یوں بھی اتنا اچھا برکھونا بے وقوفی ہوگی۔“

امی اپنے ہی تانوں بانوں میں لگی ہوئی تھیں اس نے مزید کچھ بولنا عیبث جانا۔



بالآخر وہ اس آزمائش سے گزر گیا۔ دنیا دکھا دے کو دو چار لوگوں کو بلا کر مختصری رسومات کے بعد گلناز کو سجا کے اجلال کے خوبصورت سے بنگلے میں پہنچا دیا گیا۔ زرگل اس کے پاس ہی ٹھہری تھی۔ کہ گلناز کے لیے نئی جگہ تھی۔ دیوانگی میں کچھ کرنے لڑے۔

اجلال انہیں گھر بٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ اچھ رسانی رات گھر واپس نہیں آیا۔

دوسری صبح وہ مضطرب قدموں سے اندر داخل ہوا تو زرگل نے درز دیدہ نگاہ سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر پتھر لی سی موجد کیفیت طاری تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ پوچھ سکی۔ البتہ دل میں عجیب سا بوجھل پن آن ٹھہرا تھا۔

اب وہ اس کا ہونوئی تھا۔ چاہے کاغذی ہی سہی رشتہ تو تھا اور اس نے رشتے سے دیکھنے پر وہ کتنا عجیب سا دکھائی دے رہا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا جس سے ہمیشہ بے زار رہتی تھی۔ کترا کر گزر جاتی تھی۔ اس سے اتنے قریبی تعلق سے بندھ چلے گی۔ ابھی کل ہی کسی چلپے دوست نے سر محفل چھیڑا تھا۔

”دو لہامیاں کوئی شعر تو سناؤ۔“ اور اس نے برجستگی سے پڑھ دیا تھا کہ

اس نے مانگا بھی اگر کچھ تو جدائی مانگی

اور ہم نچنے کے ہمیں انکار نہ کرنا آیا

یہ کہہ کر اس نے اس قدر گہری نظر سے اس کا چہرہ جانچا تھا کہ وہ بے ساختہ نظر چرانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ حالانکہ آج اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کتنا سچا اور مخلص تھا۔ اسے اس پر اعتبار آ گیا تھا مگر کتنی عجیب بات تھی۔

وہ دوست کیا عجیب تھا جس کی ذات پر

جب اعتبار بڑھ گیا، تو اختیار گھٹ گیا



آج وہ اس کی نظروں میں معیشتی مگر کسی اور حوالے سے۔

”کیسے ہیں آپ؟ وہ ناشتے کی میز پر قدرے جھجکتے ہوئے انداز میں اسے جامد وساکت دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ کوشش کے باوجود ”جلال بھائی“ زبان پر نہیں آسکا تھا۔ جواب میں اس نے ایک برقی نگاہ اس پر ڈالی۔ اور چپ رہا۔

”گناز کدھر ہیں۔ کیا وہ ناشتا نہیں کریں گی؟“ کچھ توقف کے بعد وہ اس کا استفسار یکسر نظر انداز کر کے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کرنے لگا۔

”وہ سوئی ہوئی ہیں۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ دل میں کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ کوئی دھندسی چھا گئی تھی۔ وہ ایسا تو نہیں ہوا تھا کبھی بھی اس کے ساتھ اتنا سرد مہر، انجینی اور تکلف میں لپٹا خود سے کتنا دور محسوس ہو رہا تھا۔ اب تو فاصلے سمٹ گئے تھے۔ اپنائیت کی فضا استوار ہوئی تھی تو وہ بے گانگی کے رنگ اوڑھ بیٹھا تھا۔

وہ بہت تھوڑا سا برائے نام ناشتا کر کے اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ زرگل یونہی خالی خالی نظروں اسے جاتا دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کے نکلا تو لاؤنج میں گھس گیا۔ جانے کون سی فائلیں کھولے بیٹھا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ آفس جانے کا کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا۔ زرگل کسلندی سے اٹھ کر گناز کو جگا کر ہاتھ منہ دھلائے لگی۔ اسے ناشتا کرانے کے لاؤنج میں لے آئی۔ یوں ہی اخبارات کھنگالتے ہوئے اس کی نظر رائٹنگ پیڈ پر پڑی۔ شاید وہ کوئی آرٹیکل لکھتا ہوا اٹھا تھا۔ کچھ صفحات پر مختلف مضامین لکھنے شروع کر رکھے تھے۔ آغاز پر پیرا گراف کے بعد غالباً موڈ بدل گیا تھا۔ پھر اس نے ایک صفحہ پلٹا۔ محسن نقوی کی نظم جگ رہی تھی۔

یہ راکھ راکھ راتیں اپنی رات کی قسمت

تم اپنی نیند بچھاؤ، تم اپنے خواب چنو

بکھرتی تو وہی بنیوں پہ دھیان کیا دینا

تم اپنے دل میں دھڑکتے ہوئے حروف سنو

تمہارے شہر کی گلیوں میں سیل رنگ بخیر

تمہارے نقش قدم پھول پھول کھلتے رہیں

وہ رہنڈر جہاں تم لمحہ بھر ٹھہر کے چلو

وہاں پہ ابر جھکیں آسمان ملتے رہیں

نہیں ضرور کہ ہر انجینی کی بات سنو

ہر ایک صدا پہ دھڑکنے بھی دل کا فرض نہیں

سکوت حلقہ زنجیر در بھی کیوں ٹوٹے

صبا کا ساتھ بھانا جنوں کا قرض نہیں

ہم اپنے لوگ بہت ہیں جو سوچتے ہی نہیں

کہ عمر کیسے کئی کس کے ساتھ بیت گئی

ہماری تشنہ لبی کا مزاج کیا جانے

کہ فصل بخشش موج فرات بیت گئی

یہ ایک پل تھا جسے تم نے نوج ڈالا ہے

وہ ایک صدی تھی جو بے التفات بیت گئی

ہماری آنکھ لہو ہے، تمہیں خبر ہوگی

چراغِ خور سے بجھا ہے کہ رات بیت گئی

نظم پڑھ کر گناز نے اسے کیا ہوا وہ دونوں ہاتھوں پہ چہرہ نکائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی جبکہ اپنے دوپٹے کا گولہ بنا کر کھپاتی ہوئی گناز حیرت سے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھ رہی تھی۔



”کمال ہے صاحب۔ اتنے پڑھے لکھے ہو کہ ایسی غفلت کا مظاہرہ کیا؟ ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ یہ تو ابھی خود کو سنبھالنے سے قاصر ہیں۔ آپ نے دوہری مشقت مول لے لی۔“ گناز کا چیک اپ کرنے کے بعد۔ گناز لوجسٹ نے تادیبی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

اجلال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ اس نے اضطرابی انداز میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر دبا ڈالیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے اس طرح جڑے تھے جیسے کبھی کھلیں گے ہی نہیں آنکھوں میں وحشت تیرنے لگی تھی۔

”چھ مہینے بعد ڈیٹ آئے گی ان کی۔ مگر چیک اپ باقاعدگی سے کرواتے رہیے گا۔“

وہ ڈاکٹر کے کلینک سے چیک اپ کروا کر اپنی سرال آ گیا۔

زرگل اسکول سے آ چکی تھی اور شام کے لیے سبزی بنارہی تھی۔ بہن اور بہنوئی پر نگاہ پڑتے ہی خیر مقدم کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کا سلام نظر انداز کرتا ہوا شائستہ کے پاس چلا گیا تھا۔ ”احسان کیا

ہے تو حوصلے سے نبھا بھی لیں۔ یوں جتا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ چائے دینے کے لیے اسے ڈھونڈتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی تو نہ چاہتے ہوئے بھی آرزوگی سے کہہ بیٹھی۔ وہ امی سے مل کر گھنٹہ کو ادھر ان کے پاس چھوڑ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔

اجلال نے ایک تپتی ہوئی سرخ نگاہ اس پر ڈالی اور پھر سامنے دیوار پر نظر جمادی۔

”کوئی ظالم بھی ہو اور زندگی کے لیے لازم بھی تو مجبوراً احتسابی عمل کو روکنا ہی پڑتا ہے ورنہ میں تمہیں احسان کے اصل معانی ضرور سمجھاتا۔ اور کتنا امتحان لوگی زرگل؟“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ یکفخت خاموش ہو کر رہ گئی۔

”مجھ سے کوئی رنجش ہے؟ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہہ لیں۔“ وہ نظر جھکا کر بولی۔

”کہہ تو دوں مگر کیا تم سننے کی تاب لا پاؤ گی؟“ بہت عرصے بعد وہی مخصوص جواب آیا تھا مگر اب کے لہجے میں شوق کی گرمی اور شرارت کی لپک نہیں تھی۔ ایک خشک روکھا نظر تھا۔

”یاد رکھو زرگل۔ جیلینگ انداز لاکھ قابل سٹائٹس سہی مگر جذبوں کو چیلنج کرنا بڑی بے وقوفی بلکہ بے رحمی کا ثبوت ہوتا ہے۔ دھمکی، دھونس اور دعوے سے نہ کھنکھائیں۔ سر اسر مقابل کی توہین ہے اور اس کی خودداری پر کاری ضرب لگانے کا باعث بن جاتا ہے۔ پرکھنا ہی ہے تو مان اور بھروسے کا پیمانہ استعمال کیجئے۔ ایک حساس و شفاف دل کو خشک و بدگمانی سے آلودہ کرنا کتنا بد صورت اور غیر فطری طرز عمل ہوا کرتا ہے۔“

زرگل پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ معاً اسے اپنی زیادتی کا شدید احساس ہو گیا۔ واقعی اس نے کتنی بے رحمی سے اسے چیلنج کرنے کے لیے آزمائش میں ڈالا تھا۔ وہ درخواست بھی تو کر سکتی تھی۔ طریقے سے سلیقے سے مسئلے کا حل طلب کرتے ہوئے اسے یہ اعلاظرنی دکھانے کے لیے آمادہ کر سکتی تھی مگر وہ تو ایک دم ہتھیے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔ اس کے جذبات احساسات کی پروا کیے بغیر ترخ کر کر بانی مانگ کی تھی۔ یہ تو اس کی شخصیت کا جذبہ تا کہ وہ اس اچانک وار کو سنبھالنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اگر احسان سمجھ کر کرنا تو اتنا شکستہ اور بکھرا ہوا نظر نہ آتا۔

”میں معذرت خواہ ہوں! اجلال! شاید اس وقت میں غلط الفاظ استعمال کر گئی تھی جذبہ بانی ہو کر۔“ وہ مضطربانہ پلکیں اٹھاتی گراتی نادوم ہو کر بولی۔

”شاید زندگی میں پہلی بار تمہارے ہونٹوں نے میرا نام چھوا ہے۔ چلو اسی خوشی میں چھوڑ دیتے جہاں سب حساب کتاب۔“

وہ ایک دم ہلکا پھلکا ہو کر خوش دلی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ کچھ لوگ خوشی محسوس کرنے کے معاملے نہایت قناعت پسند واقع ہوتے ہیں۔ ایک غیر معمولی رویہ بھی انہیں نہال کر ڈالتا ہے۔

”اور سنو۔ میں پہلے بھی بارہا تمہیں بتا چکا ہوں کہ الفاظ کے استعمال میں ہمیشہ محتاط رہا کرو۔ سوچ و لفظ غیر جانبداری سے انصاف کے ساتھ استعمال کرنے چاہئیں۔ خاص طور پر جذبہ بانی الفاظ کے نہال میں بہت اونچکلیو اور ایماندار رہنا چاہیے بندے کو۔ یہ چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ برائے کرم سری لے آئیے۔ اگر زحمت نہ ہو تو۔“

وہ بے اختیار اسے دیکھتی رہ گئی۔ ایک ذرا سی معذرت نے اس کو کتنا بدل دیا تھا آن کی آن میں۔ اید اس کی خود حساس طبیعت اور مردانہ انامیں چھپا کا نٹا نکل گیا تھا۔ زرگل مزید شرمساری محسوس کرنے لگی۔ اپنی بے نیاز فطرت کے باعث اس نے خواہ مخواہ سادہ دل، مخلص بندے کو اتنے دنوں سے عذاب کا جہنم کر رکھا تھا۔

”میں سارے قرض سود سمیت ادا کر دوں گی۔ اک ذرا انتظار۔“ دوبارہ چائے بناتی ہوئی وہ دل دال میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”اب نہیں سٹاؤں گی وعدہ۔ آپ کے دل کی تمام حسرتیں پوری کروں گی۔ یہ کھٹن وقت بیت آئے پھر سرتاپا نہال کر دوں گی پھر آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔“ وہ بشاشت سے مسکراتی دلی سوچ رہی تھی۔ انداز میں ایک ترنگ سی تھی۔

”ابھی چھ مہینے رہتے ہیں۔ بڑا طویل عرصہ ہے مگر خیر بیت ہی جائے گا۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ اس امتحان سے گزرنے کے بعد تمہارے وجود کی صورت میں ایک بہت خوبصورت انعام میرا منتظر ہوگا۔“ وہ چائے لے کر آئی تو اجلال سرور کن نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ وہ نظریں جھکا کر خواہ مخواہ ٹیبل پر پڑا رسالہ اٹھا کر اس کے صفحات الٹنے پلٹنے لگی۔

”کیا تم لوگوں نے گلناز کو کسی سائیکائٹرسٹ یا نیورولوجسٹ کو دکھایا ہے؟“

”نہیں بے درپے اتنے مسئلے مسائل رہے کہ دوبارہ چیک اپ پر دھیان ہی نہیں گیا۔“

”میرا خیال ہے انہیں کسی سائیکائٹرسٹ کو دکھالیتے ہیں۔ شاید کچھ بہتری کی صورت نکل آئے۔ کم از کم اپنا آپ سنبھالنے کے قابل تو ہو جائے۔ اس طرح کی زندگی گزارے گی۔ ساری عمر پڑی ہے۔ آر۔ جی۔ ایچ کے سائیکائٹرنی وارڈ کے ہیڈ میرے جاننے والے ہیں۔ کل ان کے پاس لے کے جاؤں گا۔“ اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔

”ہاں ضرور۔ اگر کچھ تھوڑی بہت بہتری ہو جائے تو۔“ زرگل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ لہجے میں زندگی کی رمت دوڑنے لگی تھی۔

گلناز کی حالت کے پیش نظر اجلال نے ایک فل ناٹم اور جرم عورت گھر پر رکھ لی تھی جو اس کی غیر موجودگی میں اس کا دھیان رکھتی تھی۔ وہ تو صبح کا گیا شام گئے لوٹتا تھا۔ ایسے میں کسی کو اس کے پاس ہونا چاہیے تھا۔

”میں کل ہی بات کروں گا ڈاکٹر شعیب سے۔“ اجلال نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”اور ہاں۔ تم جاب کب چھوڑ رہی ہو۔ یا ریس کرو اب۔ ایسا کیا مسئلہ ہے کچھ عرصے کی تو بات ہے پھر تم میری ذمہ داری ہوگی اور یہ بات طے ہے کہ شادی کے بعد تم گلناز امی ماہ گل اور احمد میرے ساتھ رہو گے۔“ وہ پھر اپنے پرانے موضوع پر آ گیا تھا۔ لہجے میں اصرار اور استحقاق تھا۔

”نہیں اجلال! آپ نے پہلے ہی بہت کچھ کیا ہے ہمارے لیے۔ یہی بہت ہے جو آپ نے ہماری عزت بچانے کے لیے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ پر اپنا گناہ اپنے ذمے لے کر خندہ پیشانی سے بھگت رہے ہیں امی بھی راضی نہیں ہوں گی۔“ وہ بہت رسانیت سے منع کر گئی تھی۔

”یہ بعد کی بات ہے۔ امی کو میں منالوں گا۔“ اس کا لہجہ اٹل تھا۔ ”تم بتاؤ جاب کب چھوڑ رہی ہو۔“

”بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی کچھ عرصہ تو ٹھہر جائیں ناں۔ میں اتنی جلدی جاب چھوڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ وہ اس کا لحاظ کرتے ہوئے نرمی سے بولی تاکہ اس کا مان مجروح نہ ہو۔

”اچھا بقول تمہارے میں نے بہت کچھ کیا ہے تو پھر تم بھی میرے لیے ایک کام کرو۔“ اچانک اس کی آنکھوں میں جاندار چمک ابھر آئی۔

”کیا؟“ اس نے پوری آمادگی سے دریافت کیا۔

”میں نے کبھی تمہیں مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ خاص طور پر میرے لیے تو کبھی مسکراہٹ تمہارے ہونٹوں پر نہیں ابھری۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں ایک بظاہر بے نیاز مگر متشکر ہمہ دم سنجیدگی اور اداسی کے خول میں لپٹے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ کیسا منظر پیش کرتی ہے۔ فقط ایک بھر پور مسکراہٹ میرے لیے۔ میرے نام کی۔ اور فقیروں کا مدعا کیا ہے۔“

وہ جن نرم نرم نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور جس طرح اس کے چہرے کے متبسم ذومعنی زاویے

نکسے جذبوں کی رنگین داستان سنا رہے تھے ان رنگوں نے بے اختیار زرگل کو پزل کر دیا۔ وہ تیزی سے پلٹیں چھپکاتی یونہی کانوں کے پاس پڑی لٹ کو پیچھے اڑتے ہوئے مچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائی ہوئی سیدھا دل میں اترتی جا رہی تھی۔ یہی نظارہ تو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔

”بھئی! ایک تبسم کی خیرات مانگتی تھی ہم نے۔“ وہ کتر اکر رخ موڑنا چاہتی تھی کہ وہ شریر سے انداز ں دوبارہ عین سامنے آکھڑا ہوا۔

اور زرگل کو خبر ہی نہ ہوئی کب اس کے ہونٹوں کی کلیاں ایک شرمیلے سے تبسم میں ڈھل کر کھل کر بکھر گئیں۔ اور یہی تو وہ لمحہ تھا جس کا اجلال اتنے برسوں سے صبر و ضبط سے منتظر رہا تھا۔ یہی وہ جذبوں کے رنگ تھے جنہیں وہ اس کے چہرے پر سج دیکھنے کی تمنا لیے ہوئے اس کی بے نیازیاں اور گریز داشت کرتا رہا تھا۔

وہ خود فراموشی کے عالم میں ایک تک اسے دیکھ رہا تھا۔ زرگل سے زیادہ دیر اس کے سامنے ٹھہرا نہ لیا۔ وہ تیزی سے ڈرائنگ روم کا دروازہ پار کر گئی تھی۔



کچھ بھی تھا۔ ایک مخصوص عرصے کے لیے وہ اس کی ذمہ داری تھی۔ پھر وہ ایک انسان تھا احساس اور ہمدردی کا مالک تھا۔ وہ جس عذاب میں مبتلا تھی وہی اس کے لیے کم نہ تھا۔ اوپر سے ہوش و حواس سے بے گاہنگی مزید اس کی حالت ابتر بنائے دے رہی تھی۔ وہ اپنے اندر روٹنا ہونے والی جسمانی بدیلیوں کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ ماسی بھی اسے کتنا سنبھالتی۔ جنوں میں وہ خود سے بے گانہ ہو جاتی تھی۔

وہ اسے ڈاکٹر شعیب کے پاس لے گیا۔ پہلے پل انہوں نے گلناز کی موجودہ حالات کے پیش نظر رینٹ اپلائی کرنے پر قرض کیا۔ ان کے خیال میں ڈیوری کے مرحلے کے بعد ٹریٹمنٹ زیادہ سودمند ثابت ہوگا۔ انہوں نے ابتدائی طور پر میڈیسن اور تھراپی اپلائی کی تو جواب میں مثبت رد عمل ملنے کے بعد انہوں نے اپنا خیال تبدیل کر لیا۔ تقریباً دو ہفتے انہوں نے اسے وارڈ میں رکھا۔ ای سی ٹی اور ڈسٹریکٹ دیا پھر گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔

”کم از کم چھ سات ماہ تک باقاعدگی سے انہیں ہفتے میں دو بار ہاسپٹل لانا ہوگا۔ ان کی ہفتہ وار پابلیس چیک کرنے کے بعد ہم مرحلہ وار ٹریٹمنٹ دیتے رہیں گے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ بہتری ہی لکھے گا۔ ہاں اس کے علاوہ سب سے اہم رول آپ کا گھریلو سطح پر ہوگا۔ مرلیضہ کی بہتری کے لیے آپ کا تعاون سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے بلکہ یوں سمجھ لیجیے ان کی صحت کی بحالی کا دار و مدار

آپ کے طرز عمل پر ہوگا جن دباؤ کی بدولت یہ ان حالوں کو پہنچی ہیں ان کا پریشم کرنے کے لیے آپ کو بہت یکسوئی اور برداشت سے کام لینا ہوگا۔“

پھر وہ اسے سمجھانے لگے کہ اسے کس طرح ٹرین کرنا ہے۔

اجلال نے ان کی ہدایات کو پلے باندھ لیا۔ وہ باقاعدگی سے گناز کو ہاسپٹل لے کر آتا تھا اور گھر بھی پوری طرح ٹائم دینے کی کوشش کرتا تھا۔ ڈاکٹر شعیب کی ہدایت کے مطابق وہ زیادہ سے زیادہ توجہ اور وقت اسے دیتا تھا۔ اس کے ایک ایک عمل اور رد عمل پر دھیان دیتا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا۔ سمجھاتا اور اس کے کھانے پینے کے اوقات کار کا دھیان رکھتا تھا۔ ڈاکٹر شعیب کے مطابق ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ گناز کی بول چال بالکل نارمل تھی۔ بول چال میں کوئی رکاوٹ، بے ترتیبی یا ابھار ملیٹی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کافی حد تک صفائی ستھرائی کا بھی دھیان رکھتی تھی۔ کھانا پینا بھی نارمل لوگوں کی طرح تھا البتہ جذباتی سطح پر طاری جمود اور سپاٹ پن کو ختم کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کی سوچ، ادراک کی کیفیت اور ماحول سے مطابق رکھنے کی جسارت زیادہ متاثر ہوئی تھی جن کے لیے باقاعدگی سے اسے دوائیں، دیر لمبی پھلکی ای سی ٹی دی جاتی تھی۔ گوکہ طریقہ علاج بہت مہنگا اور طویل تھا مگر اجلال کمال حوصلہ، تحمل سے سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ گناز کے ساتھ اور اس مصائب سے مغلوب گھرانے کے ساتھ بہت بڑی نیکی تھی۔



”سنو!“ ایک مدہم، متحیر سی پر شوق مگر جھجکی سی آواز پر بیڈ پر آواز چھلینا کتاب پڑھتا ہوا اجلال ایک دم اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے مڑ کر اپنے بیڈ روم کے دروازے کی طرف دیکھا۔ سبز رنگ کے صاف ستھرے لباس میں بھرے بھرے بدن سمیت گلابی چمکتی ہوئی رنگت لیے گلی سیاہ لمبی ریشمی زلفیں شانوں پر پھیلائے بڑے معصومانہ انداز میں دروازے سے جھانک رہی تھی۔

”کیا بات ہے گناز؟“ وہ نرمی سے پوچھنے لگا۔ ”آؤ اندر آ جاؤ۔“

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر آ گئی اور ٹیبل پر بیٹھنے لگی۔

”نہیں۔ یہاں نہیں بیٹھتے۔“ اس نے تحمل سے منع کیا۔ ”ادھر صوفے پر بیٹھو۔“

وہ کچھ لمعے الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھتی رہی جیسے بات سمجھ نہ پا رہی ہو۔ اجلال نے اسی سے دوبارہ بتایا تو وہ کچھ ہچکچا کر بیڈ کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی البتہ انداز روٹھا روٹھا سا تھا۔ اس بات کو پسند نہ کیا ہو مگر اس کا اکتہا نہیں کیا۔

”یہ کیا چیز ہے؟“ کچھ دیر بعد وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پات مدہم لہجے میں پوچھنے لگی۔ اس کا لہجہ کسی قسم کے اتار چڑھاؤ سے خالی تھا۔

”یہ کتاب ہے۔ تم پڑھو گی اسے؟“ وہ دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

وہ خاموش رہی۔

”کیا تمہیں پڑھنا آتی ہے یہ کتاب؟“ وہ اس کی سوچ کو ادھر ادھر کرنے کے لیے یونہی بولتا رہا۔

”جانتی نہیں۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”لو پڑھ کر دیکھو۔“ اس نے کتاب اس کی طرف بڑھائی۔ کچھ دیر بے حس حرکت بیٹھے رہنے کے بعد گناز نے کتاب پکڑ لی اور اپنی گود میں رکھ کر خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا اب بھی وہ بوڑھا آدمی تمہیں تنگ کرتا ہے اور تمہیں دھمکیاں دیتا ہے؟“ وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

”آں۔ ہاں۔ نہیں۔“ وہ الجھن بھرے انداز میں سر کو ادھر ادھر گردش دینے لگی۔ ”اب زیادہ نہیں کرتا۔ پہلے تو جب بھی بولتی تھی یا سوچتی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ کنٹری کرتا تھا۔“ وہ سادگی سے بتا رہی تھی۔

”اب تم کو تنگ کرے گا تو تم کیا کرو گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں اس کو آگ میں ڈال دوں گی جو بھی مجھے تنگ کرے گا۔“ اب اس کے رد عمل میں ایک جوش

ما تھا۔

”کیا مجھے بھی؟“ یونہی لطف لینے کی خاطر وہ بے اختیار بول پڑا۔

”آپ کو.....؟“ وہ لمبی لمبی پلکیں جھپکاتی کچھ دیر نرم نرم نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس کے

کچھ ہونے تیوروں میں ایک تبدیلی رونما ہوئی یوں لگا جیسے مسکرانے کی کوشش کر رہی ہو۔

”نہیں۔ آپ کو نہیں پھینکوں گی۔“ بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ کر بڑے پیارے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”اچھا۔ وہ کیوں؟“ وہ زیر لب مسکرا کر دلچسپی سے بولا۔

”آپ اچھے لگتے ہیں ناں مجھے!“ وہ بھولپن سے بولی۔

اجلال نے بری طرح چونک کر پہلی بار دھیان سے اسے دیکھا۔ اس جملے نے اس کی ہستی تہیں نہیں

کڑی تھی۔ گناز کے چہرے پر شوق کی حرارت سی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اپنی انگلیوں کو



اجازت نہیں دیتی۔

ویسے تو ظاہر ہے یہ دو صورتیں نہ بھی ہوتیں تو بھی وہ اتنے ہی فاصلے پر رہتا کہ وہ خود کو پہلے ہی کسی کے نام کر چکا تھا۔ ”اگر یہ صورتیں موجود نہ ہوتیں تو گلناز کا ہے کو اس کے ہاں ہوتی۔“ اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرا دیتا۔

گلناز جوں جوں شعور کی وادی میں قدم رکھ رہی تھی وہ تیزی سے اجلال کے قریب ہوتی جا رہی تھی اب وہ اجلال کی موجودگی اور غیر حاضری کو پوری شدت سے محسوس کرتی تھی۔ غیر ارادی طور پر بے چون و چرا اس کی ہدایات پر سر ہلا کر عمل کرنے کی کوشش کرتی تھی اور آج تو واضح انداز میں کہہ گئی تھی۔

”آپ مجھے اچھے لگتے ہیں مجھ سے پیار جو کرتے ہیں۔“

اس کے ہمدردانہ اور نرم رویوں نے گلناز کی محروم زندگی میں جیسے پھول سے کھلا دیے تھے۔ وہ اس سے اپنائیت اور محبت کی توقع رکھتی تھی۔ اس کے سرسری نرم انداز کو اپنا حق سمجھنے لگی تھی۔ اجلال نے پہلے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا مگر آج جیسے وہ ٹھنک کر رہ گیا تھا سرتاپا۔ وہ بے چینی سے سر کے بال کھینچتے ہوئے دوبارہ بستر پر گر پڑا اور یونہی کتاب کے صفحات پلٹنے لگا پھر اس کی نظریں چند اشعار پر جمی گئیں۔

ہم نے سہ لیا کافی

اب تمہاری باری ہے

ہم نے تو اداسی میں

زندگی گزاری ہے

فاصلوں سے جوئے میں

میں نے شام باری ہے

موت بھی ضروری ہے

زندگی بھی پیاری ہے

”فاصلوں سے جوئے میں میں نے شام باری ہے“ وہ اس شعر کو زیر لب دہراتے ہوئے دیوار پر نظر جما کے جانے کیا کیا سوچنے لگا تھا۔



”بس ڈیڑھ ماہ رہ گیا ہے مزید مذاہب کا۔“ شائستہ حساب لگاتے ہوئے بچوں کی کاپیاں چیک

مسلکی ہوئی معصومیت سے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ نگاہ کے تجسس کے پس پردہ جھانکنی ہوئی اپنائیت نے اجلال کو سن کر دیا۔

”میں کس طرح اچھا ہوں۔“ وہ بمشکل خود پر قابو پاسکا تھا۔

”آپ مجھ سے پیار جو کرتے ہیں۔“ وہ بھی شاید بہن کی طرح جذباتی الفاظ کے استعمال میں فضول خرچ اور لا پرواہ تھی۔ بڑے مزے سے کہہ گئی۔

”آپ کا گھر بھی اچھا ہے۔ اب یہ میرا گھر بھی ہے ناں۔“ وہ اس کے پاس آ کر اپنا مومی گداز ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر جھنجھوڑتے ہوئے سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

اجلال نے اڑے اڑے خصل حواس مجتمع کرتے ہوئے بڑی مشکل سے اس کے بھرے بھرے گداز گلابی وجود سے نگاہ چرائی تھی۔

”گلناز! اب تم اپنے کمرے میں جاؤ شاباش!“ وہ آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر رخ پھیرنے ہوئے دھیرے سے بولا تھا۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا ضبط پارہ پارہ ہو کر نکھر جائے گا۔ دو تین بار بات دہرانے کے بعد وہ سر ہلاتے ہوئے اس کے بیڈروم سے نکل گئی۔

اجلال نے اپنی تپتی ہوئی بے قرار مٹھیاں زور سے دیوار پر دے ماریں۔

وہ اب تک سیلف کنٹرول سے کام لے کر نفیس پر کڑے پہرے بٹھاتا آیا تھا مگر پھر بھی ایک مرد تھا۔ گوکہ زمانے اور قانون کی نظروں میں تو وہ سرخرو تھا۔ چاہتا تو یہ استحقاق دھڑلے سے وصول کر سکتا تھا کہ کون دیکھنے لے سکے والا تھا۔ دنیا کی نظروں میں تو وہ اس کا جائز حقدار تھا مگر خدا کی ذات تو موجود تھی ناں۔ وہ جانتا تھا شرعی اعتبار سے حاملہ سے نکاح کا حق اس وقت تک نہیں وصول کیا جاسکتا جب تک کہ پیدائش کا عمل ظہور پذیر نہ ہو جائے اس کے علاوہ نکاح کے قاعدے قانون کے مطابق فریقین کا عاقل و بالغ اور سمجھ دار ہونا ضروری ہے ایک پاگل نکاح کے عمل سے مستثنیٰ ہے۔ وہ اس شرعی حد پر سختی سے قائم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نکاح محض دنیا کی زبان بند رکھنے کے لیے کاغذی کارروائی ہے۔ شرعاً وہ اس سے ازواجی حق وصول کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ شرعی لحاظ سے اگر اس قسم کے بندھن کو قائم رکھنا ہو تو فریقین کے لیے لازم ہے کہ پیدائش کے بعد نئے سرے سے نکاح پڑھوا کر ایک دوسرے کے قریب آئیں ورنہ شرع کی رو سے وہ ایک دوسرے کے لیے نامحرم اور اجنبی ہیں۔ پھر یہاں تو واضح صورتحال یہ تھا تھی کہ لڑکی شعور و فہم سے بے گانہ تھی۔ ایک پاگل اور دیوانے سے نکاح نہیں کیا جاسکتا۔ شرع اس کی

پر بچے کے سینے کی پسلیاں اور پیچھے سے متاثر ہو گئے تے۔ نظام تنفس کے درست کام نہ کرنے کی وجہ سے بچی ماں کے پیٹ میں ہی دم توڑ گئی تھی۔ شاید اس میں قدرت کی کوئی مصلحت تھی۔ حالانکہ ایسے مواقع پر گھر والوں کے چہرے دکھ کی تصویر بن جاتے ہیں مگر جانے کیوں یہ خبر پا کر شائستہ نے سکھ کی گہری سانس لی تھی۔



ہمیں پردے کے پیچھے چپ کر دیکھنا اور مسکرا دینا  
وہی مسکان دھیمی سی  
وہی کچھ بولتی آنکھیں  
وہی چپ چاپ سالجہ  
وہی بے چین سی ہانپل  
وہی سائے سے گھبرانا  
وہی کہنے سے کچھ ڈرنا  
وہی بے وجہ اٹھلانا  
سبھی آثار کہتے ہیں  
اسے مجھ سے محبت ہے

اور یہی ادراک اس کا سکون چین لے اڑا تھا۔ وہ رات رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ اتنی وحشت اور بے بسی محسوس ہو رہی تھی جیسے گھٹن کے مارے دم ہی تو نکل جائے گا۔ گناز میں بہت تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ ٹریسٹ اور اجلال کی توجہ کی بدولت وہ شعور و فہم کی دنیا سے بتدریج مربوط ہوتی جا رہی تھی۔

ڈیوری کے بعد ایک ہفتہ ہاسپٹل گزارنے کے بعد جب وہ گھر آئی تو کافی حد تک نارمل دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک دو دن آرام کرنے کے بعد نئے سرے سے گھر کی سیٹنگ کی تھی۔ پردے بدلے، کٹن بیڈ کو رولف کے خلاف دھلوائے تھے۔ اجلال کے کمرے کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ اس کے وارڈ روب کو سنوارتی۔ اس کے کاغذات سمیٹ کر رائٹنگ ٹیبل پر رکھتی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتا تو بڑی خوشگوار نظروں سے دیکھ کر سلام کرتی تھی اس کے لیے چائے بنا کر لاتی تھی۔ کبھی یونہی انگلیاں مروڑتی بے وجہ اسے دیکھ کر پلکیں اٹھانے گرانے لگتی اور اجلال امتحان میں پڑ

کرتی زرگل سے کہہ رہی تھیں۔ ”فراغت کے بعد ایک ماہ تک تو ادھر ہی رہے گی گناز۔ پھر.....“  
جانے کیوں وہ کچھ کہتے کہتے ہچکچا سی گئیں۔  
”بس گناز کے آنے کے کچھ عرصہ بعد میں تمہیں رخصت کر دوں گی۔“ ماں کے حتمی انداز پر زرگل نے ایک درز دیدہ نگاہ ان پر ڈالی۔

”مگر امی! میں آپ لوگوں کو اس طرح چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔“ وہ عاجزی سے بولی۔  
”یہ موضوع زیر بحث آچکا ہے مزید کی گنجائش نہیں۔“ شائستہ نے سرزنش کے سے انداز میں کہا۔  
وہ چپ سی رہ گئی۔

”بس اب تم خود کو ذہنی طور پر تیار رکھو۔ یہ بھی دھیان میں رکھنا کہ لوگوں کی طرف سے بہت کچھ سننے کو ملے گا۔ ایک کو طلاق دوا کے دوسری کو اس سے تنہی کر دیا۔ شاید سالی اور بہنوئی کا کوئی چکر رہا ہوگا اور بھی جانے کیا کیا کہا جائے گا۔ بس تم کان لیپنے رکھنا بلکہ میں تو اجلال سے کہوں گی شادی کے بعد کچھ عرصہ کے لیے کراچی لے جائے تمہیں۔ کچھ عرصے بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو بھلے واپس آ جائے۔ ویسے تو خیر اب مجھے کسی کی پروا نہیں رہی۔ اتنا کچھ گنوا چکے ہیں..... اب اور یہ زمانہ کس شے کی بھیٹ لے گا۔ اے ہاں یاد آیا۔ اجلال کو بڑا عرصہ ہو گیا ادھر آئے ہوئے۔ گناز کیسی ہے؟ اس سے ملے تو شاید ڈیڑھ دو ماہ ہونے کو آیا ہے سوچتی ہوں اب آج کل میں ادھر ہی جا رہا ہوں ڈیوری تک ویسے تو ماسی بھروسے کی عورت ہے خیال رکھتی ہے مگر ماں کی بات تو اور ہوتی ہے۔“  
”میں کل اسکول سے واپسی پر جاؤں گی ان کی طرف۔“ زرگل کو بھی فکر ہوئی بڑا عرصہ ہو گیا تھا گناز کو دیکھے ہوئے۔

”وہ شاید کوئی علاج کرا رہے ہیں آپ کی پابندی سے ڈاکٹر کے ہاں بھی لے کے جاتے ہیں کہہ رہے تھے گناز کے لیے ماحول کی تبدیلی علاج میں خلل ڈالے گی اس لیے ادھر نہیں لاتے۔“  
”اللہ اس کو اس کی نیکی کا اجر دے بڑا بوجھ بنایا ہے اس نے میرا۔ خدا اس کا دل نہال رکھے۔ اسے دین و دنیا کی کامیابیاں عطا کرے۔“ شائستہ بہت دل سے جذب بھرے انداز میں اسے دعا میں دے رہی تھیں۔

بالآخر وہ گھڑی آن پہنچی جس کے لیے یہ حکمت عملی اپنائی گئی تھی۔ گناز کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کر دیا گیا۔ رات کے بارہ بجے آپریشن سے بچی پیدا ہوئی، مگر وہ دنیا میں سانس لینے سے قبل ہی خالق جناب سے جا ملی۔ گناز نے اپنی دیوانگی میں میزبھیوں سے گر کر چوٹ کھائی تھی۔ تین چار ماہ قبل۔ نتیجے کے طور

جاتا۔ وہ الجھ الجھ جاتا تھا۔

ڈیوری کے بعد اس کا ڈھیلا بھرا سراسر اپا ایک دم اسارٹ اور پرکشش ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنا خیال خود رکھتی تھی۔ گزشتہ چھ ماہ کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ اب اسے دیکھ کر مشکل سے ہی یقین آتا تھا کہ وہ ابنا بل بھی ہو سکتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس صبر آزمادور سے گزر کر کامیاب علاج کے بعد وہ خود کو ہلکا بھلکا اور بشاش محسوس کرتا۔

مگر وہ ایسا نہیں کر پا رہا تھا بلکہ پریشانیاں مزید بڑھ گئی تھیں۔ ہمدوم کشکش سی لگی رہتی تھی ذہن و قلب میں۔ گلناز کے رکے جھکے والہانہ انداز اور شرمائی ہوئی مختصر نظروں کا مفہوم پڑھ کر وہ اندر ہی اندر سراسیمہ ہو جاتا تھا۔ وہ شعور کی منزلیں طے کرتے ہوئے تیزی سے نارمیلٹی کی طرف بڑھ رہی تھی اور اسی رفتار سے اندر کے فطری تقاضے بھی پروان چڑھنے لگے تھے جنہیں محسوس کر کے اجلال کا دل وسوسوں میں گھرا جا رہا تھا۔

”آپ روز جلدی کیوں نہیں آ جاتے؟“ وہ اس کا کوٹ ہاتھ میں تھامتے ہوئے بڑے ناز سے مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

”میرا دل چاہتا ہے آپ ہر وقت میرے سامنے رہیں میرے پاس۔“ انداز میں اتنی سرشاری اور بے ساختگی تھی کہ اجلال پکرا کر رہ گیا۔ ایک اچھتی سی طائرانہ نگاہ اس پر ڈالی۔

سرخ لان کے سادہ سے سوٹ میں اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی سیاہ چمکدار ریشمی زلفیں ایک ادا سے دائیں شانے کی طرف مٹھی ہوئی تھیں۔ اس کا سراپا اتنا بھرپور اور پرکشش تھا کہ نظر چرانا ایک مرحلہ بن جایا کرتا تھا۔

”آپ اتنا لکھتے کیوں رہتے ہیں؟“ وہ جھٹ پٹ چائے بنا کر اس کے کمرے میں لے آئی تھی۔ وہ بیڈ پر بے ترتیبی سے دراز تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور چائے ہاتھ سے لے لی۔

”مضامین اور فچر وغیرہ لکھتا ہوں۔“ وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔

”آج آپ نہیں لکھیں گے۔“ اس نے بڑے پیار سے انداز میں معصومیت سے فرمائش کی۔

”پھر کیا کروں گا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

”مجھ سے باتیں کریں۔“ اس نے بڑے شوق آمیز انداز میں کہا۔

”میرا دل چاہتا ہے آپ سے ڈھیروں باتیں کروں ساری باتیں آپ کی باتیں لوگوں کی

باتیں۔“

وہ چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لیے جگنوؤں کی طرح چمکتی آنکھیں سامنے کی پینٹنگ پر مرکوز کیے جیسے خواب کے سے عالم میں بول رہی تھی۔ اجلال نے اس کے چہرے پر درج زندگی کے پر بہار رنگوں کی تحریر پڑھی اور پھر جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔

”اگر میں تم سے دور چلا جاؤں تو.....؟“ وہ بڑی دشواری سے اپنی پریشانی پر قابو پا کر دریافت کر رہا تھا۔

”تو پھر؟“ یکا یک گلناز کی آنکھوں میں خوف اور وحشت دوڑنے لگی۔

”تو پھر.....!“ اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی تھی۔

”تو پھر میں مرجاؤں گی۔“ وہ جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ کر ضدی پن سے اٹل لہجے میں بولی۔

اجلال کو لگا جیسے اس کی حیات پتھر کی ہو گئی ہوں۔ جسم میں گردش کرتا خون ایک لمحے کو رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چہار ہا تھا۔

”گلناز!“ وہ بیڈ پر اوندھا گر پڑا اور بھاری لہجے میں مخاطب ہوا۔ منہ تکیے میں چھپا ہوا تھا۔

”تم اپنے کمرے میں جاؤ اور دروازہ بند کرتی جاؤ۔“ وہ گہری گہری پر تش سانس لے رہا تھا۔

اسی لمحے کال بیل ہوئی اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر باہر جاتا ماسی دروازہ کھول چکی تھی اور ان کی رہنمائی میں زرگل ادھر ہی چلی آئی تھی۔

”السلام علیکم!“ اس نے وارفتگی سے بہن کی طرف دیکھا تھا۔

گلناز کچھ لمحے کو ہچکچائی اور پھر زرگل کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے گلناز کے ہونٹوں پر اپنائیت سے بھرپور مسکراہٹ چمکتی دیکھی۔ وہ دیرے دیرے اس کے قریب آ چکی تھی اور زرگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دوستانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ارے آپ! مجھے پہچانا آپ نے میں زرگل ہوں۔“ وہ والہانہ گلناز سے لپٹ گئی تھی۔

”تم اچھی لڑکی ہو۔“ گلناز نے سادگی سے کہا اور زرگل کا چہرہ جوش سے تپنا لگا۔

”آپ! امیری جان!“ وہ فرط محبت سے بہن کے ہاتھ چومنے لگی۔

اسی نے بتایا تھا کہ گلناز میں بڑی سمجھ بوجھ بیدار ہو گئی ہے۔ اس وقت اس نے اس بات کو سرسری سا

لیا تھا مگر اب اپنی نازک سی خوبصورت سی ہنستی مسکراتی بہن کو دیکھ کر جیسے آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

وہ چھ ماہ قبل ڈاکٹر شعیب کی مریضہ بنی تھی۔ یہ چھ ماہ کس قدر انقلابی تبدیلی لائے تھے اس کے اندر۔

زرگل نہال ہوئی جا رہی تھی۔

اس کی طرف سے رخ موڑ چکا تھا۔

زرگل نے ایک متوحش نگاہ اس پر ڈالی اور پھر بجلی کی سی تیزی سے اگلے قدموں اس کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی جو کہ ہے  
آسمان حد نظر راہ گز راہ گز ریشہ سے ریشہ سے

اور اب ریشہ سے راہ گز رنگ فلک  
رنگ ہے مرے دل کا خون جگر ہونے تک

چھین رنگ، کبھی راحت دیدار کا رنگ  
سر کی رنگ کہ ہے ساعت بیزار کا رنگ

زرد چوں کا خس و خوار کا رنگ  
سرخ پھولوں کے دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ

زہر کا رنگ، لہو کا رنگ، شب تار کا رنگ  
آسمان راہ گز ریشہ سے

کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ  
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو ظہور کو کوئی رنگ، کوئی رت  
کوئی شے ایک جگہ پر ٹھہرے

پھر سے ایک بار ہر چیز وہی ہو کہ جو ہے  
آسمان حد نظر راہ گز راہ گز ریشہ سے ریشہ سے

جب اس کے دل میں کسی جذبے نے کروٹ نہیں لی تھی تو وہ بارہا اس کی دیوار دل توڑنے کے لیے  
کوہ کن بن کر آیا تھا۔ بے درپے دیکھیں دے کر اپنے جذبوں کی سچائی کا یقین دلایا تھا۔ اتنا کہ وہ ناں  
ناں کرتے ہوئے بالآخر ہار گئی اور جب وہ اس کے حوالوں سے پلکوں کی منڈیروں پر خواب سجا بیٹھی تھی  
وہ بدل چکا تھا بلکہ موسم بدل چکا تھا حالات بدل چکے تھے۔

امی جنہوں نے اتنے عرصے سے اس کو اس بھندھن کا احساس دلا دلا کر بالآخر اس کے دل میں  
جوت جگادی تھی۔ آج کل اس سے نظر چرائے چرائے پھرتی تھیں۔ ابھی کل ہی چور سے انداز میں سبز

”تم بیٹھو! میں چائے لاتی ہوں تمہارے لیے۔“ وہ زرگل سے نرمی سے مخاطب ہوتے ہوئے  
کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

”اجال! آپ نے تو آپنی کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔“ وہ مسرت سے گنار چہرہ لیے آنکھوں پر بازو  
رکھے نیم دراز اجال کی طرف مڑتے ہوئے خوشی سے چور چور لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”کیا بات ہے طبیعت ٹھیک ہے؟“ اس کی خاموشی پر وہ اس کے قریب چلی آئی اور تشویش بھرے  
انداز میں آہستگی سے اس کی پیشانی چھو کر دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ابھی اس کی گداز انگلیاں اس کی  
گرم پیشانی کو مس ہوئی ہی تھیں کہ اجال نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ  
لیا۔ عجیب سی وحشت بھری پرپش گرفت تھی۔

زرگل نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر بے ساختہ جھرجھری لے کر رہ  
گئی۔ بے تحاشا سرخ بے خواب جلتی ہوئی آنکھیں عجیب سی بے قراری سے اس کے چہرے پر جمی ہوئی  
تھیں۔ ایک اجڑی سی ٹوٹی بھری اذیت بھری جارحانہ کیفیت رقم تھی ان میں۔

”کیا ہوا اجال؟“ زرگل کا لہجہ جانے کیوں کانپ سا گیا تھا۔ وہ کس طرح دیکھ رہا تھا۔ اس کی  
فولادی انگلیوں کا دباؤ اس کے ہاتھ پر بڑھتا جا رہا تھا یوں جیسے اس کے نازک گداز ہاتھ کو انگلیوں میں  
پیس ڈالنے کے درپے ہو۔

”ہاتھ چھوڑیں اجال! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ وہ اس کی خود سے بے گانہ کیفیت سے پریشان  
ہوئی جا رہی تھی۔ گناہ کسی لمحے آنے کو تھی وہ کیا خیال کرتی یوں دیکھ کر۔

”تم کیوں میری زندگی میں آ گئی تھیں۔ بولو کیوں بار بار میرے سامنے آ کر میرا سکون برباد کرتی  
ہو۔ مجھے شکستگی کا احساس دلاتی ہو کیوں میرے پہلے ہوئے دل کو پھر سے بہکا دیتی ہو مت آیا کرو  
یہاں اور کتنا امتحان لوگی۔ خدا کے واسطے میری راہوں میں آ کر مت مجھے بھٹکایا کرو اپنا بھگتان بھگتنے  
و۔“

وہ ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے بے بسی بے قراری اور عاجزی کے  
سے ملے جلے انداز میں کہہ رہا تھا۔ آنکھوں کی سرخیوں میں ہلکورے لیتی وحشت اس کے اعصاب کی  
توڑ پھوڑ کی واضح دلالت کر رہی تھی۔

”جاؤ یہاں سے“ پلینز جاؤ ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔“ وہ گلدان کو پوری طاقت سے سامنے کی دیوار  
پر مارتے ہوئے اپنی بے ترتیب حدت بھری سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بے بسی سے دھاڑا تھا۔ وہ



مسعود کی کسی جاننے والی فیملی کے پروپوزل کے بارے میں بتا رہی تھیں۔

اور وہ جو اتنی بے قراری سے اس وقت کا منتظر تھا، وہ جیسے گھر کی راہ ہی بھول گیا تھا۔

ڈیوری کے بعد پورا ایک ماہ گزر چکا تھا اور تین دن انجانے وسوسوں تلے دبے ہوئے تھے۔

ای زرگل کو مخاطب کر کے کچھ کہنا چاہتیں مگر پھر ان کے ہونٹ بھنج جاتے۔ وہ کوئی اور بات لے بیٹھتیں۔ ایک بیٹی کو آ باد دیکھنے کے لیے دوسری کا دل پر باد بھی تو نہیں کر سکتی تھیں۔

زرگل ہر روز اجلال سے بات کرنے اس کے گھر جانے کا پروگرام بناتی اور عین وقت پر نکلنے کے لیے بالکل تیار ہو کر ایک دم ارادہ بدل دیتی۔

اجلال کی نسان سنی کتنی ہی بار اس کے گھر کے آگے رکتی پھر وہ کچھ سوچ کر ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دیتا مگر تاکے۔ فیصلے کی گھڑی تو بہر حال آنا ہی تھی سو وہ آ کر رہی۔



”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے مگر آپ کے یا اپنے گھر میں یہ بات نہیں ہو سکتی۔“ اس نے فون پر کہا تھا۔

”اور وہ تیسری جگہ روز اینڈ جسمین گارڈن ہی ہو سکتی ہے۔ میں خود بھی آج تمہیں کال کرنا چاہ رہا تھا مجھے بھی ڈسکشن کرنا ہے تم سے۔“ جواب میں اجلال نے کہا۔

اور اگلے روز شام کے وقت وہ امی کو بتا کر اس کے ساتھ گاڑی میں باہر جا رہی تھی۔ آج وہ قدرے اعتماد سے اس کے ہمراہ پارک تک آئی تھی۔ اب اس سے واضح رشتہ تھا آ خر وہ اس کا بہنوئی تھا۔ جلد ہی انہیں پرسکون گوشل گیا۔

”ڈاکٹر شعیب کیا کہتے ہیں مکمل صحت یابی میں کتنا عرصہ لگے گا؟“ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بالآخر زرگل نے یہ سکوت توڑ دیا تھا۔

”انہوں نے بتایا تھا کہ گلنا ز اپنی پچھلی شخصیت بھول چکی ہے۔ ماضی کے ساتھ اس کے ذہن کا کوئی لنک نہیں رہا۔ اس کا ذہن اس وقت صاف سلیٹ کی مانند ہے جو پرنٹ کریں گے وہی سمجھ لے گی۔ ظاہر ہے شخصی تشکیل سازی کا یہ کام بدترج طے پائے گا۔ خاصا وقت درکار ہوگا اسے پوری زندگی کے ہر پہلو سے باخبر اور مختلف افعال میں حصہ لینے میں۔“

وہ طویل سانس لے کر آہستہ آہستہ بتاتا رہا۔

”ہوں اس کا مطلب ہے بالآخر وہ شعور کی سطح کو پہنچ گئی ہیں۔ یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔“ وہ

دبچے ہوئے خوشگوار انداز میں بولی۔

اجلال نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”وہ کیا بات تھی جو تمہیں کہنا تھی؟“

اجلال کے پوچھنے پر ایک لمحہ کو زرگل کے دل کی دھڑکنیں ختم ہی گئیں۔

”آپ نے بھی تو ڈسکشن کرنا تھی پہلے آپ کہہ دیں۔“

وہ جانے کیوں پہلو بچا گئی تھی کہ کچھ لمحہ اور خوش رنگ خواب کی سرزمین پر رہنا چاہتی تھی۔

”میں کہہ تو دوں مگر کیا تم سننے کی تاب لا پاؤ گی؟“ پھر وہی جواب، وہی جملہ وہی لہجہ کی معنویت مگر

نداز اور تیور گرد حوادث سے بوجھل اور تھکے تھکے تھے۔ وہ مخصوص شوخی، شرارت اور زندگی کے رنگوں

سے بھر پور تاثر جیسے کہیں کھو سے گئے تھے۔ زرگل نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو نظر

لا جانے کس کاٹ ڈالنے والے تکلیف دہ احساس نے زرگل کی آنکھوں میں نمی سی چکا دی مگر یہ

مرف لگاتی کیفیت تھی۔ وہ نمی پلکوں تک پہنچنے اور چمک کر باہر آنے سے پہلے ضبط کی تہہ میں جا چھپی

تھی۔ آہستگی سے نظر چرا کر بالا خر وہ کہنے لگی۔

”اجلال! کچھ عرصہ قبل آپ نے پہاڑ جتنے طرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری بات کا بھرم رکھنے

کو آپ کی کو ایسی حالت میں اپنایا تھا جس میں ایک ہوشمند لڑکی کو بھی موت کے سوا کوئی قبولے کو تیار نہیں

ہوتا۔ اگر آج میں دوبارہ یہ درخواست کروں کہ آپ کے ماضی کے آلودہ لمحوں سے قطع نظر اسی ظرف

کے ساتھ انہیں موجودہ حالت میں ہمیشہ کے لیے اپنالیں تو کیا آپ میری بات پر غور کر سکتے ہیں؟“

وہ سر جھکائے پوری طاقت صرف کر کے بمشکل تمام بات پوری کر سکی تھی اور اب اس طرح تیز تیز

سانس لے رہی تھی جیسے طویل فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔ ویسے اس میں شک بھی کیا تھا۔

جواب میں اجلال کے ہونٹوں پر ایک پھٹکی سی اداس مسکراہٹ درآئی۔

”میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔ ماسوائے اس کے کہ

موت بھی ضروری ہے

زندگی بھی پیاری ہے

فاسلوں سے جوئے میں

میں نے شام ہاری ہے

میں نے ایک بار تم سے کہا تھا کہ صرف دل کے محاذ پر تم سے بارہا ہوں اس کے علاوہ زندگی کے کسی

اؤں گی۔ یہ سنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ وہ لہجے کو عام اور بشاش سارنگ دینے کے لیے بڑی جھد کر رہی تھی مگر لہجے میں پھسلتی، ٹوٹی آنرڈگی جیسے اس کی کوششوں کو ناکام بنائے جا رہی تھی۔  
 ”تم کیا کرو گی زرگل! آگے کیا ارادے ہیں۔“ وہ اس کی بات نظر انداز کر کے یک دم پلٹ کر کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”امی بتا رہی تھیں مسز مسعود کے توسط سے کوئی پروپوزل آیا ہوا ہے۔“  
 اجلال کے ست پڑتے بے جان لہجے میں چھپا استفسار وہ سمجھ گئی تھی۔ خود کو لا پرواہ ظاہر کرنے کے بندھے اچکا کر بولی۔

”وہ بعد کی بات ہے۔ ابھی میں کچھ عرصے سکون کی ٹھنڈی گہری آزاد نیند لینا چاہتی ہوں۔  
 تھک گئی ہوں۔ کچھ لمحے آزادی سے سستا نا چاہتی ہوں۔ خود سے خود کو نئے سرے سے جوڑنے لیے وقت کے کچھ لمحے چرانا چاہتی ہوں۔“

وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں بے اختیاری کے عالم میں دھیرے دھیرے خود دکھائی کر رہی تھی۔  
 ل نے کچھ بے چین ہو کر اسے دیکھا پھر دوبارہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔  
 ”اور کچھ نہ سہی زندگی کی ایک شام تو اپنے دل کے نام کر سکتا ہوں۔ میں یہ لمحے تمہارے سنگ بتا یاد کے کچھ حسین موتی چننا چاہتا ہوں۔“

”میری خواہش ہے اور دلی دعا ہے کہ آپ جسم و جان اور روح و دل کے تمام تر لوازمات سمیت  
 اکانفسب بنیں۔ خالی وجود کتنے عرصے تک بقا کا ایندھن ثابت ہو سکتا ہے۔ زندگی کی امنگ بیدار  
 نے کے لیے دل کی سرزمین بھی درکار ہوتی ہے خدا کرے آپ اس تک بھی رسائی پالیں۔ آپ پلیز  
 لکھا یہاں سے۔ میں ایک شام کا قرض بھی اپنے ذمے نہیں رکھنا چاہتی پلیز۔“

وہ جلد از جلد اسے یہاں سے رخصت کرنا چاہتی تھی۔ ڈر تھا کہ کہیں اس کے لہجے اور آنکھ سے  
 لپ پڑنے والی کریناک پکارا اجلال کے حوصلوں کی چٹان میں دراڑ ڈالنے کا باعث نہ بن جائے۔  
 اسے پہلے وہ اسے نگاہوں سے ادجمل دیکھنا چاہتی تھی۔

”جائیں ناں۔“ اسے خاموشی سے خود پر نظر جمائے کھڑا دیکھ کر وہ منت اور عاجزی سے دوبارہ  
 بولی۔

اور اس کا جانا طے تھا کہ وہ اس کے ہمراہ گزرنے والی زندگی کی ہر شام پار چکا تھا مگر یہ وہ بار تھی جو  
 نہیں نے بخوشی اپنے لیے تجویز کی تھی۔ اس جوئے میں کون ہارا کون جیتا۔ یہ سوال اضافی تھا۔

محاذ پر ہار نہیں مانی اور اب زندگی کی ایک شام بھی نہیں ہار سکتا۔ جس وقت میں نے یہ کہا تھا اس وقت  
 یہی خیال تھا کہ محض چند ماہ کا فاصلہ ہے وصل کے بچے یہ خبر نہیں تھی کہ فاصلوں کی یہ مدت تمام عمر پر مویا  
 ہو جائے گی۔ ہار تو میں اسی شام گیا تھا۔ تقدیر کے فیصلے کے ہاتھوں۔ مگر اس کا ادراک مجھے تب ہوا جب  
 گلناز میری توجہ اور تعلق کے طفیل مجھ سے امید باندھ بیٹھی۔ بہت دن کشکش میں رہا، تمہیں کھونے کا  
 تصور کیسے کر سکتا تھا جسے پانے کے لیے میں نے آزمائش کے اس پل صراط کو عبور کرنا گوارا کر لیا تھا  
 منزل پہ پہنچنے کے بعد بے نمل و مرام رہنا کون پسند کرتا ہے۔ ایک طرف میرا دل تھا جذبے تھے برسوں  
 کی تھکن اور پیاس تھی اور دوسری طرف گلناز کا پر امید چہرہ جس کی زندگی کا انحصار میرے وجود کی  
 صورت میں دلائے گئے اعتبار پر تھا۔ اس کی موجودہ کیفیت اس کی آئندہ زندگی کا خیال اس کی ذہنی  
 حالت اور مجھ سے شدید جذباتی وابستگی کا کھلم کھلا اظہار سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہونے لگا لیکن پھر  
 بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ ہی گیا۔ کسی کی زندگی بچانا، اپنا دل بچانے کی نسبت زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ سو  
 میں نے گلناز کی زندگی بچانے کے لیے اپنا دل اور اس کی خواہش گنوا دی۔ تم نے تو آج درخواست کے  
 سے انداز میں کہا ہے مجھ سے اگر اسی سابقہ دھونس بھرے چیلنجنگ انداز میں کہیں تو برسوں چشم مان لیتا۔  
 ایک بے معنی سی آرزو مسکراہٹ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر جھلکی تھی۔

”میرا آج شام گلناز کے ہمراہ مسجد کے مولوی صاحب کے پاس جانے کا پروگرام ہے تاکہ نکاح کی  
 رسم ادا کر کے پوری ایمانداری کے ساتھ اسے اپنا آپ سوئپ دوں۔ وہ اب تک میرے اور اپنے  
 درمیان استوار رشتے کی نوعیت سے بے خبر ہے میں نے بھی اسی لیے نہیں بتایا کہ رسم پوری کرنے کے  
 بعد اس وقت عملاً اسے اس رشتے سے روشناس کرواؤں گا جب شرعی اعتبار سے اس کا اہل ہو جاؤں گا۔  
 اس کے حساب سے آج ہی میاں بیوی بنیں گے۔“

”بہت اچھا اور نیک ارادہ ہے آپ کا خدا آپ کو آپ کے مقدمہ میں کامیاب کرے۔“  
 بڑی کوشش کے بعد دل کو منا بہلا کے وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رنق لاپاتی تھی مگر اس تبسم کی ویرانی  
 اور کھوکھلا پن چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔

”ہاں اب تو یہی دعا کرنا کہ جتنے ظرف اور حوصلے سے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اتنی ہی مضبوطی سے اس پر  
 قائم رہ سکوں۔“ وہ آسمان پر ڈھلتے سورج کی بکھری نارنجی شفق رنک کرنوں پر نظر جمائے بھینچے بھینچے انداز  
 میں بولا۔

”شام تو ہو گئی ہے آپ جائیں اب آپ کی آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں تھوڑی دیر بعد

اجلال نے آخری الوداعی نگاہ اس پر ڈالی۔

نگاہ جوتنگی، آرزو اور دل کی گرفتاری کا مظہر تھی اور پھر وہاں سے چل دیا۔

زر گل اسے جاتا دیکھتی رہی، دیکھتی رہی حتیٰ کہ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اجلال کا ہر اظہار

قدم اسے اس سے دور لے جا رہا تھا اور اس بات کا واضح عکاس تھا کہ

فاصلوں کے جوئے میں

میں نے شام باری ہے

اور گرد و سورج کی تاریکی ملگجی کرنوں نے عجب ساساں باندھ رکھا تھا۔ درختوں میں گم ہوئی شفق رنگ

کرنیں کتنی مضحل اور بے جان سی محسوس ہو رہی تھیں۔ سورج کوئی دم جاتا تھا غروب ہونے کو تھا۔

بے جان سے انداز میں آلتی پالتی مارے گھاس پر بیٹھی اپنی خالی مٹھیوں کو تک رہی تھی۔

صفحہ دہر پہ کرب کی

خونچکاں آیتیں ثبت تھیں

اور میں پڑھ رہا ہوں انہیں

میں نہ پیغمبر نہ میں فلسفی اور نہ میں دیوتا

ان کی تعظیم کرتا ہوں جو زندگی کی اور روشنی کے لیے

مر گئے اور مرجائیں گے

میرے احساس کی آنکھ پتھر اچلی

زندہ الفاظ کے درد میں

اس سے پہلے کہ سارا بوجھ کھینچ لے

مرگ آثارِ سفاک، ظالم ہوا

اے خدا اے خدا

آ میرے دکھ میں کچھ تو بھی حصہ بنا



کیوں زندگی کی راہ میں مجبور ہو گئے

اتنا ہوئے قریب کہ ہم دور ہو گئے

یہ تو نہیں کہ ہم کو کوئی بھی خوشی نہیں

لیکن یہ زندگی تو کوئی زندگی نہیں

کیوں اس کے فیصلے ہمیں منظور ہو گئے

پایا تمہیں تو ہم کو لگتا تم کو کھودیا

ہم دل پہ روئے اور یہ دل ہم پہ رو دیا

پلکوں سے خواب کیوں گرے کیوں چور ہو گئے

کیوں زندگی کی راہ میں مجبور ہو گئے

کس قدر برجستہ بول تھے۔ وہ گلوکار کی آواز میں جیسے کھو کر رہ گیا۔ پھر جونہی گانا ختم ہوا اس نے

اپنے ساتھ والی سیٹ کی طرف دیکھا۔ خوشیوں سے بھیگے چپکتے دھکتے رنگوں سے بھرپور سراپا گلناز بڑے

برشوق انداز میں گاڑی کے شیشے سے باہر بھاگتی دوڑتی چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ اجلال کے احساسات

میں غیب سا بھونچال اٹھنے لگا۔

”شٹ“ اس نے نچال دانتوں تلے دبا کر کیسٹ پلیئر میں سے کیسٹ باہر نکال کر ایک لمحے کو

کچھ سوچا۔ اور پھر پوری قوت سے وہ کیسٹ باہر اچھال دیا۔

”تم خوش ہونا گلناز؟“ گھر کے آگے گاڑی روکتے ہوئے وہ لہجے میں بشتا بھر کے پوچھ رہا تھا۔

”گلناز کی رسم ادا کرنے کے بعد گھر آئے تھے۔“

”اب تم ہمیشہ اسی گھر میں رہو گی میرے پاس۔ اب تو تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے ناں۔“ وہ بہت

دلچسپ انداز میں دریافت کر رہا تھا۔

گلناز نے حیا آمیز انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر اس خوشی کا اظہار کرو بابا۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”کیسے؟“ وہ جھپکتے، کترائے انداز میں خوشی سے چھلکتے لہجے میں آہستگی سے منمنائی۔

”میں کیا جانوں۔“ اس نے شوقی سے کندھے اچکائے۔

”میں کچھ دیر کے لیے میز پر جا رہا ہوں جب تک تم سوچ لو۔“

اور اب میز پر بے چین قدموں سے ٹپکتے ہوئے وہ بے قرار سوچوں سے نبرد آزما تھا۔

محبت ایک عالمگیر جذبہ ہے۔ یہ حدود کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ سمندر کی طرح لامحدود اور بیکراں ہوتا

ہے۔ روپ بدل لیتا ہے مگر تاثیر نہیں بدلتا۔ محبت کی معراج انسانیت ہے اور انسانیت تو وہ مقام ہے

جس پر پہنچنے کے لیے فرشتے اڑیاں رگڑتے ہیں۔ آدمی محبت کرتا ہے مگر جب وہ آدمی سے انسان کے

مرتبے پر پہنچ کر محبت کرتا ہے تو اس کی انتہا کل عالم کے لیے خیر کی گھٹا بن کر سب کو سیراب کر سکتی  
خواہش کی سرحدوں تک پہنچ جاتی ہے۔  
بالآخر وہ فیصلہ کن انداز میں نیچے آیا اور اپنی وارڈروب کے نچلے خانے سے ایک پیکٹ نکال کر  
کھولتے ہوئے گھناز کو پکڑا لیا۔

بہت خوبصورت، جھلمل کرتا عروسی جوڑا اس کے سامنے تھا جسے اجلال نے کچھ عرصہ قبل بڑی چار  
سے زرگل کے لیے خریدا تھا۔ ساتھ میں سونے کا نازک سائیٹ بھی تھا۔ راتوں کی تنہائیوں میں وہ چہرہ  
تصور سے کتنی ہی بار زرگل کو اس جوڑے میں ملبوس اس کے لیے اپنا روپ سجائے اپنے بیدروم میں ادھر  
ادھر آتے جاتے شرماتے، مسکراتے دیکھا کرتا تھا۔

گھناز نے بنا کچھ پوچھے حجاب آمیز شوق لیے پیکٹ اس سے لے لیا اور ڈیرنگ روم میں چلی گئی۔  
وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے چہرے پر تفکرات کے سائے کے لیے گہری سانس بھرتے ہوئے  
آنکھیں موند کر ایزی چیئر پر دراز ہو گیا۔ جانے کتنی ساعتیں یونہی بیت گئیں۔ خبر ہی نہ ہوئی کب گھناز  
اپنا روپ سجا کے ڈیرنگ روم سے کمرے میں داخل ہوئی اور کب اس کے قریب آئی۔ پرفیوم کی سحر  
کن خوشبو کے احساس نے یک دم اسے چونکا دیا تھا۔ آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔

گھناز اس کے بالکل سامنے کھڑی ہوئی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے جھینپے جھینپے انداز میں  
مسکرا رہی تھی۔ اس کو آنکھیں پنیپاتے دیکھا تو بے ساختہ ہنس دی۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق اپنی  
خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

وہ بھی آہستگی سے مسکرا دیا اور اپنے کندھے پر رکھے سفید گداز مخرومی ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ کی پناہ  
بخشتے ہوئے ”وفاداری بشرط استواری“ کا پہلا سبق گھناز کو پڑھانے لگا۔

## چلو زندگی کو محبت بنا دیں

”چلو زندگی کو محبت بنا دیں۔ چلو زندگی کو  
چلو زندگی کو محبت بنا دیں۔  
چلو زندگی کو.....“

**حسب** عادت دو دو تین تین سیرھیاں اکٹھی پھیلا لگتے ہوئے گنگناتی ہوئی وہ اپنی دھن میں گمن  
نیچے آ رہی تھی۔

”اے ہے۔ میں کہتی ہوں جیلہ نے آخر کس چیز کا بدلہ لیا ہے مجھ سے جو یوں بھاڑ سے دھڑلے سے  
رشتہ مانگنے چلی آئیں۔“

نیچے چچی فرحت ماتھے پر سوتیوریاں لیے انتہائی بگڑے انداز میں امی کو سنارہی تھیں۔  
”بندے کو کچھ لحاظ کوئی حجاب بھی ہونا چاہیے۔ میں کہتی ہوں، کس منہ سے کہہ دیا اس نے سارہ



کے رشتے کے لیے۔ حیاتونہ آئی۔ سارہ آخراں کی بھی بہتی ہے۔ اس کی اپنی بھی تو بیٹیاں ہیں۔ ایکسہ دوپوری چار۔ ان کو بھی پرانے گھر بھیجنا ہے۔ کیا ان کے لیے ایسے دیے رشتوں کو گھاس ڈالے گی؟ اس طرح کے لڑکے ڈھونڈے گی؟ لو بتاؤ۔ کہتی ہیں محترمہ کہ خدا ترسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آخر حماد میں کون شے کی کمی ہے۔ اب تو برس روزگار ہے۔ دیکھنے میں بھی ماشاء اللہ اونچا پورا ہے۔“

چچی جیلہ تانی کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے یہ کہہ رہی تھیں۔ اُن کی اپنی شکل اس کوشش میں المیہ عجیب سی بن گئی تھی کہ تمشیں کوئی الواقعہ منی پر قابو پانے کے لیے خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔

”میں کہتی ہوں یہ دودن میں وہ ہر لحاظ سے اچھا ہو گیا۔ ساری کی کچی جاتی رہی اور کل تک جب اس کو اپنی جوتیوں اور کوسنوں کے نیچے رکھی تھیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دن میں ہزار بار جھولی بھر کے اس کو اور اس کی ماں کو بددعائیں دیتی تھیں۔ اس کی شکل یہ تو تھوکنہ بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ آج اس کا بیٹا بن گیا اور چلی آئیں بیٹے کا رشتہ لے کر میری بیٹی کے لیے۔“ چچی فرحت مارے طیش کے ہانپنے لگی تھیں۔

”میں کہتی ہوں اُسے۔“

”آئے ہائے“ چچی جانی کو کیا ہو گیا۔ جو آج آپ کے زیر سایہ زمین میں یہ آسمان کانپ اٹھے ہیں۔ یہ تھانیدارانہ تقشیشی انداز تو آپ کی عادت ہے مگر آج تو ایسے جلال میں ہیں کہ گردوں کو پسینہ آئے۔“ تمشیں ان کے پاس بیٹھ کر چہرے پر خوفزدہ سی کیفیت طاری کر کے درحقیقت مزا لیتے ہوئے دریافت کر رہی تھیں۔

”ارے ہونا کیا تھا۔ وہ تمہاری تانی جیلہ سارہ کا رشتہ مانگنے آئی تھیں آج حمزہ کے لیے۔“ چچی نے حماد کو یوں دانت پیس کر ادا کیا کہ کایا جیج ہی موصوف دانوں کے نیچے آ گئے ہوں۔

”اچھا۔ تمشیں حیران تو تھی مگر اتنی زیادہ نہیں۔“

”بھلا بتاؤ وہ ہے اس قابل کہ میری سارہ کا جوڑ بن سکے۔“ چچی کے لہجے میں نخوت تھی۔

”کیوں کیا ہوا اس بے چارے کو۔“ تمشیں بی بی کو ویسے تو حماد رضوی کی رتی بھر پروا نہ ہوتی تھی زندگی بھر اس وقت یونہی تسلسل میں پوچھ بیٹھی۔

”اے لو۔ اور سنو۔“ چچی فرحت کو پتنگے لگ گئے۔ ”میں کہتی ہوں کہ لڑکی کچھ ہوش کے ناخن لے لو۔

ارے کہاں سارہ کہاں حماد۔ ہماری اونچی کھری سٹھری علاؤات اور حماد کی ماں۔ ہونہہ۔“

چچی کا چہرہ تنفر و تحقیر اور تمسخر کے جذبات سے سکر سا گیا تھا۔ تمشیں کوئی الواقعہ سخت برا لگا۔ ”خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ نسل تو باپ سے ہی چلتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ وہ تیا جان بیٹا ہے۔ ان کا خون۔“

”میں کہتی ہوں لڑکی خواہ مخواہ منہ کو نہ آؤ۔“ چچی فرحت اس کا جھگڑا نہ کر پائیں قدرے آتش زیر پا رہیں۔

”آپ تو کہتی ہی رہتی ہیں۔ کب چپ ہوئی ہیں“ اس نے لا پرواہی سے پیشانی کے بال پرے رتے ہوئے کہا۔ ”ویسے کس نے نام رکھ دیا تھا آپ کا یہ ”عکس برعکس“ قسم کا۔“ اس کے لہجے میں زیر شرارت تھی۔ چچی کا چہرہ آتش فشاں بننے لگا۔

”کیا بے کار کی بحث میں لگی ہوئی ہو۔ جاؤ۔ اپنی چچی کے لیے چائے بناؤ۔“

عالیہ بیگم فطرتاً صلح جو اور امن پسند کم گوی خاتون تھیں۔ ویسے ہی لڑائی جھگڑوں اور بحث و مباحثہ سے گریزاں رہتی تھیں۔ پھر اخلاق و مروت اور لحاظ میں بھی پورے خاندان میں سراپا مثال سمجھی جاتی تھیں۔ لہذا دیورانی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بروقت انہوں نے بیٹی کو نوک کر منظر سے ہٹانے کا سامان

ڈھونڈا کہ بہر حال بیٹی میں ان کے مزاج کے براہیم نہایت قلیل مقدار میں منتقل ہوئے تھے۔ ”بہت بے لگام ہوتی جا رہی ہے۔ سمجھا کے رکھا کرو آگے یہ چرب زبانی کام نہیں آئے گی۔“ چچی بری طرح تپ کر عالیہ بیگم سے کہہ رہی تھیں۔

”دیکھئے چچی! آپ ذاتیات پر اتر رہی ہیں۔“ وہ بھی کون سا کم تھی۔

”میں نے کیا کہا ہے؟“ عالیہ بیگم نے اب کے گھور کر دیکھا۔ وہ بادل نخواستہ اٹھ گئی۔

”میسنی، گھنٹی، چالاک تو دیکھو۔ مجھے پرچار ہی تھی۔ بڑی اچھی جاب پر لگ گیا ہے۔ کھلا کما تا ہے۔ سرکاری کوٹھی بھی ملی ہوئی ہے۔ گاڑی بھی لے لی ہے۔ گھر بھی سنبھالا ہوا ہے۔ یہ ہے وہ ہے۔ ارے شرم تو نہیں آتی، ابھی دو سال پہلے تک تو یہی ملعون بد ذات اور بیچ تھا اب یہ ”بیبا“ ہو گیا۔“ فرحت چچی اپنی سابقہ ”لے“ میں لوٹ آئی تھیں۔

وہ ٹھٹھک کر دروازے پر رک گئی۔

”چلیں چھوڑیں۔ آپ سیدھا سیدھا انکار کہلا دیں قصہ ہی ختم۔“

عالیہ بیگم نے نچلے سے انہیں مسکے کا حتمی صل بتایا۔ ”وہ تو میں نے کر دیا تھا۔ اسی وقت منہ پر ہی۔ لو بھٹا

تمہارا کیا خیال ہے۔ میں چپ سا دھسے سنتی رہتی۔“ چچی نے فٹ سے جواب دیا تھا۔

”بھلا ایسی توقع کی جا سکتی ہے آپ سے؟“ وہ رہ نہ سکی تھی۔

چچی فرحت نے گردن موڑ کر میز پر آنکھوں سے اسے دیکھا اور نئے سرے سے آگ بگولا ہو گئیں۔

”لڑکی! تم نے آج ضرور مجھ سے کچھ سننا ہے۔ میں کہتی ہوں یونیورسٹی میں پڑھنے کا یہ مطلب تو

نہیں کہ ادب لحاظ ہی ختم ہو جائے۔ ایسی تعلیم سے تو جہالت لاکھ درجے اچھی ہے۔ میں کہتی ہوں عالیہ۔“

”ارے براے خدا آپ آگے کچھ نہ کہئے۔ میری معصوم سی اماں کو پٹی نہ پڑھائیے ہم تسلیم کی خود ا

لیتے ہیں۔ مجال ہے جو یہ نکتہ اعتراض اٹھاؤں۔“ وہ لکھت پیٹر ابدل گئی تھی۔

”تمشی! میں نے تمہیں کیا کہا ہے۔“ اس بار عالیہ بیگم سچ مچ غصے میں تھیں۔

”جاری ہوں جاری ہوں۔ بلکہ یہاں سے ہی جاری ہوں۔ نیلو کے پاس“ وہ کہہ کر چھوٹی چچی کے

پورشن کی سمت آ گئی۔

”نیلو کہاں ہے بھابی! آئی نہیں آفس سے؟“ سلام دعا کے بعد اس نے ارم بھابی سے دریافت کیا

تھا۔

”آچکی ہے۔ کب کی۔ شاید کمرے میں ہے“ بھابی شام کے لیے سبزی بنانے میں مصروف تھیں۔

”اچھا جلدی نہیں آگئی آج۔“ وہ اٹھ کر کمرے کی سمت بڑھی تھی۔

بیڈ کے پیچھے دو نوں ہاتھوں کا نکیہ بنائے جو نوں سمیت بغیر چیخ کیے دراز وہ سیدی چھت کو گھور رہی

تھی۔ آہٹ پر چونکی ضرور مگر صرف نظروں کو زحمت دی پوزیشن تبدیل نہیں کی۔

”آئیے جناب!“

”کیا بات ہے۔ بڑی تھکی تھکی لگ رہی ہو؟“ تمشیں نے اس کے تساہل آمیز لہجے پر غور سے اسے

دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں۔ کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔“ وہ اٹھ بیٹھی۔

”تو پھر عام ہی بتا دو۔“ تمشیں سائیڈ ٹیبل سے رسالہ اٹھا کر یونہی ورق الٹتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تجھے تو پاگل بنا دیا ہے ناں جناب ستار نے اور اس کی عبادت گزاری نے۔ ہائے کہاں وہ محتر۔ نیلو

فیشن میوزک، مودی کی دلہ ادھ اور کہاں یہ نمونہ۔“

”بکو اس نہیں۔“ نیلو نے جھڑکا۔ ”زندگی تمہاری غرغ صرف ہی ہی ہا پیر مشتمل نہیں ہوتی۔ زندگی کا

اصل روپ دیکھو تو آنکھیں کھلیں۔“

”جس طرح تمہاری کھلی ہیں۔ اور بائی داوے آنکھیں کھلنے کی تاریخ نوٹ کر لی تھی؟“

وہ مسلسل مائل بہ شرارت تھی۔

”تمشی۔“ نیلو زچ ہو گئی۔ ”مجھے تنگ کرنا ہی مقصود ہے تو اپنی تشریف لے جاؤ یہاں سے“

”ارے بھی سینئر ہوں گے وہ تمہارے۔ میرے کیا لگتے ہیں۔ جواب آداب ملحوظ خاطر رکھوں۔ ہا

ن مستقبل میں جب جائز رشتے سے بندھ جائیں گے تب ضرور۔“

اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ نیلو نے ایک ساتھ دو کوشن اس کی سمت اچھا ل دیئے۔

”تم حد سے زیادہ بدتمیز ہو۔ شرم تو نہیں آتی میں ان کی صرف عزت کرتی ہوں۔“

”تم تو کہہ رہی تھیں تمہیں اچھے لگتے ہیں وہ۔“

”ہاں تو اچھا بندہ کسے برا لگتا ہے۔ پھر وہ تو دیسے بھی بہت ناکس بہت ڈینٹ ہیں۔ اتنی بھر پور اور

سور پر سنائی کے مالک ہیں“ نیلو کی آنکھوں کی چمک دو چند ہو گئی تھی۔ تمشیں بغور اس کے چہرے لہجے

اور آنکھوں کے تاثرات پڑھ رہی تھی۔

”ہمارا معاشرہ خوف کی قید میں بند لوگوں کا معاشرہ ہے۔ سچ بھی بولتے ہیں تو لبادوں میں چھپا کر

کہیں یہ سچائی سزا کی صلیب تک نہ لے جائے۔ یہ تم جو ہمہ وقت اخلاق و مروت کے رنگوں میں سجا کر ان

کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرتی رہتی ہو۔ کیا سمجھتی ہو ان کے پیچھے آگے من پسند جذبوں کے جنگلوں

سے اٹھتی خوشبوئیں محض تم تک ہی محدود رہتی ہوں گی۔“

تمشیں نے کچھ اس انداز میں اس کا گھیراؤ کیا تھا کہ پانسا پلٹنے کی سوچ نیلو کے اندر ہی دم توڑ گئی تھی۔

وہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تمشیں! پلیز وہ راہیں نہ دکھاؤ جہاں منزل پہ صرف تاریکی منتظر ہوتی ہے۔“ نیلو کی آواز کانپ رہی

تھی۔

”اس راہ میں دیکھنے دکھانے کے زمانے کہاں آتے ہیں؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے ہاں، تمہیں اس وقت زبردست سین دیکھنے کی خواہش محسوس ہو رہی ہے؟“ وہ ایک دم جیسے

نئے سرے سے ”الائیو“ ہو گئی تھی۔

”کیا مطلب؟“ نیلو نے الجھن بھری نظروں سے دیکھا۔

جواب میں تمشی نے ابھی کچھ دیر پہلے کے واقعے کو بمعہ چچی کے صوت و ساختی تاثرات سمیت بیان کر ڈالا۔ نیلو بھی خاصی متعجب تھی۔

”جیلہ تائی میں اس بے چارے کے لیے کہاں سے ہمدردی کے سوتے پھوٹ پڑے؟ اور فرحت چچی کا رد عمل بھی خاصا حیران کن ہے۔ اس میں اتنا سنجہ پا ہونے کی کیا ضرورت تھی آخر؟“

”بھی تھی ناں! ایک ایسی ہستی انہیں بطور داماد پیش کی جا رہی تھی جس کا وجود پچھلے پچیس سالوں تک اس گھر میں اتنا ہی بے کار رہا ہے جتنا کہ اسٹور میں رکھی ہوئی بوسیدہ اور بے مصرف چیزیں۔ اس بدھو بے زبان اور نشست و برخاست کے مروجہ اصولوں سے عاری مسکین سے خمد سے بندے کو اپنی لاڈلی سارہ کے سرتاج کے روپ میں برداشت کیسے کر سکتی تھیں وہ“

”مگر انکار کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ چچی تو یوں مشتعل ہوئی ہیں گویا کسی آوارہ نکھو اوباش قسم کے لڑکے کا رشتہ آ گیا ہو۔ ٹھیک ہے نہیں پسند تو نہ سہی۔ سیدھی طرح انکار کر دیں۔ یوں خواخواہ اگلے پچھلوں تک پہنچنے کی کیا ضرورت ہے۔“ نیلو کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”ویسے دیکھا جائے تو اپنی سارہ بی کے لیے بندہ بالکل موزوں ہے۔“ ایک لچلے کو سوچ کر تمشیں نے کہا۔

نیلو کی سوالیہ نظروں نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔ ”وہ کیسے؟“

”بھی سارہ اتنی خیر ملی، تک چڑھی مغرور اور حاکمانہ طبیعت کی ہے۔ اپنی اماں جانی کی طرح کہ اس کے لیے صم، بکم، قسم کا میاں ہی مناسب ہوگا۔ جسے دین دنیا کی کچھ خبر نہ ہو۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ نہ آدھی کا حصہ دار نہ پوری کا دعوے دار۔ کسی نے پوچھا تو جواب دیا ورنہ ہفتوں آواز نہ سنائی دے۔ نہ کسی نقصان کرنے جوگا نہ کسی کو دھوکا فریب دینے کا ڈھنگ جانتا ہے کسی نے دے دیا کھانے کو تو کھالیا نہیں تو برس بیت جائیں گے مانگے گا نہیں۔ انتہا سے زیادہ سادہ، ٹھنڈا مزاج والا اللہ لوک بندہ۔ اور یہ ساری خصوصیات حماد رضوی میں الف سے لے کر یے تک موجود ہیں۔“

اس نے بڑی تفصیل سے حماد رضوی کی شخصیت کا تجزیہ کیا تھا۔

”کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ سارہ کے ساتھ تو ایسا ہی کوئی بے چارہ بھولا بدھو اور بے زبان گزرا کر سکتا ہے۔“

”اور اس طرح بے چارے حماد کا بھی بھلا ہو جائے گا۔“ تمشیں نے نیلو فرکی تائید کی۔ ”ورنہ اسے

کون دینے لگا اپنی بیٹی بھائی ہوش و حواس میں۔“ آخر میں وہ ہنس پڑی تھی۔ ”عجیب ہونق سی مسکین سی بے بس سی شخصیت ہے کہ خواخواہ ہی غصہ آنے لگتا ہے اس پر سب کو۔ حالانکہ اس کا کوئی قصور بھی نہیں ہوتا مگر سب آرام سے اپنی بے بسی کا بدلہ اس سے لیتے ہیں اپنی مانوبی سے تو زیادہ بے ضرر ہے نہ کچھ کہتا ہے نہ اقرار کرتا ہے نہ انکار۔ عجیب مست مولا چیز ہے بے چارہ۔“

”جیلہ تائی کی ”کارکردگی“ اور ”محنت“ کا نمونہ ہے۔ آخر انہوں نے بنایا ہے اپنی جان جھوکوں میں ڈال کے پال پوس کے جوان کیا ہے۔ پھل دار بن گیا تو اب رس نچوڑنے کو کھونٹے سے باندھنے کا خیال آ گیا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد۔“ نیلو کے لہجے میں طنز تھا۔

”تایا جان کی وفات نے آنکھیں کھولی ہیں ان کی“ تین بیٹیوں کا بوجھ ہلکا کرے گا۔ سو تیل ہی سہی بیٹا تو ہے ناں۔ اچھا یار میں چلوں۔ امید ہے چچی جلاہا اپنی فرحت انگیز باتیں امی کے کانوں میں انڈیل کر رخصتی کے لیے پرتول چکی ہوں گی۔“

وہ سیلپر پاؤں میں اڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔



”میں کہتی ہوں کوئی کسر رہ گئی تھی۔ کتنا لحاظ کتنا ضبط کیا ہے اس کے بڑے پن کا“ مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں عزت راس نہیں آتی۔“ تیکھی نظروں سے گزے تیور لیے چچی فرحت تائی جیلہ کو گھورتے ہوئے عالیہ بیگم سے مخاطب تھیں۔

تائی جیلہ کے تو تلووں سے لگی اور سر پر بھی۔

”ارے بہت دیکھے ہیں تمہارے جیسے عزت کے نام نہاد دعوے دار۔ اتنا غرور کا ہے کا ہے؟ کیوں“ ات“ بچائی ہوئی ہے۔ رشتہ ہی تو لائی تھی۔ نہیں تو نہ سہی۔ ایک سے ایک اچھی لڑکی موجود ہے میرے بیٹے کے لیے۔“

”بیٹا“ چچی نے تسخرانہ لہجے میں کہہ کر تائی کو طنز ادا کیا تھا۔

”آئے ہائے۔ سن لو عالیہ بیگم! آج وہ بیٹا ہو گیا۔ کل کا طوائف زادہ۔“ چچی ٹھٹھا مار کر عالیہ بیگم سے مخاطب ہوئیں۔ ”کل جس کی شکل دیکھ کر تمہارے دل پہ آ رہے چلنے لگتے تھے۔ بس نہیں چلتا تھا چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دو۔ جس پہ ظلم و ستم کے سارے پہاڑ توڑ ڈالے۔ جلا دھستی اور سفاکی کے ریکارڈ توڑ دیے جس کے لیے آج وہ بیٹا بن گیا۔“

”فرحت! کچھ سوچ سمجھ کر بات منہ سے نکالنی چاہیے۔ غصے میں ایسا بھی کیا بندہ آپ سے ہی باہر ہو جائے۔“

عالیہ بیگم کی آواز انجانے خدشات سے چور کانپ سی رہی تھی۔ چچی نے کچھ جتنی ہوئی تلخ سی نگاہ ان پر ڈالی۔

”دیکھا۔ کیسے آگ لگی ناں تن بدن میں۔ میرے بھی ایسے ہی درد اٹھا تھا۔ جان بوجھ کے کون اندھے کنویں میں پھینکتا ہے اپنی اولاد کو۔“

چچی کی پوری کوشش تھی کہ عالیہ بیگم کو جیلہ کے خلاف بولنے پر آمادہ کریں۔ عالیہ بیگم نے کمال ضبط سے کام لیا اور پھر کچھ ساعت بعد خود کو سنبھالتے ہوئے مصالحتانہ انداز میں کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ حماد خدا نخواستہ کوئی ایسا گیا گزرا لڑکا بھی نہیں ہے۔ اچھا خاصا معقول مرد ہے ہاں اگر تمہیں اپنی بیٹی کے لیے پسند نہیں ہے تو۔“

”اچھا یہ بات ہے۔ وہ اچھا خاصا ہے۔ معقول ہے اور تمہیں اس کے لیے اعتراض بھی نہیں ہے۔ تو بس ٹھیک ہے جیلہ! تم تو ویسے بھی تمشٰی پہ صدقے واری ہوتی ہو۔ مانگ لو پھر عالیہ سے۔ اسے بہو بنانا تو تمہارے لیے عین مسرت کا باعث ہوگا۔“

چچی نے عالیہ بیگم کا آخری فقرہ سننے سے پہلے ہی بات کاٹ دی تھی۔

”فرحت“ عالیہ بیگم بڑپ ہی تو اٹھی تھیں۔

”تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو؟“

”ہاں ہاں جانتی ہوں۔ تمشٰی کے لیے میں نے اپنے بیٹے فیب کی بات کی تھی۔ لیکن کون سی باقاعدہ منگنی ہوئی تھی۔ بات ہی تو تھی۔“

چچی فرحت اشتقامی اور غصیلاروپ دھارتی تھیں تو عقل و فہم کو قطعاً لٹ نہیں کراتی تھیں۔

”بات ہی تو تھی۔ شریفوں میں بات ہی تو سب کچھ ہوتی ہے۔“ عالیہ بیگم کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔

”گھر کی ہی بات تھی۔ گھر تک ہی محدود۔ ویسے بھی اتنا معقول رشتہ موجود ہے تو پھر تمہیں حق حاصل ہے اپنی بیٹی کے لیے بہتر سے بہترین انتخاب کرنے کا۔“

چچی کی سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی تھی۔ انہیں اسی بات کا غم تھا کہ عالیہ بیگم نے ان کے موقف کا دفاع

”دیکھو دیکھو مجھے تاؤ نہ دلاؤ۔ میرا منہ نہ کھلاؤ۔ تم ہی تو اس وقت پٹیاں پڑھایا کرتی تھیں کہ جیلہ بہت کس کے رکھو اس ناگن کی اولاد کو۔ شروع سے اس سنبولے کا پھن نہیں کچلو گی تو بڑے ہو کر تمہاری گروں کا پھندا بن جائے گا۔ بندے کو اپنے گریبان میں بھی جھانک لینا چاہیے۔“ تائی جیلہ جل جہنم کر کباب ہی تو ہو گئی تھیں۔

”پلیز آپ! چھوڑیں۔“ عالیہ بیگم ہراساں سی ہو کر تائی جیلہ کو سمجھا رہی تھیں۔ ”گزری باتوں سے کیا حاصل۔ ختم کریں اب اس قصے کو۔“ ان کی صلح جو طبیعت پر یہ سب ہنگامہ گراں گزر رہا تھا۔

”اس کو سمجھاؤ۔ اس کے کھوپڑے میں ڈالو کچھ۔ جو بڑھ بڑھ کر بول رہی ہے۔“ تائی نے خونخوار نظروں سے چچی فرحت کو گھورتے ہوئے عالیہ بیگم سے کہا۔

”اے بیجا تو تمہارا اپنا خالی ہے۔ قہر و ظلم کی دیوی! پہلے سوتیلے بیٹے کو انتقام کی چکی میں پیستی رہیں اور اب چلی آئیں میری نازوں پٹی پھولوں جیسی بیٹی کو سمیٹ چڑھانے کے واسطے مانگئے۔“ چچی نے ہاتھ نہچاتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”خدا کے واسطے فرحت۔ تم تو ہوش کے ناخن لو۔“ عالیہ بیگم سچ مچ عاجز آ گئی تھیں۔

”کیا بچوں کی طرح لگی ہوئی ہو۔ میں کہہ رہی ہوں بات ختم کرو۔ نہیں تو نہ سہی۔ اتنا لڑنے بھڑنے کی تنہا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ واقعی اس بار تپ گئی تھیں۔

”ارے سینک تو اسے ہی پڑے گا جس کے کلیجے میں آگ لگی ہو۔ کسی کو کیا احساس۔ تم کیوں میری سائیڈ لینے لگیں۔ ہاں ہاں نکالو میرا قصور۔ تم تو مجھے ہی مورد الزام ٹھہراؤ گی۔“

چچی کے دماغ کی روی گویا الٹ گئی تھی۔ ”تمہاری بچی کے لیے آتا کوئی ایسا گیا گزرا رشتہ تو میں پوچھتی۔ ارے ہاں اتنی ہمدردی ہے تو دے دو ناں اپنی بیٹی اس ہونٹ بہرے کو ننگے کو۔“

چچی فرحت کی بات پر عالیہ بیگم کے ساتھ ساتھ دروازے کے پردے کے پاس کھڑی تمشین اور نیلو بھی سناٹے میں رہ گئی تھیں۔

”کیا کہہ رہی ہو فرحت تم۔“ عالیہ بیگم ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ ایک لٹلے کو تو گویا ان کے دل کی دھڑکن ہی رک گئی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

نیلو نے چور نظروں سے تمشین کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آپس میں اس سختی سے الجھ گئے تھے گویا ایلٹھی لگ گئی ہو۔ چہرہ اور آنکھیں دھک اٹھ گئی تھیں۔



نہیں کیا‘ حالانکہ دونوں اتنے قریبی رشتے میں بندھنے والی تھیں۔

”فرحت! خدا کے لیے عقل سے کام لو۔ اتنی جذباتیت اور جلد بازی ٹھیک نہیں ہوتی۔ اتنی معمولی سی بات پر مشتعل ہو کر تم اس رشتے کو توڑ رہی ہو۔ جسے مرحوم خالو جان (سر) اتنے ارمانوں سے طے کر گئے تھے۔“ عالیہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

”بھی تمہیں ہمدردی جو ہے اتنی جلیلہ خاتون اور اس کے نام نہاد بیٹے سے۔“ چچی آگ لگا کر تماشا دیکھنے والوں کی طرح صورت حال سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

”میرے نیب کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ آج امریکہ سے آجائے تو لائن لگ جائے گی۔ لوگ خود اپنی بیٹیاں دینے کو تیار ہیں۔“

”اچھا یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔“ پردہ چھوڑ کر جانے کس دل سے وہ اتنی دیر دم سادھے رہنے کے بعد دفعتاً کمرے میں داخل ہو کر مضبوط لہجے میں بولی تھی۔ سبھی ایک دم چونک گئے۔

تمشیں ایک ایک قدم اٹھاتی عین چچی فرحت کے مقابل آ گئی۔

”ٹھیک ہے چچی جان! اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ بخوشی یہ رشتہ توڑ سکتی ہیں۔“ ضبط سے اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہوتا جا رہا تھا مگر لہجہ اور آواز ہنوز مستحکم تھے۔

”تمشیں! عالیہ بیگم نے ڈوبتی آواز میں اسے پکارا۔

”امی! اگر ان کے لیے متبادل موجود ہے تو یہی اختیار پھر ہمیں بھی ملنا چاہیے۔ آئی ایم سوری امی۔

مجھے یہ سب آپ سے کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا۔ لڑکیوں کے منہ سے ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ لیکن اس وقت صورت حال ہی ایسی ہے چچی اپنی خوشی سے یہ بندھن توڑ رہی ہیں تو ایسے میں ہم بھی پابند نہیں ہیں۔“

”تم کرو لگی اس“ بڑا خفش کے ساتھ گزرا؟ میرے بیٹے کی ہمسری کر سکتا ہے وہ؟ تم چار دن بھی نہ رہ سکو اس کے ساتھ۔“ چچی کے لہجے میں اس کے لیے تمسخر اور اپنے بیٹے کی برتری کا غرور شامل تھا۔

تمشیں نے ایک لٹلے کو انہیں دیکھا۔ پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”ہاں! اگر آپ یہ چیلنج کر رہی ہیں تو مجھے منظور ہے۔ میں کر کے دکھاؤں گی گزرا آپ کو۔“

ہی لڑکی چاہیے تھی چاہے وہ کوئی بھی ہوتی۔ سارہ کی عادات و اطوار اور ٹھک مزاجی انہیں پسند تو نہ تھی مگر بہر حال وہ خاندان کی تھی۔ اس لیے فرحت کی دہلیز پر جوتیاں گھسا رہی تھیں۔ تمشیں کو ان کے سر فرحت کے بیٹے نیب سے زبانی کلامی منسوب کر گئے تھے مگر نہ تمشیں تو انہیں سر سے پاؤں تک پسند تھی۔ اب جبکہ رکاوٹ خود بخود دور ہو گئی تھی تو جلیلہ بیگم کو تو یوں لگ رہا تھا گویا بیس کروڑ کا پرائز بانڈ نکل آیا ہو ان کا۔

عالیہ بیگم سمیت سارا جہاں اسے سمجھا سمجھا کے ہار گیا تھا مگر وہ اپنی ضد کی پکی تھی۔ ایک انج بھی نہ مر کی۔ حماد رضوی سے سب کو ہمدردی ضرور ہو سکتی تھی اور اس کے لیے چچی فرحت کی ”زبانی گولہ باری“

سب کی سماعتوں پر کڑی ضرور گزرتی تھی مگر خاندان کی کسی لڑکی کا مستقبل اس بندے سے وابستہ کرنے کا فیصلہ تو کسی کے ہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پھر اس جیسی سلجھی ہوئی پیاری سی فطرت والی اتنی اچھی لڑکی کا

حماد رضوی جیسے بندے کے ساتھ کیا جوڑ تھا۔ اس کو ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا تھا۔ حماد رضوی کا انتخاب تو ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہیرے موتی چھوڑ کر کونسلے اور پتھروں سے اپنا دامن بھر لے۔

سب نے ہی مقدور بھرا سے سمجھایا تھا مگر اس کی انا پر پڑی ضرب نے اس کی ہستی کو اس طرح ہلاکے رکھ دیا تھا کہ وہ کچھ قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی جس کا مرکز بھی نہ سوچا تھا۔ نیلو کے لیے لے لیکچر بھی کام

نہ آئے تھے۔ تائی جلیلہ کو بہت جلدی تھی۔ سو جھٹ پٹ شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

”تمشیں! میں جانتی ہوں۔ تم ہرٹ ہوئی ہو۔ چچی کی نخوت اور غرور نے تمہیں چیلنج کرنے پر آمادہ کیا

تھا مگر خدا کے لیے۔ ایک لٹلے کو سوچو۔ کیا تم ایک چیلنج کی نذر کرو گی اپنی اتنی قیمتی زندگی۔ وہ کسی طور بھی تمہارے جوڑ کا نہیں ہے تمشیں۔ اس سے صرف ہمدردی کی جاسکتی ہے بیاہ نہیں۔ وہ جذبات و احساسات کے بروقت اظہار اور اشتعال سے قطعی نا آشنا ہے۔ گو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ کسی نے اسے سکھایا

ہی کب ہے۔ نہ کوئی جذبہ اٹھانے ملا نہ کسی نے اس سے مانگا۔ اس کی زندگی کا بس ایک ہی رنگ ہے۔ پھیکا ساٹ بے حس اور بے جان۔ تم زندگی کے ہر لمحے سے رس نچوڑنے والی ہو۔ ہر گھڑی کو بھر پور طریقے سے پورے جذبوں سے محسوس کرنے اور انجوائے کرنے والی۔ تم گزارا نہیں کر سکو گی تمشیں۔ چلیز مان جاؤ۔ اب بھی وقت ہے۔ یار سوچو تم پورے خاندان میں کیساں مقبول ہو۔“ اپنے جیون ساتھی کو کس طرح

کس کر پاؤ گی۔ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتا نہ سمجھتا۔ یار تم کیوں مرنے کے حربے اپنا رہی ہو نیلو سمجھا سمجھا کر عاجز آ گئی تھی۔

”یار! منیب نہ سہی کوئی اور سہی۔ کوئی آسمان سے اتر اہوا تو نہیں تھا۔ امریکہ میں پڑھنے سے پر تو نہیں نکل آئے۔ چچی کی تو عادت ہے ڈیگیں مارنے کی۔“ نیلو کو تو یہی تک سمجھ میں آئی تھی اس کے آٹا ٹاٹا ہمارا سے شادی پر تیار ہو جانے کی۔

”تم کیا سمجھتی ہو منیب کے فراق اور اس کو کھودینے کے غم میں ایسا کر رہی ہوں۔ ارے نہیں تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں عشق و عاشقی کے چکر میں کبھی نہیں آئی۔ میرا مزاج ہی ایسا نہیں ہے۔ میں نے کوئی سنے نہیں دیکھے تھے منیب کے نام کے۔ میں نے تو ابھی اس لحاظ سے سنجیدگی سے کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔ امی پر چھوڑا ہوا تھا سب کچھ“ نیلو نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہاں سادگی اور سچائی کی تحریر درج تھی۔

”اچھا پھر ٹھیک ہے۔ تم اب بھی یہ سب کچھ ممانی پر چھوڑ دو۔ وہ بھی خوش نہیں ہیں تمہارے فیصلے پر۔ اور یہ بات بھی طے ہے کہ خوش تم بھی نہیں ہو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تم حماد کے لیے اس سے پیشتر کیا جذبات رکھتی تھیں۔“

”چلو ایک تجربہ یہ بھی سہی۔ اس نے لا پر وای سے بال جھٹکے۔ نیلو غصے سے منھیاں بھیج کر رہ گئی۔

”ایک چیلنج کے پیچھے خود کو برباد نہ کرو تھی۔ اب بھی وقت ہے مان جاؤ۔“

نیلو نے آخری دفعہ کوشش کی۔ وہ جواب دینے کے بجائے آرام سے لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر کے ان پر بازو رکھ لیا گویا اشارہ تھا کہ مزید بات چیت نہیں ہوگی۔ نیلو زچ ہو کر باہر نکل گئی۔



بندے کی برداشت بھی اس وقت تک سلامت رہتی ہے جب کوئی اس کی دم پر پاؤں نہ رکھ دے۔ جہاں یہ مرحلہ آ جائے وہاں برداشت بھی رخصت ہو جاتی ہے پھر عقل و شعور کے بند دروازوں پر دستک دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ضدی انا جین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتی۔ کچھ کر دینے، کچھ ثابت کرنے کچھ ہو جانے کے چکروں میں الجھا دیتی ہے۔ عزت نفس کا گھوڑا بھاگتا ہی چلا جاتا ہے۔

کہاں سے کہاں آن پہنچی تھی وہ۔ کس جگہ سے سفر کا آغاز کیا تھا اور کہاں اختتام ہوا ہے؟

حماد رضوی کے کمرے میں دلہن بنی بیٹھی جسمانی طور پر تو موجود تھی مگر طائر خیال جانے کہاں پرواز کر رہا تھا۔

”حماد رضوی۔ کیا واقعی ”گزارا“ ہو سکے گا؟“

دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر ان پر اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے وہ خود سے استفسار کر رہی تھی۔

ضدی ملکتی ٹوٹی انا کو سہارا نہ دینا ہوتا تو وہ ایسا قدم ہرگز بھی اٹھانا گوارا نہ کرتی۔

”حماد رضوی۔“ اس کی آنکھوں میں بہت سے پچھلے مناظر لہرانے لگے۔

جواد حسین بڑے سنجیدہ بلکہ حس لطیف کے اعتبار سے خشک قسم کے آدمی تھے۔ مگر جانے کیسی گیتی کے نظر کا شکار ہو گئے۔ اور یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ اپنی چچا زاد جیلہ سے نہ صرف شادی کر چکے تھے۔

نہیں سالہ بیٹی رابعہ کے باپ بھی بن چکے تھے۔

تین کو پہلے بار انہوں نے اپنے ایک مچھلے دوست نواب اقتدار شاہ کے ہاں دیکھا تھا اور پھر جیسے بچتے ہی رہ گئے تھے۔

حسن تھا کہ گویا کشش اور سحر کے جمر نے بہہ رہے تھے۔

سرتاپا مصرع۔ بناؤ سنگھار بھی کچھ کم نہیں لگ رہا تھا۔

جیسے انگوٹھی میں گینگند۔

جیسے چودھویں کا چاند۔

باد صبا کی طرح وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی اور پھر اسی سبک رفتاری سے لمحوں میں واپس پلٹ گئی تھی۔

”یہ“ انہوں نے سوالیہ انداز سے نواب اقتدار شاہ کو دیکھا۔ جواب میں ایک بے باک بے سکرانٹ نواب صاحب کے چہرے کا احاطہ کرنے لگی۔

”رشتہ دار ہیں کوئی۔“ جواد حسین ان کی مسکراہٹ سے الجھ گئے تھے۔

”سمجھنا اتنا ضروری ہے تو بھائی سمجھ لو۔ جزوقتی بھابی۔“

نواب صاحب کی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی معنی خیزی نشلی سی بے باکی تھی۔

وہ دنگ رہ گئے۔ ”ہوش کے ناخن لو شاہ۔“

وہ برامان گئے تھے۔ ابھی پچھلے ماہ تو نواب صاحب کی بیگم اپنی نئی ٹولی انگریز بہو اور بیٹے سے ملنے لندن گئی تھیں۔

”بھئی، بیگم صاحبہ کو ابھی مزید ایک ماہ لگ جائے گا لندن۔ اس دوران کی پوری کرنے کے لیے اسے لے آئے ہیں۔“

”لے آئے ہیں۔ کیا مطلب ہے تمہارا اور بھابی آگئیں تو کیا جواب دو گے انہیں۔“ ان کی شفاف

اور سادہ طبیعت پر نواب صاحب کی رنگین مزاجی کا واقعہ بڑا گراں گزر رہا تھا۔

”کب وہ سوال کریں گی اور کب ہم جواب دیں گے۔“ نواب صاحب کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایسی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ کہ بیگم کو پتا چلے اور وہ استفسار کریں۔

”اگلے ہفتے یہ کٹ منٹ ختم ہو جائے گی۔ تو نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔“

نواب صاحب تاج و عواقب سے قطعی بے نیاز رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔

”لائے کہاں سے ہو؟“ انہیں نواب صاحب کا انداز بہت ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔

”اسی بازار سے جہاں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔“

ٹانگ پہ ٹانگ رکھے سگار سلگاتے ہوئے نواب صاحب نے بڑے پرسکون انداز میں اطلاع دی تھی۔ ”دو ہفتے قبل۔“

جواد حسین اچھل ہی تو پڑے تھے۔

”کیا یونہی لے آئے ہو۔“ ان کے جذبات و احساسات میں عجیب سا پیمان پنا ہو گیا تھا۔

”نہیں۔ نکاح کر کے لایا ہوں۔ میں تو اس جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر چمپا بانی نے لاچار دکھایا کرتے ہوئے بتایا کہ کتنی اسی اصول اور شرط پر کام کرنے پر راضی ہوئی ہے۔“

جواد حسین اپنے اندر عجیب سی بے چینی بے کلی سی محسوس کر رہے تھے۔ جذبات سے برا بیعت ہو رہے تھے۔

اتنا حسن اتنی رعنائی۔ ایسی زیبائش۔ اتنی لطافت۔

چہرے سے وہ قطعی اس مگر کی باسی نہیں لگتی تھی۔ ایک بے ساختہ سا بھولپن اور نرم سا تقدس جیسے اس کے وجود کا ہالہ کیے ہوئے تھا۔ دو دن بعد وہ نواب صاحب کے ہاں کسی کام سے آئے تو اتفاقاً اس ملاقات ہو گئی۔ نواب صاحب گھر پر نہیں تھے۔

”آپ کون ہیں؟“ دو دن سے جو سوال ان کے ذہن میں سوئی کی طرح چھ رہا تھا بالآخر نوک زباں پر آ گیا۔

اس نے بھاری خمدار چکوں کی چلن اٹھا کر ایک لحظے کو انہیں دیکھا۔ گویا پرکھ رہی ہو۔

”یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ اس نے سیدھا ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ جواد حسین کے نظریں جھک گئیں۔ وہ ان بھلیوں کی تاب نہ لا سکے۔

تمبی آرائس پڑی۔ اک مضطربانہ سی ہنسی جیسے کانچ بکھر جائے۔

”میرے ماں باپ مالی اعتبار سے جتنے غریب تھے میں حسن کے اعتبار سے اتنی ہی امیر تھی۔ بے

نا غربت میں بے تحاشا حسن کہاں سنبھلتا ہے۔ ابھی تیرہ کا سن لگا تھا کہ ایک مالدار اور جڑی عمر بندہ

ہار بن کے میرے باپ کی کنیا میں چلا آیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اماں ابانے رسماً بھی

ت نہ لی۔ میں کنیا سے کبھی آئی۔ جہاں ایک شرابی کبابی شوہر کی ولداری اور خاطر مدارات میں

مکروں اور روح پہ لگے زخموں کی کک بھلانے کی کوششیں کرتی رہی۔ پھر ایک رات میرا شوہر اپنے

بہم پیشہ اور ہم شغل دوستوں کو گھر لے آیا اور مجھے ان کی اور طرح کی خدمت کرنے کا حکم دیا۔

اجت پر جسمانی تشدد اور گالم گلوچ کے ساتھ وہی تباہی بکتے طلاق دے دی اور خونخوار ارادے سے

ری سمت بڑھتے ہوئے کہا۔

”اب میں تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا اسی طرح۔ پھر دیکھتا ہوں تجھے جائز ناجائز کے سبق کتنے یاد دے رہی ہیں۔“

وہ بری طرح نشتے میں دھت تھا اور ساتھ ہی اس کے دوست بھی اس سمت بھوکے بھڑیوں کی طرح

انت نکالے۔ بچے پھیلائے لیکھتے مجھ پر جھپٹنے کے ارادے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ کسی غیر مرئی

لافت نے مجھ میں بجلی سی بھردی۔ میں اندھا دھند گھر سے نکلی اور سر پٹ بھاگنے لگی۔ وہ لوگ بھی پیچھے

آئے مگر مجھ تک نہ پہنچ پائے۔ مجھے خبر نہ ہوئی بھاگتے بھاگتے میں پلیٹ فارم پر پہنچی۔ یہیں انتظار گاہ

میں ایک مہربان چہرے والی خاتون ملی۔ اس نے ساری پتاسنی مجھے تسلی دی۔ میری حالت اتنی تپلی

ہو رہی تھی کہ نیم بے ہوش سی اس کی بانہوں میں گر گئی تھی۔ جانے ریل نے کتنا سفر کیا اور کہاں اترے۔

بوش آیا تو گھٹنگر و میرے منتظر تھے۔ آگے پیچھے کوئی راستہ نہ تھا۔ تیرہ چودہ برس کی بے آسرا اور بے سرو

امان لڑکی انجانے پرائے شہر میں جاتی بھی تو کدھر جاتی۔

چمپا بانی نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ مجھے رقص اور ناز و انداز کے تمام ہتھیاروں سے لیس کرنے کے

باد جو میری منشا اور مرضی کو ملحوظ رکھا۔ میری خواہش پر محفل سجانے کی حد تک محدود رکھا۔ اور کسی بڑے

رکس کے شہستان سجانے پر میری مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا مگر تاکہ جب عہد شباب ٹوٹ کر آیا تو

چمپا بانی کے آگے میری ایک نہ چلی۔ ہاں یہ شرط میں نے ضرور رکھی کہ چاہے ایک رات ہی کیوں نہ

بولر شرعی لحاظ سے ہوگی۔“

جواد حسین کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ وہ عجیب دردِ ساحسوس کر رہے تھے۔ کچھ آرا کے لئے اپنے دل میں پھر جب نواب صاحب نے حسبِ معاہدہ نکاح کا بندھن توڑ کر اسے آزار کیا تو جانے کیسے کیوں اور کس طرح وہ گیتی آرا کو پر پوز کر بیٹھے اور تازہ زندگی اپنی عزت بنا کر رکھنے کا عہد کیا۔ گیتی آرا پہلے تو بے یقینی سے دیکھتی رہی پھر ان کے اخلاص اور محبت کے سامنے ہار گئی۔ جواد حسین نے بھاری رقم دے کر چپا بانی کے چنگل سے اسے آزاد کرایا اور پھر سادگی سے نکاح کر لیا۔ ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ فی الحال گھر والوں کے سامنے تذکرہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔

جواد حسین نے اپنا عہد پوری طرح نبھایا۔ مگر قیوں کو اس چھوٹے سے گھر کی خوشیاں بہت کھٹکتی تھیں۔ چپا بانی کا گیتی کے جانے سے بڑا نقصان ہو رہا تھا۔ اس کی ہر ممکن کوشش تھی کہ کسی طرح دوبارہ گیتی کو بالا خانے پر لاسجائے۔

جب ہر طرح کا لالچ، فریب اور جھانے بھی گیتی کو ڈمگنا نہ سکے تو تنگ آ کر چپا بانی نے جواد حسین کو اور ان کے چھ سالہ بچے حماد کو مروانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک شام جب میاں بیوی اپنے بچے سمیت کار میں کہیں جا رہے تھے تو راستے میں کرائے کے غنڈوں نے گاڑی پر فائرنگ کر دی۔ معجزانہ طور پر جواد حسین اور حماد بچ گئے اور گولیاں گیتی کے جسم میں پیوست ہو کر اسے ابدی نیند سلا گئیں۔ اسی دوران گھر والوں پر شادی کا قصہ کھل گیا۔ جواد حسین حماد کو گھر لے آئے۔

پہلے پہل تو کسی نے اسے قبول نہ کیا۔ کوئی دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔ خصوصاً جیلہ بیگم کا تو بس نہیں چلا تھا کہ گلا گھونٹ دیں۔ جب تک جواد حسین حیات رہے کسی نہ کسی طور اس کا خیال رکھتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد حماد رضوی مکمل طور پر جیلہ کے رحم و کرم پر تھا اور اس وقت اس کی عمر محض دس سال تھی۔ پھر تائی جیلہ کے ختم نہ ہونے والے انسانیت سوز مظالم، گھر والوں کی مجرمانہ غفلت اور چشم پوشی بلکہ بے بسی بے دریغ زیادتیاں بے پناہ مصائب کی زد میں آیا تھا حماد رضوی۔

جانے کہاں کہاں سے منظر ذہن کے درپہوں سے نکل کر آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ اور اب گزارہ کیسے ہوگا۔ اس کے ذہن میں اندیشے سانپ کی طرح کھلبلا رہے تھے۔ ”ایک ایسے شخص سے نباہ کیونکر ممکن ہوگا جو میرے تو کیا خود اپنے حق کے لیے لڑنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا۔ کیا فرحت چچی کے آگے بھرم رکھ سکے گا میرا۔“

”بندہ شادی بے شک کرے مگر“ کا نڈی مرد“ تو نہ ملے اسے۔“ نیلو کا جملہ اس کی سماعت میں ٹکرا

۔

”ارے وہ بھی کوئی مرد ہے جو بیوی سے حق مانگتے ہوئے بھی میاں۔ منمناتے ہوئے بولے۔ رکو بارعب شاندار ہونا اپنی بات منوانے والا اور تھوڑا ضدی و سرکش ضرور ہونا چاہیے۔“ ایک بار ان میں بحث چھڑی تھی تو نیلو فر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”پر جوش لا پرواہ بہادر اور سمندری چٹانوں کی طرح مضبوط جفاکش نہ ہو تو اسے مرد ہی نہ مانے۔“ اور یہ۔

یہ شاید ساری عمر میرے سامنے کھڑے ہو کر اعتماد سے بات بھی نہ کر سکے۔ ساری عمر چوروں کی طرح چھپتا، جھپکتا اور پچتا پھرے گا۔ ہائے کیسا برف بندہ ملا ہے قسمت سے۔ اسے خود پر خود ہی ترس آنے لگا۔

”کیا کروں اب۔ اس کا انتظار۔“ اسے بے ساختہ ہنسی آنے لگی۔ ”وہ تو اس حد تک انجان ہے کہ اس انتظار کے معنی بھی نہ جانتا ہوگا۔“

اف کس قدر جھنجھلاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ ”میرا خیال ہے خواہ مخواہ لفٹ کرا کے اسے اپنی اہمیت کا اندازہ نہیں کرانا چاہیے۔ اچھا ہے اپنی موجودہ اوقات ہی میں رہے۔ اتنا بڑا انعام تو مل گیا ہے اسے میرے وجود کی صورت میں۔“ وہ نخوت سے سوچ رہی تھی۔

اسے اپنا سجا سنورا روپ خواہ مخواہ ہی مستحکمہ خیز لگنے لگا۔

”اونہوں کس کے لیے تجھی بیٹھی ہوں۔ وہ تو عام سا بھی نہیں ہے جو دل ٹھہر سکے۔“ ڈیرینگ روم میں جا کے اس نے زیورات اور لباس اتارا اور میک اپ صاف کر کے نیل کاشن کے آرام دہ لباس میں بیڈ کے ایک سائیڈ پر دراز ہو گئی۔ کمرابھی اپنے کمین کی طرح سادہ سا تھا۔ وسط میں وسیع و عریض بیڈ تھا جس کے مقابل ڈیرینگ ٹیبل تھی اور ایک طرف دو اسٹول اور تپائی موجود تھی۔ کسی قسم کی آرمائش و زیبائش سے قطعی عاری کمرہ گویا اپنے مالک کے مزاج کی عکاسی کر رہا تھا۔

کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔

شاید انجانے میں وہ اس کی منتظر تھی۔ اس نے جھلا کر سائیڈ ٹیبل پر دھرے سے ٹائم پیس کی طرف دیکھا۔ ڈھائی بج رہے تھے۔

اسے شدید کوفت ہونے لگی۔



”نواب زادے جانے کس ریاست کی سیر کو نکلے ہوئے ہیں۔“  
وہ جل کر سوچ رہی تھی۔

اسی لمحے کھٹکا ہوا۔ وہ ٹھٹھک کر اپنی جگہ جم سی گئی۔ خیال تھا کہ کبل تان کر بے خبر سونے کی ایکٹنگ کرنے مگر نجانے کیا ہوا وہ اس منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ جس طرح بیڈ کی پشت سے سر نکالے نیم دراز تھی ویسے ہی بیٹھی رہ گئی۔

اندر داخل ہو کے دروازہ بند کر کے جونہی وہ مڑا غیر ارادی طور پر دونوں کی نظریں مل گئیں۔  
”السلام علیکم“ نہایت دھیمے مگر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہہ کر نظر چراتا ہوا وہ ڈرینگ روم میں گھس گیا تھا۔

”ہونہ۔“ اس نے جیسے ڈرینگ روم کے بند دروازے کو نگوخت سے منہ چڑایا اور پھر کبل گرد کھینچ کر کروٹ لے کر پڑ گئی۔

پانچ سات منٹ بعد دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر بھاری بھاری قدموں کی آواز بیڈ کی سمت آتی سنائی دی۔

وہ دم سادھے پڑی رہی خیال تھا کہ آکر کچھ کہے گا یا عملاً کوئی پیش رفت کرے گا کہ کیسا ہی خاموش طبع اور بے اختیار سہمی بہر حال مرد تو تھا ناں۔ مگر کتنی ہی دیر گزر گئی۔ وہ اس کی سمت سے پیش قدمی کی منتظر ہی رہی۔ اپنی طرف سے تو سر سے پاؤں تک کبل اوڑھ کے دلہنا پے کی ساری علامات مٹا کر وہ اس کی ذات کے لیے اپنی بے نیازی بے پروائی اور بے توجہی کا ثبوت دینا چاہتی تھی۔ اسے بتا دینا چاہتی تھی کہ اس کے نام کا دم چھلا لگالینے سے نہ اس کی حیثیت و اہمیت بدل گئی ہے اور نہ خود اس کی ذات پر کوئی اثر پڑا ہے۔ تقریباً تقریباً پون گھنٹہ اسی ذہنی کشمکش میں بیت گیا تو اس نے انتظار کی اذیت سے جھلا کر گردن موڑ کر دوسری سمت دیکھا اور پھر لمحہ بھر کو جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئی۔

وسیع عریض بیڈ کے دوسرے سرے پر ہلکے سبز کبل میں وہ پرسکون چہرہ لئے انتہائی بے خبر و گن انداز میں سو رہا تھا۔

غصے کی شدت سے اس کی رگیں کھینچنے لگیں۔

احساس شرمندگی اسے عجب مشتعل سے جذبات سے دوچار کر رہا تھا۔

یہ ادا و انداز تو اس نے اس کے لیے سوچ رکھے تھے اور یہاں تمشیں سے پہلے ہی وہ جتا گیا تھا۔

حرے وہ اس پر اپلائی کرنا چاہتی تھی وہ خود اس پر اپلائی کیے جا رہے تھے۔ ”ہونہ۔ محترم کو غالباً اتنی عزت راس نہیں آئی مجھ پر اختیار حاصل کر کے بے چارہ خود کو تمیں مار خان سمجھنے لگا ہے۔ بے وقعت شے کو بھی جب اہمیت دی جائے تو سر پر چڑھ جاتی ہے۔ پھر اس کا تو حق بھی بنتا ہے۔“

وہ اپنی سلتی بھڑکتی انا کو تسکین دینے کے لیے دوسرے رخ پر سوچنا شروع ہو گئی تھی۔

”خیر مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو ویسے بھی اس کے وجود سے نالاں ہوں۔ اگر پیش قدمی کرتا بھی تو منہ کی کھاتا۔ اچھا ہے خود ہی عقلمندی کا ثبوت دے دیا ہے اس نے۔ ظاہر ہے ہمارے راستے تو کسی

طور ایک نہیں ہو سکتے۔ چلنا تو ویسے بھی دونوں نے ساری عمر تنہا ہے۔“

وہ بالآخر خود کو پرسکون کر کے نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔



”میری چندا۔ میری سوئی۔ اے ماشاء اللہ۔ چشم بد دور۔ کتنی پیاری لگ رہی ہے۔“ تائی بلائیں

لیتی نہیں تھکتی تھیں۔ کیسا روپ آیا ہے۔ میری بیٹی پر۔ اور جان تو خوش تو ہے ناں۔“ تائی اس کی

ٹھوڑی اٹھا کر بغور دیکھتے ہوئے محبت سے پوچھ رہی تھیں۔ ان کی نظریں کچھ ٹول رہی تھیں۔

وہ یونہی چہرہ جھکا کر شرمانے لجانے کی ایکٹنگ کرتی رہی۔ تائی اور دیگر خواتین کے جانے کے بعد

نیلو جواب تک بالکل چپ بیٹھی ہوئی تھی قریب کھسک آئی۔

”اور سناؤ کیسی ہو۔ کیسی گزری پہلی پہلی رات۔“

وہ گہری نظروں سے اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کا گویا تجزیہ کر رہی تھی۔

تمشیں سب کو بے وقوف بنا سکتی تھی مگر نیلو کے آگے بننا اس کے بس میں نہیں تھا۔ سو تھوڑے اصرار

کے بعد بالآخر خرساری صورت حال بتادی۔ نیلو سناٹے میں رہ گئی۔

”تمشیں میرے اللہ۔ ارے بے وقوف لڑکی تم کیوں اپنے لیے کنویں پہ کنواں کھود رہی ہو۔ اور

پاگل احمقوں کی شہزادی۔ میرے خدایا۔ کیا کمال کا کارنامہ کیا ہے تم نے“ وہ مایوسی اور بے بسی سے سر

پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”کیوں ایسا کیا ہو گیا۔“ تمشیں کے لیے اس کا واہلا خاک نہیں پڑا تھا۔

”ابھی کچھ ہونا باقی ہے“ نیلو نے ناراضگی سے اسے گھورا۔

”بھئی اب ایسی کیا قیامت آ گئی ہے۔“ وہ نا کجی کے عالم میں جھنجھلائی تھی۔

”تمہیں پتا ہے مرد جب اپنی خوابگاہ میں عورت کو آنکھ بھرنہ دیکھے اسے شرعی استحقاق کے تحت استعمال نہ کرے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے عورت کے مقدر میں سیاہ بختی لکھ دی گئی ہے۔ وہ ٹھکرادی گئی ہے۔ یہ ان چھو پین“ وجہ افتخار نہیں ہوتا۔ یہ تو سوانیت کے لیے ایک تازیانہ ہوتا ہے۔ عورت کے لیے اس سے بڑھ کر ذلت و رسوائی اور کیا ہوگی۔ اور پھر پہلی ہی شب اپنی قربت سے محروم رکھنا عورت کی بربادی کا نقطہ آغاز ہوتا ہے اور تو بے وقوف اپنی بربادی پر خوشیاں منا رہی ہے۔ عجیب شے ہے یار تو۔“

وہ اچھی طرح تمشیں کی خبر لیتے ہوئے آخر میں جھلا پڑی تھی۔

”اونہ مائی فٹ۔ وہ ہے میرے قابل۔ اتنی جرات ہے اس میں؟“ وہ تحقیر آمیز انداز میں ہونٹ سکڑتے ہوئے بولی۔

”یہ ہمت و جرات اور حق دے چکی ہیں آپ اسے اگر آپ کی یادداشت سلامت ہے تو۔“ نیلو اسے گھورتے ہوئے طنز یہ بولی۔

”خوش ہو تم۔“ چچی فرحت سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بڑی تیکھی ہو کے پوچھ رہی تھیں۔

”ہاں بالکل۔ سر سے پیر تک نہال ہوں۔“ اس نے جواباً انتہا درجے کی مسرت و شادمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گویا ان کا وار و کا تھا۔

”ابھی تو آغاز ہے دیکھیں گے۔ اصل میں تو چانچ بعد میں ہوتا ہے۔“

چچی اسے اتنا مطمئن پرسکون اور بشاش دیکھ کر دل ہی دل میں خاصی جربز ہوئی تھیں۔ سواندر کی حسد و جلن چھپاتے چھپاتے بھی لہجے سے چھلک پڑی تھی۔

”دیکھ لیجئے گا۔ ہم بھی یہیں ہیں اور آپ بھی“ اس نے ان کا جی جلانے میں کوئی کسر بھی تو نہ رکھی تھی۔



جب سے آفس لی طرف سے گھر ملا تھا۔ وہ کم کم ہی ادھر نظر آتا تھا۔ یوں بھی آفس شہر سے کافی ہٹ کے تھا۔ سوا گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ ادھر ہی آفیسر ز اور ورکرز کے لیے آفس کی انتظامیہ نے رہائشی کالونی کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ ادھر ہی ہوتا تھا۔ ویک اینڈ میں ایک آدھ دن کے لیے آجاتا تھا اور بالفرض نہ بھی آتا تو یہاں کون تھا۔ اس کی موجودگی یا عدم موجودگی کا نوٹس لینے والا۔ سوشادی کے

ہنگامے ختم ہونے کے بعد حسب معمول وہ چلا گیا تھا۔ تمشیں کے وہی معمولات تھے۔ صبح سے سہ پہر یونیورسٹی وہاں سے آ کر گھر کے چاروں پورشنز کے چکر رات کو اپنی نندوں ریمنا اور آمنہ سے گپ شب۔ رات کو میوزک سنتے یا نوٹس بناتے نلتے نیند کی وادیوں میں کھو جانا۔ غرض یہ کہ زندگی وہی تھی جو عالیہ بیگم کے ہمراہ تھی۔ فرق محض کمرے اور نام کا پڑا تھا۔ وہ بڑی حد تک مطمئن تھی۔

اس دن بھی یونیورسٹی سے آ کر وہ ارم بھابی کے پورشن کی سمت آ گئی۔ اس کا نیلو اور رمننا کا آج شاپنگ کا پروگرام تھا۔ سردیوں کا سیزن سر پر تھا۔ سو کپڑے، شال اور جوتوں کی خریداری کرنا تھی۔ یوں بھی کافی عرصے کے بعد بازار کا چکر لگ رہا تھا۔ سولہا چوڑا پروگرام بنایا تھا۔ رمننا شام کے اوقات میں کمپیوٹر کورس کر رہی تھی۔ اس نے آج کی کلاس گول کر دی۔

تمشیں تیار ہو کر نیلو کے ہاں آئی تو وہ مصروف عمل تھی۔

”کیا ہے بھئی، کتنی دیر لگے گی؟“ تمشیں نے اس کی تیاریوں کو تشریش سے دیکھا۔ وہ ایک بڑی سی

چادر پر استری کرنے میں جتی ہوئی تھی۔

”بس ابھی نو۔ رمننا نہیں آئی؟“

”میرے ساتھ ہی نکلی تھی کہ اس کا فون آ گیا۔ کہہ رہی تھی گاڑی اشارٹ ہونے تک ادھر پورچ

میں پہنچ جاؤں گی۔ مگر یہ تم کیا پیٹ رہی ہو؟“

نیلو کے سوال کا جواب دے کر اس نے بغور اس کی حرکات نوٹ کرتے ہوئے الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

نیلو نے اس لمبی چوڑی موٹی سی خیمے نما چادر کو عجیب سے اسٹائل میں اپنے گرد کس کر لپیٹا تھا۔

یوں کہ صرف کورٹ شوز کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

”خواتین کو گھر سے باہر نکلتے وقت ڈھنگ سے خود کو کور کر کے نکلنا چاہیے“

”اچھا، تمشیں نے غیر یقینی انداز میں کہتے ہوئے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ یہ وہی نیلو تھی جو

ابھی کچھ عرصے پہلے تک جیلہ تائی سے اس لیے کھینچائی کراتی تھی کہ دو گز کا دوپٹا سنبھالنا اسے دو بھر

ہو جاتا تھا کبھی ادھر زھلکتا کبھی ادھر پیروں میں رل رہا ہوتا تو کبھی چلتے چلتے راستے میں انک کے فرش پہ

آ رہتا۔

”یہ غالباً قول عابدی ہے مگر جہاں تک میرا خیال ہے راستے میں ان سے سر راہ ملاقات کا امکان

نہیں ہے یا پھر ایسا ہی ہے؟“  
تمشیں کے انداز میں لطیف سا طعنت تھا۔  
”کیا بد تمیزی ہے۔“ نیلو جھلائی۔

”تم لوگ تو یہیں کے ہو کے رہ گئے۔“ رمنابھی اسی اثناء میں ادھر چلی آئی تھی۔ ”ارے یہ کیا نیلو تہ کیا اٹھارویں صدی کا نمونہ بنی ہوئی ہو۔“ تمشیں کی طرح وہ بھی نیلو کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی۔  
یہی نہیں تھا کہ ان کی فیملی آزاد خیال اور ماڈرن فیملی تھی جہاں شلوار قمیص دوپٹے اور چادر وغیرہ کا تصور آک ورڈ سمجھا جاتا ہے اور ہر ایک اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات، مشاغل اور لباس و خوراک کے معاملے میں دوسرے کی پابندیوں سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ عام شریف خاندان کی بہو بیٹیوں کی طرح ان کے ہاں کی خواتین بھی ہلکی پھلکی چادر یا چادر نماز اسادو پٹے سر پر سلیٹے سے اوڑھ کر باہر آتی جاتی تھیں۔ ہاں یہ بات بھی بہر حال طے تھی کہ برقع یا نقاب کا ان کے ہاں رواج نہیں تھا۔ اس کی ابتدا اب نیلو ہی کر رہی تھی۔ تمشیں اس عمل کے پیچھے کارفرما محرک سے بخوبی باخبر تھی۔ عابد ستار بڑے مذہبی سے نہایت سنجیدہ مزاج کے بندے تھے۔ اچھے خاصے پختہ عمر کے وجہ مرد تھے۔ ایک اسلامی تنظیم سے وابستہ تھے اور اپنی ان سرگرمیوں اور انتہائی درجے کی خواتین کے وجود سے بے زاری کے سبب ابھی تک شادی کے جھنجٹ میں نہیں پڑے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ نیلو کو ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کو کہہ گیا اور یہ شاید نیلو کی محنت اور اپنے کام سے اس درجہ سنجیدہ قسم کی لگن کا کمال تھا کہ کچھ عرصہ بعد دونوں کے مابین دوستانہ فضا استوار ہو گئی جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اعتماد بھروسے اور اعتبار کے رنگ بھی شامل ہو گئے۔ اپنے مزاج کے برخلاف انہوں نے نیلو کے ساتھ پورا تعاون کیا اور ہر طرح سے اس کو کام کے بارے میں گائیڈ اور انعام کیا تھا۔ نیلو کو ان کی شرافت، سنجیدگی، پختگی اور متین شخصیت نے بڑا متاثر کیا تھا۔ اور اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ کس طرح رفتہ رفتہ غیر ارادی طور پر وہ خود کو عابد ستار کے معیار کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے تیار کرتی گئی۔ خصوصاً جب اسے پتا چلا کہ عابد ستار کی فیملی کی خواتین پردہ کرتی ہیں اور ان کی گھومنے پھرنے سے احتراز کرتی ہیں تب سے اس نے اپنی سوشل ایکٹیویٹیز محدود کرنا شروع کر دیں۔

رمناتو آگاہ نہیں تھی البتہ تمشیں اس تبدیلی کی وجوہات سے بخوبی آشنا تھی۔

شاہنگ کے دوران بھی نیلو نے انہیں اچھا خاصا بور کیا۔ انہوں نے حسب معمول ایک اوپن ابر

ریٹورنٹ میں برگرز اور آئس کریم سے لطف اندوز ہونا چاہتا تو اس نے رد و کد کرنا شروع کر دی۔  
”اتنے لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کتنا برا لگ رہا ہے۔ ایسا ہی ضروری ہے کھانا تو لے کر گاڑی میں بیٹھ کے کھا لیتے ہیں۔“ ارم بھابی کے تین سالہ بیٹے پومی کی برتھ ڈے قریب تھی اس کے لیے تینوں نے اپنے اپنے گفٹس لیے۔ گفٹ لے کر جب رمنادور تمشیں ریپرز دس کارڈ اور ربن وغیرہ لینے کے لیے ایک بک شاپ کی سمت بڑھیں تو وہ مزاحم ہو گئی۔

”یہ فضول خرچی ہوگی نری کیا فائدہ ان کا۔ ایسی بے جارسمیں قطعی اصراف میں شامل ہوتی ہیں سوچو یہ پیسہ جو تم ان معمولی بے کار چیزوں پر لگا رہی ہو کتنی جگہ کام آ سکتا ہے۔“

”ارے! تم نے نہیں لیا تو نہ لوڑ کھوا اپنی رقم سنبھال کے۔ ہمارے لیے تو یہی مناسب مصرف ہے رقم کا بچہ رنگی رنگی خوبصورت سی پیکنگ دیکھ کر خوش ہو جائے گا۔ ہمارے یہاں کون سے دس بیس ہیں دو ہی تو ہیں ان کی خوشی کے لیے بھی خرچ نہ کریں تو کیا بھاڑ میں جھونکنا ہے ان پیسوں کو۔“

تمشیں سچ سچ تپ گئی تھی اس کی منطق سے غبارے اور جھنڈیاں خرید کر بیکری والے کو پرسوں تک اپنی پسند کے مطابق فریش کیک بنانے کا آرڈر بک کر کے وہ گھر لوٹیں تو شام کے چھ بجنے کو تھے۔  
تمشیں چیزیں سمیٹ کر عالیہ بیگم کے پورشن کی سمت بڑھ گئی۔

آج ادھر ہی رات کو ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ ابھی وہ امی کو شاہنگ کی چیزیں دکھا رہی تھی کہ سب سے چھوٹی نندر میا چلی آئی۔

”تمشی بھابی! امی بلارہی ہیں آپ کو حماد بھائی آئے ہیں۔“

”اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ میں نے کیا استقبالیہ دینا ہے؟“

اس نے تیوری چڑھا کر کریم کو دیکھتے ہوئے قدرے گڑگڑایا اپنے آپ سے کہا تھا۔

تائی کی تک اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بھی آیا ہے تو میں کیا کروں۔ کیا نیا بن کے آیا ہے۔ یا فاتح اعظم کی نیم پلیٹ لگ گئی ہے سینے پر۔ وہ اچھا خاصا جل بھن گئی تھی۔

”اوہو! کیا بے وقوفی ہے؟“ امی نے بیٹی کی اوٹ پٹانگ منطق سن کر فہمائی انداز میں کہا۔

”کیسی بچوں جیسی باتیں کرتی ہو شوہر گھر آئے تو بیوی کو ہر صورت گھر ملنا چاہیے۔ چلو اٹھو فوراً سے پیشتر فافٹ“ عالیہ بیگم کی تادیب و تنبیہ کے آگے اس کی لنگڑی سی مزاحمت کیا ٹھہرتی۔ برے برے منہ بناتے ہوئے جب جمیلہ تائی کے پورشن میں داخل ہوئی تو موصوف لاؤنج میں جمیلہ تائی کے پاس سر

جھکائے بیٹھے نظر آئے۔ تائی کوئی قصہ چھیڑے ہوئے تھیں۔

”میں نے کہا، تمہیں کیا عقل ہے، کون سے مضمون تمہارے لیے مناسب رہیں گے۔ بڑا بھائی آتا ہے تو اس کے صلاح مشورے سے منتخب کرنا۔ تاکہ بعد میں پڑھانے کے لیے ٹیورنڈ ڈھونڈنے پڑیں بھی مضامین کے انتخاب میں صرف شوق تو کام نہیں آتا۔ پھر میٹرک اور فرسٹ ایر کی پڑھائی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ خواہ شوق کے مارے مشکل مضمون لے کر سارہ بی طرح تین سالوں میں فرسٹ ایر کلیر کرنے والا حساب نہ کروا بیٹھنا۔ اچھا ہوا تم آگے اب خود ہی نمٹانا اس کے بکھڑے۔ دیکھ لینا کون سا کالج اس کے لیے اچھا رہے گا تم بہتر جانتے ہو۔“

ریمیا کا میٹرک کا رزلٹ آچکا تھا واراب فرسٹ ایر کے ایڈمشن کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کر رہی تھی۔

تائی کا لہجہ نہایت شیریں تھا۔ ”کچھ عرصہ پہلے تک تو نکل دیکھنے کی روادار نہ تھیں اب کیسے کام نکھوانے کے لیے بیٹھے لہجے میں پیار سے بات کر رہی ہیں۔“

تمشیں دل ہی دل میں طیش کھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ دو سال پہلے جب سے تایا جان کی وفات ہوئی تھی حماد کو غیر معمولی توجہ سے نوازنے لگی تھیں شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انتہائی خواہش کے باوجود اللہ نے اولاد زینہ سے محروم رکھا تھا۔ اب چار بیٹیوں کی عصمت و عفت اور حرمت کا محافظ صرف وہی تھا۔ چاہے سوتیلا ہی اسکی بھائی تو تھا۔ سر پہ سایہ تو تھا خصوصاً باپ کی وفات کے بعد مالی انتظامی اور دفاعی مٹیوں معاملات حماد ہی سنبھالے ہوئے تھا۔ گویا اب اس کا وجود تائی کے لیے خاص اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ آخر تین کنواری بن باپ کی لڑکیاں گھر بیٹھی ہوئی تھیں۔

”جی بہتر۔“ وہ کہہ کر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اے تمیش! اس کا کوئی استری کیا ہوا جو انکال دو۔ نہا کرتا زہ دم ہو جائے گا۔ آ منہ تم اتنی دیر میں روئیاں ڈال دو۔“

تائی نے بے نیازی سے ٹی ونی کے آگے ڈفی تمشیں سے کہہ کر کچن میں گمن آ منہ کو آڑ کر کیا تھا۔ تمشیں نے چونک کر حیران نظروں سے تائی کو دیکھا۔ بھلا انہیں اس کے پینے کھانے کی پروا کب سے ہو گئی۔

حماد اندر کی سمت بڑھ چکا تھا۔

”خود ہی کرے گا تائی جان! ایسا بھی اب کیا۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکاتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ اسے اپنی پشت پر تائی کی ناگوار نظروں کا احساس فوراً ہو گیا تھا۔

”حماد کہاں رہ گیا۔ اے رمناء آواز دینا ذرا۔“

رات کے کھانے پر تائی نے نشست سنبھالتے ہی ادھر ادھر دیکھ کر رمناء کو کہا تھا۔ تمشیں جھنجھلا سی گئی۔

”آجائے گا خود ہی تائی جان! پہلے وہ کب کھاتا تھا ہمارے ساتھ۔“ اس نے بے زاری سے کہا تھا۔

جیلہ تائی نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ ”وہ سفر سے تھکا ہارا آیا ہے ظاہر ہے بھوک پیاس بھی خوب لگ رہی ہوگی۔“

”جب لگے گی تو آ بھی جائے گا۔ ہم کیا نواب زادے کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔“

اسے تائی کے اس انداز پر کوفت ہو رہی تھی۔

”اگر تمہیں زیادہ بھوک لگی ہے تو شروع کر سکتی ہو۔“ ناخوشگوار تاثرات کے بوجھ سے ان کا چہرہ کھنچ سا گیا تھا۔ وہ کچھ متعجب سی حق دق بیٹھی انہیں دیکھتی رہ گئی۔ وہ کب سے اتنا اہم اور ”عزیز“ ہو گیا ان کو۔

رمناء کے دوبارہ بلانے پر وہ بے آواز قدم اٹھاتا نمبل پر آ گیا اور نہایت خاموشی سے تھوڑا سا پلیٹ میں ڈال کر کھانے لگا۔

”تم تو کچھ لے ہی نہیں رہے۔ تمشی! تم اس کی پلیٹ میں ڈالو کچھ۔ یہ بریانی والی ڈش تمہارے سامنے ہے۔“

تائی کے لاڈ بھرے انداز پر وہ دل ہی دل میں تلملا رہی تھی۔ خود پہ جبر کر کے ڈش کو برائے نام حرکت دیتے ہوئے اس نے تھوڑا سا اس کی سمت سر کا دیا اور پھر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

”تائی جان! میں امی کی طرف جا رہی ہوں۔ وہ انتظار میں ہوں گی۔ انہیں بتایا تھا کہ رات ان کے پاس رہوں گی۔“

کھانے کے بعد نمبل سے اٹھتے ہوئے اس نے اطلاعی انداز میں کہا۔

تائی ایک دم حیران سی دیکھتی رہ گئیں۔ بچی تو تھیں نہیں جو اس کے تیوروں سے سمجھ نہ پاتیں اول



روز سے اب تک دونوں کے درمیان کیسے تعلقات تھے اور ان کی کیا نوعیت تھی اس سے وہ بخوبی آگاہ تھیں۔ ویسے بھی اس بات کا اندازہ تو انہیں پہلے سے تھا لیکن جانے کیوں اب انہیں تمشیں کے یہ بے مہر بے گانہ سے لائق انداز کھٹکنے لگے تھے۔

”کیا ضروری تھا یہ سب کچھ۔“ نیلو نے اس کے رویے پر خاصا ناگوار رد عمل ظاہر کیا تھا۔ تمشیں عالیہ بیگم کے بجائے ادھر ہی چلی آئی تھی اور نیلو کے بیدروم میں اس کے ہمراہ آرام دہ بستر پر دراز تھی۔ ”تمش! عقل و فہم کے درپے کے پٹ کھول دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ تم کب تک خود کو بھی چوڑی سمجھتی رہو گی۔“

نیلو کے لہجے میں سخت تاویب تھی۔  
 ”میری مرضی، بھی میں وہ مسکین، یتیم بر فلی شکل دیکھ دیکھ کر بور نہیں ہونا چاہتی تھی سو چلی آئی۔“  
 اس کے لہجے میں بے حسی اور خود سری کی جھلک صاف طور پر عیاں تھی۔  
 ”اس شکل کے ساتھ ساری عمر گزارنا ہے۔“ نیلو کے ہونٹ بھیج گئے تھے۔  
 ”جب حشر کا دن آئے گا اس وقت دیکھا جائے گا۔ فی الوقت مجھے سونے دو۔“ وہ کروٹ لے کر اوندھی ہو گئی تھی۔

اس کے انداز میں حد درجہ لاپرواہی اور بے نیازی تھی۔ نیلو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔



تائی ان دنوں رونا کے لیے رشتے کھنگال رہی تھیں۔ ارادہ تھا کہ آمنہ کے ساتھ ہی دونوں کو اکٹھا نمنا دیا جائے۔ آمنہ باجی کی مٹکئی دو سال پہلے ہو چکی تھی اور اب وہ لوگ شادی کے لیے مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس دن بھی کچھ لوگوں نے رونا کے سلسلے میں آنا تھا۔ بڑی اچھی فیملی تھی۔ بڑی دھوم سنی تھی۔ صغریٰ خالہ نے تو ابھی سے رشتہ پکا ہونے کی متوقع خوشی میں لڈو طلب کر لیے تھے۔ وہی یہ رشتہ لے کر آئی تھیں۔ مہمانوں کی اہمیت اور خصوصیت کے پیش نظر تائی جان بھی بہت محتاط تھیں۔ ہر معاملے کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے بذات خود انتظامات کی نگرانی کر رہی تھیں بلکہ مزید احتیاط کے طور پر حمی آپا کو بھی سسرال سے بلوا بھیجا تھا۔ حماد کو کل شام ہی فون کر کے مطلع کر چکی تھیں۔

دم رخصت مہمانوں کے تیور خاصے حوصلہ افزا اور خوشگوار تھے۔ حماد نے نہایت بچے تلے انداز میں

کے سوالوں کے جوابات دے کر انہیں مطمئن کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی محتاط انداز میں بڑی میل سے تفتیش کی تھی جس پر تمشیں کو خاصی حیرت ہوئی تھی۔ حماد کے انداز سے کہیں بھی وہ جھلک مل رہی تھی جو وہ عام طور پر دیکھنے کی عادی رہی تھی۔ انداز کی سنجیدگی میں بڑی پختگی وقار اور فہم است کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کا لب و لہجہ بڑا متوازن اور سلجھا ہوا لگ رہا تھا۔

”پھر کیسے لگے تمہیں یہ لوگ؟“ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد تائی جیلہ نے بڑے اشتیاق سے حماد کی شکل دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

ان کے انداز سے ظاہر تھا جیسے وہ مثبت رد عمل کی منتہی ہوں۔

”فیملی تو اچھی ہے لڑکے سے مل کر صحیح اندازہ ہو سکے گا۔“

وہی دھیمہ، کترا یا، بچا یا لہجہ اور انداز دوبارہ درآ یا تھا۔

”میری تو تسلی ہو گئی ہے۔ ماشاء اللہ شریف سلجھے ہوئے کھاتے پیتے لوگ ہیں، تم تحقیقات کر لینا

لڑکے سے مل کر بھی اپنی تسلی کر لینا۔ باقی جو خدا کو منظور۔“

تائی اس رشتے کے لیے خاصی سنجیدہ ہو رہی تھیں۔

”کھانا کھالیا تم نے؟“ وہ اندر کی طرف مڑ رہی تھی کہ تائی نے آواز دے کر پوچھ لیا۔

پھر اس کا جواب سنے بغیر ہی تمشیں نے مخاطب ہو گئیں۔

”اے تمش! کھانا گرم کر کے لگا دو اس کے لیے مہمانوں کے ساتھ تو اس نے ایک کے بعد دوسرا

ال نہیں لیا میں دیکھ رہی تھی۔“

”نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ یہ تکلیف نہ کیجیے۔“

اس نے پیشانی کو ایک ہاتھ سے ہلکا سا دبا کر جواب دیا۔

”چائے بنا دو تمش!“ تائی نے اندازہ لگایا کہ اس کے سر میں درد ہوگا تو سو تمشیں کو دوسرا حکم صادر

کر دیا۔ دوپہر کو وہ گھر پہنچا تھا اور اس کے پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد مہمان آ گئے تھے۔ پوری شام اور

ات کھانے تک ان کے ساتھ رہا۔ مہمانوں میں تین مرد ایک عمر رسیدہ خاتون اور ایک نو عمر لڑکی تھی۔

تمشیں نے تائی کے آرڈر پر بیچ و تاب کھا کر کیے بعد دیگرے تائی اور حماد کی سمت دیکھا تھا۔

”جاؤ اور..... ایک کپ میرے لیے بھی بنا دینا بیچ در دوسری کا کام ہوتا ہے یہ تو.....“

تباہ کے روکنے سے پیشتر ہی تائی نے اپنی طلب کا اضافہ کر کے گویا جتنی مہر ثبت کر دی۔

وہ پیر بیٹھتے ہوئے کچن کی سمت بڑھی تھی۔

ایک آواز کے ساتھ اس نے چائے لاکر سائڈ ٹیبل پر گویا بیچ دی تھی۔

وہ بیڈ کے ایک کونے پر نیم دراز اپنی فائلوں میں کھویا ہوا تھا۔

کپ رکھ کر وہ بے نیازی سے نیچے لاؤنج میں چلی آئی۔ تائی آرام کے لیے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

ریمیا قالین پر کیشن کے سہارے اوندھی لیٹی فلم دیکھ رہی تھی۔

”آمنہ باجی اور رمنا کدھر ہیں؟“ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

”آمنہ باجی تو بستر استراحت پر ہیں اور رمنا آپی سارہ کے ہاں گئی ہیں ادھر ہی رات بسر کریں گی۔“

”اچھا۔“ وہ بے زاری ہو گئی۔

”چلو پھر بوریت دور کرنے کے لیے کارڈز کھیلتے ہیں۔“

اسے لطف تو نہیں آ رہا تھا مگر پھر بھی بے ارادہ ریمیا کے ساتھ کھیل میں لگی رہی۔ اسی اثناء میں فلم بھی ختم ہو گئی۔

”نیند آ رہی ہے بھابی اب تو۔“ بالآخر ریمیا جمائیاں لیتے ہوئے اٹھ گئی۔

اس نے نظریں اٹھا کر وال کلاک کی سمت دیکھا۔

”ارے! سو ابارہ ہو گئے ہیں۔“ اسے بھی اٹھنا ہی پڑا۔

وہ دل ہی دل میں جھنجھلائی جھنجھلائی، تھکے تھکے قدموں سے اوپر بیڈروم میں آ گئی۔

کمرے میں ٹائٹ بلب روشن تھا۔ روشنی کے نیلے ہلکے غبار میں پورا کمر اڈوبا ہوا تھا۔ حماد ایک سائڈ پر سبز کیمبل میں بڑے پرسکون انداز میں بخواب تھا۔

تمشیں نے غیر ارادی طور پر سائڈ ٹیبل کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمحے کو جسم کا سارا خون اسے چہرے کی طرف دوڑتا محسوس ہوا۔

چائے کا کپ جوں کا توں ”ان چھو“ رکھا ہوا تھا۔ احساس تو جین اور خجالت سے اس کے اعصاب

جلنے لگے۔

گویا اس نے بھی جتا دیا تھا کہ مجھے تمہارے احسان، تمہاری جرأت سے کوئی سروکار نہیں، اگر تم اتنے

ہا میز انداز میں ”احسان“ کو بیچ کے جاسکتی ہو تو میں اس کو قبول نہ کر کے جوابی وار کرنے کا مجاز

میں بھی تمہیں ایسا موقع کیوں فراہم کروں کہ جس کے باعث تم اپنی انا کی تسکین کر کے مجھ پر

ل ہونے کی سند پاسکو۔ اگر تم کم ظرفی کا مظاہرہ کرتی ہو تو میری خودی میری انا اور میری مردانگی

سلامت ہے، اگر تم مجھ سے مخاطب ہونے اور ہم کلام ہونے سے خار کھاتی ہو تو میں بھی اپنے پندار کو

نہیں لگنے دوں گا۔

ساری رات تو جین و تذلیل اور خجالت کے احساس نے اسے سونے نہیں دیا۔ رات گویا کانٹوں پر

ہوئی تھی۔

”یہ اتنا بے بس سا، بے حس سا، بے ضرر سا بندہ اتنا جرأت مند کیسے ہو گیا کہ مجھے ذہنی زک پہنچانے

اے اسی بات پر طیش آ رہا تھا۔

فجر کے قریب اس کی آنکھ لگی تھی۔ سوساڑھے دس بجے تک ڈنٹ کے سوئی۔ پھر اٹھ کر نہادھو کے

ٹن ہو کے نیچے آئی تو واگیارہ کا ٹائم ہو رہا تھا۔ بیٹے کا دن تھا سوسب گھر پر ہی تھے۔

حماد صحن میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ تائی کے پاس فرحت چچی آئی بیٹھی تھیں۔ رمنا نیلوی کی طرف نکلی

آئی۔ آمنہ باجی حسب معمول کچن میں تھیں۔ وہ چائے کا کپ لے کر تائی کی طرف آ گئی۔

”اٹھ لگیں ہو۔“ چچی فرحت نے اس کے سلام کا جواب دے کر اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے

کہا۔

”جی ہاں اٹھنا تو تھا ہی۔“ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”مگر اتنی دیر سے اٹھنا کچھ زیب نہیں دیتا۔“ فرحت چچی نے ناک بھون چڑھائی۔

”پر دیکھی میاں گھر آیا ہو تو بیوی اس کی دلدادہ اور صحت و تندرستی کے لیے اس کے پسند کے کھانے

سے نہیں ٹھکتی۔ اس کی خوراک اور لباس کا خصوصی خیال رکھتی ہے کہ کون سا روزہ روز آنا ہوتا ہے۔ ایسا

ٹکٹا بار ہی دیکھا ہے کہ میاں تو صبح سویرے نہادھو کے بیٹھا ہے اور بیوی دوپہر تک بستر پر اینڈ رہی

نہ۔“

”تو اس کی وجہ بھی میاں ہی ہے۔ رات بھر اس کی ناز برداریاں اور دلداریاں کر کے تھکی ہاری بیوی

کیا دو گھڑی آرام بھی نہ کرے۔“

”نیلو! وہ روہا سی ہو چلی تھی۔“

”اچھا چلو اب نہیں تجھے پتا ہے فرحت چچی کیوں تشریف لائی ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”بھئی نیب احمد تشریف لارہے ہیں پرسوں۔ اس کی خبر دینے آئی ہیں۔“ نیلو نے انکشاف کرتے

ہنور سے اس کی سمت دیکھا۔

”ہیں! اچھا۔“ ادھر کوئی خاص رد عمل نہیں تھا۔ بس معمول کے مطابق حیرت اور تعجب تھا۔

”چلو اچھا ہے انہیں بھی وطن یاد آیا۔“

”چچی فرحت ان کی آمد کی خوشی میں اک ہنگام مسرت پا کر ناچا ہتی ہیں اس کی دعوت دینے آئی

”اس نے مزید کہا۔

”بھئی واہ! تو یہ انداز ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”تہیں اور حماد کو خصوصی دعوت دی ہے۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ وہ حسب عادت ایک جھٹکے سے بال پرے کرتے ہوئے اطمینان

یا ہوئی تھی۔



’نیب بھائی! آپ تو سچ مج ہمارے لیے خواب ہو کر رہ گئے تھے۔“

وہ خیر سگالی کے جذبات کے تحت رواداری سے اظہار مسرت کر رہی تھی۔

بب احمد ہنس پڑے۔

”یقین کر لو بھئی! میں خواب سے حقیقت میں آچکا ہوں۔“

”لیکن ہمارے لیے خواب و خیال ہو کر رہ گئے ہیں۔“ اس نے بھی برجستگی کا مظاہرہ کیا۔

”میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچنا کوئی اور ہے۔“

بلو نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے مصرعہ کسا۔

وہ لوگ ہنس پڑے۔

”ارے حماد بھائی! آپ ادھر کیوں کھڑے ہیں۔ نیب بھائی سے ملاقات ہوئی آپ کی۔“

بلو کی پکار پر حمشین نے بھی مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ اس سے محض چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ چہرے

چچی فرحت کے سیر کا جواب سوا سیر میں دینے کے لیے اس نے بھی تمام حدیں عبور کر لیں اور ہاتھ

نچا کے بے جھجک انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ فراموش ہی کر گئی کہ محض چند فٹ کے فاصلے پر صحن میں

کرسی جمائے حماد بھی بیٹھا ہے۔

چچی کی بولتی تو خیر بند ہوئی ہی تھی۔ تاہی جیلہ جو اس کے اتنی دیر سے اٹھنے پر اظہار ناراضگی کے لیے

چپ سا دھمے بیٹھی تھیں ہکا بکارہ گئیں۔ (اس سے توقع کہاں کی جاسکتی تھی۔ اتنی عقل مندی اور وفاداری

کی)

دھڑلے سے کہہ کر تملاتی، طیش کھاتی، بل کھا کے مڑی تو حماد کی متعجب و متحیر نگاہوں سے نظریں اٹا

گئیں۔

اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ چچی فرحت کو پسپا کرنے کے لیے اس وقت تو اس نے بے سوچے

سمجھے اتنی ذومعنی بات کا وار کر کے میدان لوٹ لیا تھا، مگر اپنی زبان کی بے باکی کا احساس اب ہو

تھا۔ کچھ بھی ہو بہر حال شوہر انہ حقوق و فرائض کا تصور عورت کے انگ انگ میں حیا کے موتی پر دوڑ

ہے۔ احساس شرمندگی اسے زندہ دفن ہونے پر مجبور کر رہا تھا۔ بمشکل تمام اندر کی سمت بڑھی

دروازے کے ساتھ کھڑی نیلو کی دبی دبی ہنسی اسے نئے سرے سے خیالات سے دوچار کر گئی۔

”اوہونا زبرداریاں شب بیداریاں دلداریاں واہ بھئی واہ! ہمیں تو آپ کی ذات کے اس پہلو کا

خبر ہی نہ تھی۔“

وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھی اور اب دونوں ہاتھوں کو ہونٹوں پہ رکھے کھلکھلا رہے

تھی۔

”بکواس نہیں کرو۔“ اس نے غصہ دکھانے کی کوشش کی۔ احساس خفت سے برا حال ہو رہا تھا۔

”ویسے یار سچ کیا بڑی محنت کی تھی رات۔“ وہ معنی خیز لہجے میں کہتی سیدھا اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

اس نے جھنجھلا کر دونوں کٹن اس کے سر پر دے مارے۔

”ویسے تجھے اتنی ”سینس“ ہے، لگتی تو نہیں ہو۔“ وہ ہنور اس کا دکھتا ہوا انکار اچھا دیکھتے ہوئے کہ

رہی تھی۔

پرخصوص سنجیدگی کی چھاپ تھی۔

”جی ہو چکی ہے ملاقات۔“

”ارے ان سے ملاقات نہ ہوگی۔ اتنی مشہور اور عظیم شخصیت ہیں۔“

نیب نے خوش دلی سے قہقہہ لگاتے ہوئے یگانگت سے حماد کو دیکھا تھا۔

”یہ عظیم کی اصطلاح کیوں استعمال ہوئی ہے؟“ تمشیں نے استفسار کیا۔

”بھئی تمہارے جیسی عظیم شخصیت کے شوہر کا مرتبہ جو حاصل ہے۔“

ارد گرد کھڑے لوگ ہنس پڑے۔

”ویسے کچھ زیادہ ہی جلدی نہیں دکھائی تم نے؟ اپنا ایم ایس سی کیپٹ کر لیتیں۔“ نیب نے کوک

کے سپ لیتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

”یعنی ابھی بھی نہیں پڑا۔“ نیب مصنوعی حیرانگی کے عالم میں بولے۔

”آپ کو لگتا ہے؟“ اس نے فوراً کہا۔

”ہاں یہ تو ہے سر موقوف نہیں پڑا۔“ اسے سر سے پیر تک جانچتے ہوئے انہوں نے بشاشت سے کہا

تھا۔

”حماد بھائی! آپ نے کچھ نہیں لیا۔“ نیلو حماد کی خاطر داری میں لگی ہوئی تھی۔

”لے رہا ہوں۔“ اس کا انداز کترا کر آیا تھا۔

نیلو نے کچھ جتانے والے انداز میں تمشیں کی طرف دیکھا تھا، جواب میں وہ ازلی لاپرواہی سے

کندھے اچکاتی پھر نیب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”آپ کے ساتھ کوئی دم چھلانظر نہیں آ رہا جس کے بارے میں ہم نے سنا تھا امریکہ سے واپسی؟

اگر کوئی ہمراہ نہ لے کے آئے تو سمجھو وہ امریکہ گیا ہی نہیں اتنے برس افریقہ کے جنگلوں میں گھاکر

کھودتا رہا ہے۔“

اس کا انداز اس قدر شوخ و شریر تھا کہ ارد گرد بے ساختہ کئی قہقہے ابل پڑے۔

”لے تو آتے مگر کیا کرتے۔ دل ادھر ہی ”پھنسا“ ہوا تھا۔“ بڑی ہلکی سے مسکراتے ہوئے قہقہہ

جھک کر انہوں نے جواب دیا تھا۔

نیلو نے اچھی خاصی تملاتی نگاہوں سے بیک وقت نیب اور تمشیں کو گھور کر حماد کے سپاٹ چہرے

سے چور نظروں سے دیکھا۔

”دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔“

تمشیں کی برجستگی نے ایک بار پھر نیب کو کھلکھلانے پر مجبور کر دیا۔

”کیا پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں یہاں؟“ چچی فرحت کشاں کشاں اس سمت چلی آئیں اور پیار

ی صدقے واری ہوئی نظروں سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے استفسار کرنے لگیں۔

”تمشیں سے بات ہو رہی تھی۔ بڑی مزے دار اور دلچسپ باتیں کرتی ہے۔“

وہ بدستور بشاشت سے انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔

نیلو نے اپنے اندر عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ کچھ ابھی ہوئی چور نظروں سے دوبارہ حماد کی سمت

لہا۔ وہ جیسے ساری دنیا سے بیگانہ صوفے کی ایک سائڈ پر بیٹھا چائے کے کپ سے کھیل رہا تھا۔

”اتنی بدھوا اور بے وقوف ہوتم“ کچھ عقل مستعار لے لو کسی گدھے سے۔“ واپسی پر تنہائی ملتے ہی وہ

ٹہن پر برس پڑی تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ اس نے انتہائی بھولپن سے دریافت کیا تھا۔

نیلو سر پیٹ کر رہ گئی۔

”الو کی دم فاختہ میاں کے سامنے کسی غیر سے ٹھٹھول کر نازیب دیتا ہے بیوی کو؟ تجھے ذرا خیال

ہل آیا۔ حماد بھائی کیا سوچتے ہوں گے جب کہ نیب کسی حوالے سے تمہاری ذات سے منسلک بھی رہ

ا ہے۔“

تمشیں کے مسکراتے ہونٹ یکبارگی بھنچ گئے۔ چہرے پر تند سا کھچاؤ آ گیا۔

”وہ کوئی غیر نہیں چچا زاد ہے میرا اور جہاں تک ماضی کے تعلق کی بات ہے۔ اس تعلق کو تو میں نے

راوت محسوس نہیں کیا تھا۔ جب یہ ممکنات میں سے تھا اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں بات

رہتے ہوئے کچھ سوچ لینا چاہیے۔“

اس کے نزدیک انداز میں واضح برہمی عیاں تھی۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا ڈنیر۔“ وہ اسے منانے کو بازو اس کے گرد ڈالتے ہوئے یگانگت سے

لی۔



تنبہائی اور اس کا دھیان بنانے کا خیال کبھی تمہارے دل میں نہیں آیا۔ اس کی خواہش، طلب اور مزاج سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی اس کے لیے یہ ثبوت کیا کم ہے کہ تم اس کے احساسات سے قطعی بے خبر مگر اور سرور سی نبیب بھائی کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔“

نیلو اچھی طرح اس کے لٹے لے رہی تھی۔ وہ برے برے منہ بتاتے ہوئے سختی رہی۔



”تمہیں سارا جہان پھر کر یہی پسند آتا تھی۔“ وہ اشتعال سے مٹھیاں بھینچ رہی تھیں۔

”میں نے خاندان سے باہر کے چکر میں اس سے کئی گنا اچھی لڑکی کا رشتہ لوٹا دیا تھا اور تم کو پسند آئی بھی تو وہی خاندان کی لڑکی۔“

”خاندان کی لڑکیوں میں کیا خرابی ہے امی؟ یوں بھی اپنے گھر کے ہیرے موتی ٹھکرا کر دیا رہا غیر کے کوئلے پتھروں سے دامن بھرنا دانش مندی کی علامت تو نہیں ہے۔ مجھے تو خبر ہی نہ تھی دادا جان مرحوم کے طے شدہ رشتے کی ورنہ کبھی آپ کو یہ قدم اٹھانے کا مشورہ نہ دیتا۔ بہر حال اس کا بہترین ازالہ نیلو کا انتخاب ہی ہو سکتا تھا جو میں کر چکا ہوں۔“

نبیب حتی انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہونہ! جانے کیا الوکا گوشت کھلا دیا ہے امریکہ والوں نے اسے لوگوں کی اولاد تو اتنی آزادی پسند ہو کے نکلتی ہے اور..... یہ نواب صاحب.....“

وہ بڑبڑاتی، تملاتی الماری میں کھٹاک پھٹاک کرنے لگیں۔ بہر حال بات مانے بغیر گزارا تو نہیں تھا۔ بیٹے کی فرمائش پوری تو کرنا ہی تھی۔

”ارے یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ وہ اوپر میسر پر بیٹھی نوٹس بنارہی تھی جب چہرے پر ہوائیاں لیے لرزتے، ڈگمگاتے قدموں سے نیلو دروازہ کھول کر اس کی سمت آئی۔

”کیا ہوا بھئی؟“ وہ بے اوسان سی نیلو کو دیکھتے ہوئے خود بھی حواس باختہ ہونے لگی۔

”کہیں چچی فرحت کے پروپوزل کا رد عمل تو نہیں؟“

کھٹ سے تمشیں کے ذہن کے درتچے میں یہ خیال لہرایا۔ آگاہ تو وہ ہوتی چکی تھی۔

”تمشی..... تمشی!“ وہ بے دم ہو کر اس کے کندھوں پر ڈھبے گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

تمشیں نے دکھ سے بوجھل گہرا سانس اندر کھینچا اور دھیرے دھیرے اسے تھکنے لگی۔ یقیناً یہ باخبر

”میں نے کب کہا کہ تم خدا نخواستہ، نبیب بھائی سے سابقہ تعلق کے سبب ملی تھیں۔ ایسی بات تو دونوں جانب نہیں ہے لیکن یار! یہ شوہر نام کی جو چیز ہوتی ہے ناں بڑی جلدی بیوی سے بدگمان ہو جاتی ہے۔ تشکیک و تذبذب کا شکار ہونے لگتی ہے خصوصاً اتنے بٹاش، بے تکلف اور خوش خلق انداز میں تم نے کبھی اپنے شوہر سے بات نہیں کی جس طرح نبیب بھائی سے کر رہی تھیں تو ایسے میں حماد بھائی کے دل میں میل آنا لازمی امر ہوگا۔ آخر ان کی بھی عزت نفس ہے۔ شوہر کبھی برداشت نہیں کرتا کہ اس کی بیوی اس کے سامنے کسی دوست کو اہمیت دے اس کی طرف متوجہ رہے۔ پھر تم دونوں کے درمیان تو ویسے بھی تعلق کا کوئی عملی پل نہیں ہے۔“

وہ بڑے تحمل اور تدبر سے اسے سمجھا رہی تھی۔

”اونہ! وہ بے حس سا پتھر دل شخص اس پر کیا اثر پڑے گا۔“

وہ بدستور لا پرواہ تھی۔

نیلو کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھر آئی۔

”تو تم چاہتی ہو کہ اس پر اثر پڑے۔“ وہ براہ راست اس کا چہرہ پڑھ رہی تھی۔

”میری بلا سے۔“ اس نے بے نیازی جتانے کی کوشش کی مگر نیلو کو اس کی یہ تک اترنا آتا تھا۔

”ہوں! دیکھا اسی دن کے لیے تجھے سمجھایا تھا کہ ایک چیٹنج کے لیے زندگی تباہ مت کرو۔ مت اندھا دھند چھلانگ لگاؤ، مگر تم نے کسی کی ایک نہیں سنی اپنی سی کر لی۔“

”تو میں کون سا کسی پہ الزام لگا رہی ہوں۔ کسی کے آگے فریاد کر رہی ہوں۔“ وہ بھڑک اٹھی۔

”میں خوش ہوں جیسی بھی ہوں۔“

”الزام لگانا فریاد کرنا تو ویسے بھی بے سود ہوگا اب ضرورت ہے سمجھوتے“ کی تباہ کی اور یہی

تجھے سب اشارے کناپے میں سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اب چھوڑو یہ پچکا نہ پن جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب سنجیدگی سے عملی زندگی کا آغاز کرو۔“

”تو میں اور کیا کر رہی ہوں؟“ اس کے پلے تو سرے سے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

”یہی تو بات ہے اب دیکھو ناں پہلی رات ہی اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا۔ پھر اس کی ذات سے

اتنی بے نیازی اور بے توجہی کے مظاہرے تمہاری عادت میں شامل ہو چکے ہیں۔ تمہیں کچھ ہوش نہیں

ہوتا کہ تمہارا شوہر کہاں ہے کس حال میں ہے۔ کس چیز کی اسے ضرورت ہے اس کے آرام اس کی

ہو چکی ہے۔

”پلیز نیلو! بی بی ایزی“ پھر کیا ہو گیا؟ ابھی فائل تو نہیں ہوا ناں! میں جمال بھائی اور ارم بھابی سے بات کروں گی۔ انہیں یقیناً تمہاری خوشیاں عزیز ہوں گی گھبراتی کیوں ہو؟“

”تمہی!“ وہ اتنی بے قراری سے زار و قطار رو رہی تھی کہ تمہیں کا حساس دل بے کل سا ہونے لگا۔

”پلیز نیلو! حوصلہ۔“

”وہ..... وہ کہتا ہے..... وہ کہتا ہے لڑکیاں تو ہوتی ہی بے وقوف ہیں۔ مردوں کے دل میں اترنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتیں۔ بجی سیدھی سی بات ہے، میں تو ایسی لڑکی پسند کروں گا جس کا آٹھل بھی کبھی کسی غیر مرد نے نہ دیکھا ہو۔ بھلا اس لڑکی کو کیوں بنانے لگا شریک حیات، جو پانچ سو مردوں کے درمیان کام کرتی ہے۔ ہر دوسرے سے بات چیٹ، جان پہچان اور ہائے نیلو رکھتی ہے، جو میرے سامنے ادا سے بولتی، ہنستی مسکراتی ہے، اپنی لمبے دار باتوں سے رجھاتی ہے، بھی ان سے تعلق تو وقت گزاری کے لیے ہوتا ہے تاکہ کام اچھے ماحول میں کیا جاسکے۔“

”ہیں۔“ تمہیں کی تو سٹی گم ہو گئی۔ ایک ساعت کو لگا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔

”تم عابد ستار کی بات کر رہی ہو؟ کیا اس نے یہ سب تمہیں کہا ہے؟“

”نہیں! آج اپنے کمرے میں کسی گہرے دوست سے باتیں کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میں نے تو اتفاقاً سن لیا۔ اف اللہ تمہیں! میں مر کیوں نہ گئی۔“

وہ وحشت زدہ انداز میں روتی، سسکتی کہہ رہی تھی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اتنا اعلا ظرف، اتنا فہیم اتنا بلند خیال شخص ایسا ہو سکتا ہے۔ اتنی بچک ظرفی اور بے رحمی سے بات کر سکتا ہے! اف میں اسے کیا سمجھتی رہی اور وہ۔ وہ کھلو نا سمجھ کر مجھ سے وقت گزاری کرتا رہا؟“

تمہیں نے گہری سانس لی۔

”یہی تو بات ہے مائی ڈیر نیلو! لڑکیاں جب آفس میں اپنے باس یا سینئر کا گرم جوش اور خیر خواہانہ رویہ دیکھتی ہیں تو ان سے توقعات وابستہ کر کے خواب بننا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ مرد گھر بسانے کے لیے مردوں کی فیلڈ میں کام کرتی لڑکیوں کا چننا نہیں کرتے۔ وہ دفتر میں لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں انہیں بے تکلفانہ اور دوستانہ انداز اپنانے پر اکساتے ہیں ذہنی و طبعی آزادی کی

باتیں کرتے ہیں۔ مرد وزن کے مساوی حقوق کے راگ الاپتے ہیں۔ عورت کو ترقی کی نئی نئی راہیں دکھاتے ہیں لیکن شادی کے لیے گھریلو سی سادہ سی معصوم طبع لڑکی تلاش کرتے ہیں مجھے خبر تھی ایسا ہی ہوگا اسی لیے میں اس کے ذکر سے چڑی تھی۔ تمہیں ہزار ہا مواقع پر اشارتا سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ کسی کی پسند میں ڈھال کے خود پر پابندیاں لگا رہی ہو اس کے دل میں کبھی مقام حاصل نہیں کر پاؤ گی مگر خیر شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم لوگ خود تجربے کرنے کے شوق میں اس حد تک بے قرار ہوتے ہیں کہ ”مجھے ہوئے“ اور ٹھوکر کھائے ہوئے کے تجربات کے نچوڑ سے سبق سیکھنے کو اپنی توہین گردانتے ہیں۔“

کتنی ہی دیر نیلو ترپتی، سسکتی رہی۔ تمہیں گم صدمی اس کی بے کل سسکیاں سنتی رہی۔



رمنہ کے سرال والوں نے اتنی جلدی چائی ہوئی تھی کہ جیلہ بیگم کو شادی کی تاریخ دیتے ہی بن پڑی۔ ادھر آمنہ باجی کے سرال کو بھٹک پڑی تو وہ بھی کشاں کشاں چلے آئے نتیجتاً دونوں بہنوں کی ایک ساتھ رخصتی طے پا گئی۔ دو ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے بیت گیا۔ تیاریاں کرتے کرتے بھی کتنے ہی کام رہتے تھے۔ تائی تو بری طرح بوکھلا ہی گئی تھیں۔ ایسے میں حماد نے مثالی تعاون کیا۔ دونوں بہنوں کے جہیز کی خریداری، شادی کے سلسلے میں کیے جانے والے انتظامات، سب کچھ اس نے سنبھال لیا تھا۔

آج مایوں تھا۔ مہمانوں سے سارا گھر بھرا ہوا تھا کسی جگہ بھی تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ان کا خاندان ویسے بھی بہت وسیع و عریض تھا۔ بقول رمنہ کے پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں ہمارے رشتے دار ”اگے“ ہوئے ہیں۔ اس کے اپنے کمرے میں چار پانچ شادی شدہ خواتین اپنے چپاؤں پیلاؤں سمیت ڈیرے ڈالے ہوئے تھیں۔ رات کو مہمانوں کے کچھ اور قافلے چلے آئے۔ ان کے لیے سونے کا انتظام کرنے کے لیے تائی کی ہدایت پر وہ اپنے کمرے کے بیڈ کے گدے اٹھانے لگی تاکہ انہیں باہر بچھا کر بستر کا عارضی بندوبست کیا جاسکے۔ دوسری سائیڈ کا نوم جو نئی اٹھایا اسے لکڑی کے بیڈ پر ایک تصویر اوندھی پڑی نظر آئی۔ پشت پر لکھا تھا۔

”میری متاع حیات، میری آتی جاتی سانسوں کی ضمانت۔“

اس نے بڑے تجسس سے تصویر سیدھی کی تھی۔

اور پھر جیسے گنگ سی کھڑی رہ گئی۔

اف چہرہ تھا کہ حسن و دلکشی کا مرقع نمونہ اس کے سامنے تھا۔ ہر نقش اتنا سحر انگیز، اتنا پرکشش اور

”لیتی ہیں۔“

گلابی کھلتے ہوئے رنگ کے سنہری کام والے عروسی جوڑے میں زیورات اور ہلکے ہلکے میک اپ کے لوازمات کے ہمراہ وہ اتنی جھج رہی تھی کہ جس جس نے دیکھا بے ساختہ توصیف و ستائش کی۔

”اپنے اُن“ کے سامنے زیادہ مت جاؤ ورنہ وہ بھی خود کو نیا نو پلا دولہا سمجھ کر ہوش کھو بیٹھیں گے۔“ اس کی ایک شادی شدہ کزن نے بڑی معنی خیز نظروں سے کسی کام سے ادھر آتے حماد کو دیکھتے ہوئے شرارت سے تمشیں سے کہا تھا۔

وہ جھینپ سی گئی۔

”امی ادھر مردانے میں کھانا شروع کر دیا ہے۔ ویٹرز کو ادھر زانے میں لگانے کا کہہ دوں؟“ وہ سنی ان سنی کرتا تائی جیلہ سے مخاطب ہوا تھا۔ پھر جتنی دیر ان کے ساتھ کھڑا بات کرتا رہا بھولے سے بھی نگاہ ادھر نہ کی۔ بات ختم کر کے اسی طرح اپنے محتاط سے بنجیدہ انداز میں باہر چلا گیا۔

تمشیں کا دل بچھ سا گیا۔ پھر دوبارہ جتنی بار اس سے سامنا ہوا تمشیں شعوری طور پر اس کی بھرپور نظروں کی منتظر ہی رہی۔ انتہائی سرسری انداز میں اگر اڑتی پڑتی نظر پڑی ہو تو الگ بات ہے ورنہ بطور خاص اس کی دید یا اس سے گفتگو کی ایک بار بھی کوشش نہ کی تھی۔

اس کی روح مجلس کر رہ گئی۔ بے اختیار نظروں میں اسی ماہ جیس کے نقوش لہرا گئے۔ اس کے اندر دور تک جھکن اور اندھیرا اترتا چلا گیا۔ جانے کیوں اسے بھرے پرے ماحول سے بے زاری اور وحشت کا احساس ہونے لگا۔ اک شکستگی اور پڑمردگی سی اعصاب پر برف بن کر جننے لگی تھی۔ محض اس ایک نظر کے لیے؟

یہ سوچتے ہوئے اسے خود بھی کوفت و کلفت ہو رہی تھی۔

دونوں دلہنوں کی مشترکہ رخصتی کے بعد گھر کا آگن اتنے مہمانوں کی موجودگی میں بھی سونا سونا لگنے لگا تھا۔ پوری حویلی کے مشترکہ بڑے سے لان میں آدمی شامیانے برتن اور کرسیاں سمیٹ رہے تھے۔ حماد ان کو احکام دے رہا تھا۔ رور و کرتائی کا سر دکھنے لگا تھا۔

”اپنی تائی کو ایک کپ چائے کے ساتھ کوئی ٹیلیٹ لا دو تمشی۔“ عالیہ بیگم نے ہمدردانہ انداز میں اپنی سدمہن کو دیکھتے ہوئے بیٹی سے کہا۔

”اپنی امی اور خالہ کے لیے بھی بنا لانا تمشی بچے۔ بلکہ یوں کرو بڑے قیلے میں بنا لو۔ مہمانوں میں

بے مثال تھا کہ لڑکی ہونے کے باوجود کتنی ہی دیر اس کی نگاہیں چہرے سے ہٹنا بھول گئیں۔ اس کی سانسیں رکنے سی لگیں۔ اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔

اس نے اکثر اوقات رات کے کسی پہر یا فرصت کے وقت حماد کو کسی تصویر کو گھنٹوں تک اور اس سے سرگوشیاں کرتے دیکھا تھا۔

اؤہ تو یہ وہ ہے۔ وہ دراصل اس ساحرہ کا دیوانہ ہے اسی لیے وہ سارے جہان سے غافل اپنے آپ میں گم رہتا ہے۔ اسی لیے شبِ اولین سے مجھ پر جائز حق کے باوجود اس کا استعمال نہیں کیا۔ ظاہر ہے ایسی ماہ تمام بے مثال حسینہ کے سامنے میری سادہ سی عام سی شخصیت کا داؤ کیوں چلنے لگا۔

وہ جانے کیوں ایسا ج رہی تھی۔ اپنا وجود اپنی خود اعتمادی اسے ہلکی پڑتی نظر آ رہی تھی۔ ایک بار پھر اس نے اس حسین چہرے کو دیکھا۔ عجیب سی بے تابی نے کلی اس کے گرد گھیرا ڈالنے لگی۔

”مجھے اس سے کیا۔ میرا کون سا اس سے کوئی رابطہ رشتہ ہے۔ سب کچھ تو کاغذوں میں دفن ہے۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح خود کو ریلیکس کرنا چاہا مگر اس بار کوئی تاویل و جھجکت دل تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ یونہی خود سے الجھتی الجھتی باہر سے کسی کے پکارنے پر وہ کمرے سے نکل گئی۔



”بس ہمیں نہیں پتا“ آپ کو وہ ڈریس پہننا ہوگا۔ پلیز دیکھیے۔ ہم تو آپ کی شادی میں شرکت نہیں کر سکے تھے لہذا ہمارے لیے تو آپ کی شادی سمجھیے اب ہوگی۔ آج ہی دلہن بنیں گی۔ پلیز جیلہ آئی ان سے سفارش کیجیے ناں۔“

اس کی باہر سے آئی کزن مسلسل اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں کہ شادی کے روز وہ اپنا عروسی جوڑا پہنے پوری دلہن بنے۔

”بچے مان لو ناں۔ ان کی بات۔ ویسے بھی تم نے اس جوڑے کو دوبارہ چھو بھی نہیں ہے زیورات بھی جوں۔ کہ توں پڑے ہیں۔ اچھا موقع ہے اب۔ یہی تو پہننے اوڑھنے کے دن ہوتے ہیں۔“

ایک بوڑھی خاتون بھی سر ہو گئیں۔ کچھ ادھر ادھر سے بھی اصرار بڑھنے لگا تو تنگ آ کر اس کو مانتے ہی بن پڑی۔ جھکے ہار چوڑیاں انگوٹھیاں تو مارے باندھے لیں مگر جھومر لگانے کے لیے اس کی کزنز کو اچھی خاصی بحث کرنا پڑی۔

”اتنا چھوٹا سا تو ہے۔ محسوس بھی نہیں ہوتا۔ اتنا سا تو غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی آج کل پہن ہی

سے بھی اکثر کو طلب ہوگی اور ہاں بچے وہ باہر حماد بیٹے کو بھی ایک کپ دے آنا۔ صبح بے پھر کی طرح گھوم رہا ہے۔ دو منٹ کو ڈھنگ سے نہیں بیٹھا۔“

تائی اپنے دکتے سر کو دباتے عالیہ بیگم کی سمت دیکھتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

”اللہ زندگی دے میرا تو رواں رواں اس کے لیے دعا گو ہے۔ میرے سر سے پہاڑ سا بوجھ ہلکا کر دیا۔ دونوں لڑکیوں کی سوئی سے لے کر صوفہ سیٹ تک سب کچھ خود ہی کیا کرایا۔ اتنی شان سے رخصت کیا ورنہ مجھ میں تو تمہارے بھائی جان (تایا مرحوم) کے بعد کچھ کرنے کرانے کی سکت ہی باقی نہیں رہی ہے۔“

تائی وغیرہ کو پینا کر وہ کپ ہاتھ میں لیے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی لان میں چلی آئی۔ شامیانے اور کرسیاں میز ہٹ جانے سے لان کی وسعت اور اس میں چھایا سناٹا دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ وہ ایک کونے میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے پاؤں پسارے تساہل سے بیٹھا ہوا نظر آ گیا تھا۔ وہ اسی سمت بڑھی تھی۔

”یہ چائے۔“ وہ بازو آنکھوں پر رکھے حتمکن زدہ کیفیت میں بیٹھا تھا۔ جب کافی دیر تک اس کی موجودگی کا نوٹس نہیں لیا گیا تو مجبوراً اسے چونکا پڑا۔

حماد نے تیزی سے بازو پرے ہٹا کر انداز نشست تبدیل کی تھی۔ بلا ارادہ نظر کا اس کی سمت اٹھنا تو فطری امر تھا مگر جس طرح وہ اسے دیکھ کر ٹھنک کر رہ گیا تھا۔ یہ چیز تمشیں کے لیے خاصی خوشگوار سی حیرت کا موجب تھی۔

اس بھر پور نگاہ نے (کہ جس کا لاشعوری طور پر اسے سارا دن انتظار رہا تھا) ایک پل میں اسے اوپر سے نیچے تک جانچ لیا تھا۔ نہ جانے کیوں تمشیں کی نظر جھک سی گئی۔

دوسرے ہی پل وہ اپنی بے ساختگی پر قابو پا چکا تھا اور سر جھٹک کر کپ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”یہ؟“ اس کا انداز سوالیہ تھا۔

”تائی جان نے بھجوائی ہے آپ کے لیے؟“ غالباً تہائی میں ان کے درمیان یہ پہلی گفتگو تھی۔ وہ بہت کم ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے تھے۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد تو ان کے درمیان کوئی ایسا لمحہ نہیں آیا تھا کہ زیادہ دیر تک تہائی میں ایک دوسرے کے پاس رہ کر گفتگو کا سہارا لینا پڑا ہو۔ اس نے چپ چاپ کپ تھام لیا۔

تمشیں کا کام ختم ہو گیا تھا۔ مووہ جانے کے لیے مڑی۔ مڑتے مڑتے جانے یوں اس کے قدموں میں اک لرزش سی آئی تھی۔ ایک لمحے کو وہ جیسے چلنے سے انکاری ہو گئے تھے۔

شاید کچھ کہے یا روکے کہ یہ روپ خالصا چھ سات ماہ پہلے کبھی اسی کے لیے سجایا تھا اور آج بھی۔ مگر دوسری طرف برقی جامد چپ تھی۔ وہ کچھ مایوس اور افسردہ سی ہو کر واپس پلٹی تھی۔ اونہ۔ اعصاب پر تو وہ جادو گرئی سوار ہوگی۔ وہ جانے کیوں جھنجھلا رہی تھی۔



وقت کتنی تیزی سے بدل دیتا ہے یا بدل کے رکھ دیتا ہے حال کو بھی اور صورت حالات کو بھی۔ کتنی جلدی منتہائے نظر اور مدعائے دل بدل جاتا ہے۔

یا شاید نظام فطرت ہی یہی ہے۔ ہونی کو انہونی اور انہونی کو ہونی میں بدل دیتا۔ نیلو کے ہاتھ میں منیب کے نام کی انگوٹھی جگ گئی تھی۔ جذبوں کو تو قرار آیا تھا یا نہیں بہر حال زندگی میں ڈٹھراؤ آ گیا تھا۔ اک ٹھٹکا نال گیا تھا۔ سفید حیات کو۔

ادھر تمشیں کے سارے قرار ایک ایک کر کے لٹتے جا رہے تھے۔ رات کے کسی پہر یا فرصت کے اوقات میں جب بھی حماد اس تصویر کی ”زیارت“ میں مگن ہوتا اس کی جان جل جاتی تھی۔

جانے یہ جذبہ رقابت کہاں سے آن چکا تھا دل میں۔ ادھر تائی جلیلہ اس کے بظاہر بے نیازانہ اور بے اعتبار رنگ ڈھنگ دیکھ کر دن بدن تنگ ہوتی جا رہی تھیں۔ جانے ان میں ساس والا جذبہ کیوں اتنا ڈالنا ہوتا جا رہا تھا۔

حسب معمول اس دفعہ وہ ویک اینڈ پر آیا تو قدرے ست سا تھا۔ ”طبیعت ٹھیک ہے بچے تمہاری!“ تائی نے تشویش سے پوچھا تھا۔ پھر خود ہی ماتھا اور ہاتھ چھو کر دیکھنے لگیں۔

”ہائیں تمہیں تو اچھی خاصی حرارت ہو رہی ہے۔“

”نہیں وہ پچھلے چند دنوں سے بخار تھا۔ اب تو ٹھیک ہوں کافی۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں ان کی تشفی کرائی۔

”خاک ٹھیک ہو۔ شکل سے ہی اتنے بیمار لگ رہے ہو۔ اتنے دن سے وہاں بے آسرا بے سہارا پڑے رہے۔ فون کر دیتے ادھر۔ میں آ جاتی یا بچیوں میں سے کسی کو بھجوا دیتی۔“ تائی خفا ہو رہی تھیں۔



”جاؤ جا کر بستر میں لیٹو۔ اے ریماتہاری بھابی کہاں ہیں۔ حماد کے لیے سوپ بنانا ہے۔“

”وہ نیلواؤ پی کے ہاں ہوں گی۔“

تائی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”اس لڑکی کا تو اپنے گھر جی ہی نہیں لگتا۔ جاؤ بلا کے لاؤ اسے۔ کچھ ہوش نہیں ہوتا محترمہ کو کہ گھر اور شوہر کس حال میں ہیں۔“ وہ بڑبڑا رہی تھیں۔

پھر تھوڑی دیر بعد وہ آتی نظر آئی۔

”تمشیں! تم اب کوئی بچی نہیں ہو۔ ایک شادی شدہ عورت ہو۔ ذمہ داری ہے تم پر۔ کیا ضروری ہے کہ میں منہ سے کہوں تب ہی اثر ہوگا۔“

وہ حیران پریشان تائی کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

”کیا ہو گیا آخر؟“ وہ اب بھی۔

”تمہیں خبر بھی تھی آج حماد نے آنا ہے پھر بھی گھر سے نکل کھڑی ہوئیں۔ خبر ہے کتنی طبیعت خراب ہے اس کی۔ پورا ہفتہ وہاں اکیلا پڑا زلتا رہا ہے۔“

تائی کھری کھری سنار ہی تھیں۔

”کوئی منہ سے کچھ نہیں بولتا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ.....“

”بھابی! میں بناؤں کہ آپ بنالیں گی سوپ۔“ ریمانے دانستہ مداخلت کر کے معاملے کو نپٹایا تھا۔

تمشیں چپ چاپ کچن کی سمت آ گئی۔

”لیجیے۔“ کافی دیر کھڑی رہنے کے باوجود جب وہ متوجہ نہیں ہوا تھا تو مجبوراً اسے کہنا ہی پڑا۔

حماد نے آنکھوں پر سے بازو اٹھا کر چونک کر اسے دیکھا اس کی بخار سے لال براؤن آنکھوں میں

استفہام نمایاں تھا۔

”یہ تائی نے کہا تھا۔“ وہ قدرے ہچکچا کر گویا ہوئی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مہربانی۔“

اپنے ہاتھ میں پکڑی تصویر کیے کے نیچے رکھتے ہوئے اس نے بوجھل گرم سانسیں چھوڑتے

ہوئے بمشکل تمام کہا تھا۔

نجانے رقابت کا گرم گرم سلگتا ہوا احساس کہاں سے در آیا تھا اس کے اندر اسے لگا کہ جیسے وہ چہار

راف سے شعلوں میں گھر گئی ہو۔ ایک آواز کے ساتھ سوپ کا پیالہ ٹیبل پر پٹختے ہوئے وہ اس کی سمت

ہی تھی۔

”مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے آپ کے چو نچلے اٹھانے کا۔ آپ کی امی محترمہ کے شور مچانے پر آئی تھی

نہ مجھے کیا میری جانے بلا۔“ اس نے گویا کسی قسم کا ادھار نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

حماد نے نظریں اٹھا کر پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ وہ بھی اس سمت متوجہ تھی اس کی لال سرخ براؤن

ٹھوں سے نظریں ملتے ہی جانے کیسا کوندا سا لپکا۔ تمشیں کو بس یوں لگا جیسے ابھی دل پسلیاں تو ذکر جسم

ہے باہر نکل آئے گا۔

”یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں اور آپ کے ایک ایک انداز سے ٹپکتی بے زاری بھی میری نگاہ

ہے پوشیدہ نہیں ہے۔“ اس پر بدستور نظریں جمائے اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا تھا۔

”آپ کو جتانے کی ضرورت نہیں تھی۔“

وہ ایک لمحے کو عرق عرق ہو گئی۔ پھر سائینڈ پر رکھی تصویر دیکھ کر اس کے اندر آگ سی بھرنے لگی۔

وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”نہ صرف آپ کو بلکہ اس گھر کے کسی فرد کو بھی یہ بات جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنی

حقیقت اپنے مقام کا بہت اچھی طرح پتا ہے۔ کس کو میری کتنی پروا ہے۔ کون میرے لیے کتنا حساس ہے

برے علم میں ہے۔ اس کا غدی بندھن کی آپ کی نظر میں جو وقعت ہے یہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے

لیکن یہ بات میں آپ کو بہر حال بادر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس میں میری طرف سے کوئی دباؤ نہیں تھا۔

میں نے بہت احتجاج کیا تھا امی جان سے۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں مگر امی جان

کے شدید اصرار پر مجبوراً ہنسا ہوا ہوتا تھا۔“

تمشیں کے تلوؤں سے لگی سر میں پھوٹی۔

”ہاں آپ کیوں راضی ہونے لگے۔ آپ کو کیوں میں پسند آنے لگی۔“ وہ پھٹ پڑی۔ ”آپ کے

دل پر تو یہ ساحرہ راج کر رہی ہے۔ اس کے آگے کیوں مجھے گھاس ڈالنے لگے۔“ اس نے چیخ و تاب

کھاتے ہوئے تصویر اس کی طرف اچھالتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔

اسی لمحے نیلوا اندر داخل ہوئی تھی۔

وہ حیرانی سے کبھی حماد کا شدت ضبط سے سرخ پڑتا چہرہ دیکھ رہی تھی اور کبھی غصے سے ابلی تمشیں کی

طرف جو تصویر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

حماد نے لڑکھڑاتے قدموں سے بیڈ پر پھینکی تصویر کو سیدھا کیا۔ ایک جلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے چلتا دروازے کی سمت اس طرح بڑھا کہ نیلو کو بوکھلا کر ایک سمت ہو جانا پڑا۔ وہ دروازے پر جا کر رک گیا تھا۔

”یہ۔ عورت وہ ہے جس کے پیٹ سے جنم لینے کی بدولت بچپن سے اب تک میں تم سب کی نظروں میں معتبور رہا ہوں۔“

وہ کہہ کر رکنا نہیں تھا آندھی طوفان کی طرح نکل گیا تھا۔ ایک لمحے کو تو تمشیں کے جیسے اعصاب سن ہو کر رہ گئے۔ پھر لکھتے لائے قدموں اس کے پیچھے بھاگی۔

”حماد۔ حماد پلیز رکیے حماد۔“

”حماد بات سننے میری۔“

اس اثنا میں گاڑی اشارت ہونے کی آواز آئی اور اس سے پہلے کہ وہ پورچ تک پہنچی گاڑی گیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔

”کیا ہوا؟“ تائی شینا کراپنے کمرے سے نکلی تھیں۔ ”یہ حماد کہاں چلا گیا۔ اتنے بخار میں؟“ وہ حواس باختہ سی تمشیں کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

وہ جواب دیے بنا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں نیلو سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔

تمشیں نے بیڈ پر گر کر سسکیاں لینا شروع کر دیں۔

نیلو نے گم صم سے انداز میں تصویر سیدی کی اور پھر ششدر سی رہ گئی۔

”ارے یہ تو واقعی کیتی آرا کی تصویر ہے۔ تایا جی کی ڈتھ کے بعد جب ان کے کمرے کی صفائی ہوئی تھی تو ڈائری کے اندر سے نکلی تھی۔“

”نیلو۔ نیلو۔ پلیز ہیپ پی۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

نیلو نے دل موس کر اس کی طرف سمت دیکھا۔

”ہر کام تو انا کرنا ہوتا ہے اور وہ بھی اپنی ضد سے۔ کتنا کہا تھا چیخ قبول کرنے کے چکر میں زندگی برباد نہ کرو پھر کتنا سمجھایا تھا کہ اب حماقت کر بیٹھی ہو تو ڈھنگ سے نبھادو بھی مگر تم نے کسی کی نہیں سنی۔ نہ تائی کے اشارے کنائے نہ عالیہ آنٹی کی تنبیہ اور نہ میری لمبی چوڑی بحث۔ اپنی سی کی۔ اب بھگتو۔“

نیلو صاف اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ جواب میں وہ درد انگیز سسکیاں بھرتی رہی۔ کچھ دیر گوگو کے عالم مڑے رہنے کے بعد بالآخر نیلو کا دل پہنچ گیا۔ اس کے پاس آ کر اسے اٹھایا اور آنسو پونچھتے ہوئے لگی۔ ”غیب ابھی گھر پہ ہوگا۔ جاؤ اسے کہو تمہیں حماد بھائی کی رہائش گاہ پر چھوڑ آئے۔ تمہارے نہ سے پہلے یقیناً پہنچ چکے ہوں گے۔ طبیعت بھی ان کی ٹھیک نہیں۔ اس وقت انہیں تمہاری سخت ضرورت۔ جاؤ اور پچھلی ساری معافیاں تلافیاں کر ڈالو لیمن۔ کوئی نئی حماقت مت کر بیٹھنا۔“

وہ ناک منہ پونچھتی اٹھ بیٹھی تھی۔

”کیا یونہی جھاڑ جھنکاڑ حلیہ لے کر جاؤ گی؟ شکل اور لباس تبدیل کرو نافٹ۔“ نیلو ڈپٹ رہی تھی۔ گاڑی پر سکون سی کالونی میں جا ٹھہری تھی۔ مکانات کی تعمیر و آرائش بہت نفیس اور پر شکوہ تھی۔ غیب پ کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ تیل بجانے پر ایک ملازم ٹائپ چھو کر ابرآمد ہوا۔

”صاحب ہیں؟“

”ہاں جی اپنے کمرے میں لیٹے ہیں۔ کہا ہے کوئی بھی آئے ٹال دینا۔“

”بھئی میں ان کی رشتہ دار ہوں۔ گھر والی۔“ اسے یونہی گیٹ پر جسے دیکھ کر تمشیں نے جھنجھلا کر ست کی تھی۔ لڑکے نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا اور قدرے ہچکچاہٹ کے بعد راستہ دے دیا۔

وہ بیڈ کے پتوں بیچ آڑا تر چھا بازو پہ ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ جانے کیا ہوا اس کے کمرے میں قدم رکھتے ٹین کے ہاتھ پاؤں اور دل کی دھڑکنیں لرزہ اٹھ کا شکار ہونے لگیں۔ وہ بڑی جرأت سے آگے اور اعلا درجے کی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے پر حرارت بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

س نے جیسے کرنٹ کھا کر آنکھوں سے بازو اٹھایا تھا پھر اس پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں تھیرے لگیں۔

”اوہ آپ یہاں۔ کیسے؟“ وہ بہ سرعت اٹھ بیٹھا تھا۔

”مجھے بالآخر نہیں آتا تھا۔“ اس نے سر جھکا کر لرزتی آواز میں کہا۔

”کیا آپ کو معلوم ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

کتکئی ہی دیر بحر جہت میں غوطہ زن ہونے کے بعد وہ بھاری آواز میں بولا تھا۔

”مجھے اچھی طرح معلوم ہے اور یہ بھی کہ یہ بات ایک سال پہلے مجھے کہنی چاہیے تھی۔“ گزرتے کی پشیمانیوں اس کی آنکھوں میں شبنم بن کر جمے لگیں۔

”مجھے علم ہے آپ مجھ سے بہت خفا ہوں گے اور یہ آپ کا حق بھی بنتا ہے مگر کیا سلائی کا موقع بھی نہیں دیں گے؟“ اس کا بازو تھام کر اس پر سرٹکا کے بالآخر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا خود پر کچھ اختیار ہی نہ رہا تھا۔

خود حماد کو بھی پتا نہیں چلا کہ اس کے بازو پھیلے اور کس طرح اس کے نازک وجود کے گرد ایک مضبوط قلعے کی طرح جم گئے۔

تمشیں کی سسکیاں تیز تر ہو گئیں۔ اس کے وجود کا سہارا ملتے ہی ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

”پلیز یار! تمہارا یہ رونا میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔“

حماد نے پر جوش طریقے سے اسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔

”ویسے ایک بات کی میں بھی معذرت چاہتا ہوں۔ میں نے غلط کہا تھا کہ شادی میں میری مرضی شامل نہ تھی۔ سچ پوچھو تو امی کے منہ سے تمہارا نام سن کے میرے دل کی ساری دھڑکنیں تمہارا شور مچانے لگی تھیں۔ تمہارا وجود میری زندگی میں ایک بہت خوب صورت اور خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتا تھا مگر شب اولین کے تمہارے بے زار کن اور بے اعتنا انداز پر میری خودی اور عزت نفس نے مجھ پر پہرے لگا دیے تھے۔“

”آپ ناراض تو نہیں ہیں نا اب۔“ وہ بالآخر رونے کا پروگرام ترک کرنے کے بعد سادگی سے پوچھنے لگی۔

جواب میں وہ ہنس پڑا اور بڑی محبت سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ اسی دم تمشیں کو اپنی پوزیشن کا احساس ہوا۔ اس نے اس کی اتنی قربت کی پیش کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کے بازوؤں کا حصار توڑتے ہوئے پرے ہونا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پوری طرح زنجیر پا ہو چکی تھی۔ بھلا مرد ایک سال کے رے ہوئے جائز شرعی جذبول کے پر جوش اور والہانہ اظہار کا موقع ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔

۲۲۲۲۲۲۲۲

## دل ٹھہر جانے کے موسم

بوفکر

دلیا کی بیل سے ڈھکی ہوئی ٹیرس کی رینگ کے قریب کرسی ٹھیک کر بیٹھتے بیٹھتے وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہو گیا تھا۔ نظریں سامنے ”نشاط منزل“ کے حصے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ دونوں گھروں کے درمیان محض پانچ فٹی تنگ سی گلی تھی۔ دونوں اطراف کے ٹیرس عمارت کی حدود سے کچھ اس طرح لپک کر آگے کو بڑھ آئے تھے۔ سرجوز کر سرگوشیاں کرنے کی شدید حسرت بے چین کیے دے رہی ہو۔ نشاط منزل کے ٹیرس کے نیچے وسیع و عریض صحن تھا جس کے ایک کونے پر چھوٹا سا سرسبز قطعہ بنا ہوا تھا۔ رنگا رنگ موکی یوں سے مزین دیوار کے ساتھ موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ برآمدے کے نزدیک دو تین کین کی سیان بکھری پڑی تھیں اور برآمدے کی دیوار کے ساتھ لمبا چوڑا بوسیدہ سائیکل بچھا تھا۔

حسب معمول ٹیرس اور صحن ”بشری آواز و انداز“ اور حرکات و سکنات کے رنگوں سے کھلا کھلا اور ن تھا۔ ٹیرس کی سفید آہنی رینگ سے فیک لگائے سولہ سترہ سال کی شولڈر رکٹ بالوں والی لڑکی کتاب ماردیے بیٹھی تھی جب کہ نیچے صحن میں ایک طوفان پٹا تھا۔

”ای! اگر آج شام قبل از افطاری آپ کو اپنے پیارے بیٹے نیپو کی جھلک دیکھنے کو نہ ملے تو گھبرائیے گامت۔ بس جان لیجیے گا کہ حضرت اپنے انجام کو پہنچ گئے۔“

اس نے دانت پیستے ہوئے تاک کر تخت کی سمت ہیل والی جوتی کا قائر کیا تھا۔ جواب میں اک دل آویز کراہ بلند ہوئی۔

”اماں دیکھ۔ ہاں دیکھ۔“ اس نے سر کو قاصد بنا کے اندرونی کھلے دروازے سے ماں کو اپنا نالہ و شیون پہنچانے کی سعی کی۔

”کیا کر دیا نیپو بھائی نے آپنی؟“ میسر پر بیٹھی لڑکی نے رینگ پر ہاتھ رکھ کر نیچے کا میدان حشر ملاحظہ کرتے ہوئے کچھ جھنجھلا کر پوچھا تھا۔ اس کی اسٹڈی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔

”اس نے تو جو کرنا تھا کر دیا۔ اب یہ دیکھو کہ میں اس کا کیا کرتی ہوں۔“ آپنی نے جوتی کا دوسرا قائر داغے ہوئے بڑے باعزم لہجے میں جواب دیا۔ وہ ہنس پڑی۔

”کیا؟ چار آٹلیٹ یا چٹنی۔“ اسے بھی لطف آنے لگا تھا۔ نیپو نے بھنا کر اوپر دیکھا۔

”تمہارے کباب بنائے قتل کے تو میں افطاری کے بعد کھاؤں گا۔ فی الحال ذرا دشمن کو منہ کی کھلا دوں۔ جسے میری ایک سال کی اتج سنیا رٹی کا بھی لحاظ نہیں۔“

آپنی بھاگ کر کھلے دروازے سے اندر داخل ہو کر پلک جھپکتے میں اپنی پنسل ہیل کا جوڑا لے آئی تھی۔ اس آتش ہتھیار کا وار ”ڈھاڈا“ خطرناک تھا اور سہنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔

لہذا بچاؤ کے لیے اس نے اندر سے برآمد ہوتے شامت اعمال کے مارے دس بارہ سالہ لڑکے کو ڈھال کی صورت میں آگے کر دیا کہ کچھ اس کا لحاظ کر جائے گی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اس سے پہلے ہی دناؤں قائر کھول چکی تھی۔ چھوٹے میاں تیور اگر گرے۔ تھیر کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔ ایک زنانے دار چیخ ماری اور پورے سر تال اور والیوم کے ساتھ شروع ہو گئے۔ اسی دم اندر سے امی برآمد ہوئیں۔

”میرے اللہ! کیا ہو رہا ہے یہاں۔“ انہوں نے ڈپٹ کر دونوں سے پوچھا جن کا جوش حریفانہ چھوٹے میاں کے منہ کا غار کھٹنے سے کافی حد تک سرد پڑ چکا تھا۔

”مجھے توپ دم کرنے کا پروگرام بتا رہی تھی یہ؟“ نیپو نے جھٹ ماں کے پیچھے پناہ لیتے ہوئے شکایت داغی۔

”آپ کو پتا ہے اس خبیث نے کیا کیا ہے میری قیمتی نئی گورنائلوں کی جرابوں کے ساتھ؟“ آپنی نے خونخوار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے طیش کے عالم میں مٹھیاں بچھ کر ماں سے مخاطب ہو کر کہا

”انہیں اپنے نفل بوٹس کے ساتھ بہن کر گیا تھا کھیلنے۔“

”تو واپس بھی تو کر دی ہیں ناں۔“ ماں کے پیچھے پیچھے چھپے چھپے اس نے سر نکال کر صفائی پیش کی تھی۔ کے تو سر سے لگی اور ٹکوں پر بچھی۔

”واپس اس حال میں کی ہیں کراہ وہ با آسانی کلور و قام کی جگہ استعمال کی جاسکتی ہیں بلکہ ایک اور دو کا کروچ تو ابھی ابھی انہیں سوکھ کر عالم مذہوشی کو پہنچ چکے ہیں۔“

شاہ بخت کو اپنا بے ساختہ قہقہہ ضبط کرنا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا اسی لمحے نیچے سے ربیعہ کی پکار سنائی۔ اسے یہ ڈراما عین کلاگس پر چھوڑ کر نیچے جانا پڑا۔ دودھ والا گھنٹی پہ گھنٹی بج رہا تھا۔

”مائیکریشن کیس کی ساری کارروائی پوری ہو چکی ہے۔ تم کل سے کالج جوائن کر لو اب۔ کالج بس بس بھی دے دی ہے۔“ افطاری کے دوران اس نے بتایا۔ ربیعہ کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔

”جھینکس گاڈ۔ میں تو ان بچیس دونوں میں گھر میں اکیلی رہ رہ کر تنگ آ گئی تھی۔“

”چلو اس طرح میری فکر بھی کچھ کم ہوگی۔ آفس میں بھی سارا وقت تمہاری طرف دھیان لگا رہتا۔“ پکڑوں سے انصاف کرتے ہوئے شاہ بخت نے قدرے طمانیت سے کہا۔ ”نئی جگہ نئے لوگ“

حالات میں ایڈجسٹ کرنا کوہِ گراں زیر کرنے سے کیا کم ہوگا۔

”ہاں! مگر نہ اس قسم کی چھوٹیشن کا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔“ ربیعہ کے چہرے پر حزن و ملال کے نئے لہر آ گئے۔

”نیک اٹ ایزی یار!“ شاہ بخت اس کا ہاتھ تھپتھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم یہ پھیلا داسیٹ لو۔ پھر پڑھ کر داک کے لیے نکلیں گے۔“ اس نے بیرونی دروازے کا رخ کیا۔

”ارے یاد آیا۔ بھائی جان! پاؤ بھر دی لیتے آئیے گا واپسی میں۔“ ربیعہ نے یاد آ جانے پر پیچھے ہٹ کر لگائی تھی۔ وہ سر ہلا کر دروازہ لاک کرنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔



”امی جانی!“ ”نیک بنو نیکی پھیلاؤ“ کی یہ ریہرسل آخر تک جاری رہے گی؟“ چلغوزے نکلتے ہوئے نیپو نے بڑی سنجیدگی سے استفسار کیا تھا۔ ”کم از کم میری ذاتیات کا حال تو بہت پتلا ہکا ہے۔ سنگ روم کا قالین ترستا ہے میرے زمانے بھر کی گرد سے آلودہ جوگرز کے لیس کو۔ میرے

بڑے الگ وارڈ روم میں جس دم کا شکار ہو چلے ہیں۔ کتا میں ریک میں لگی لگی اکڑ گئی ہیں۔ سوزے



”ان کی کوئی اولاد بھی تو ہوگی امی!“ ٹیپو نے ڈرائی فروٹ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے دریافت فرمایا۔

فختل نے کڑی نگاہوں سے گھورتے ہوئے ملامت انگیز لہجے میں کہا۔ ”کچھ حیا کرلو۔ کھوجے کہیں کے۔ سرعام ٹیرس پہ چڑھ کے کھا رہے ہو۔“

آج امی کی آنکھ سحری ختم ہونے سے پانچ منٹ قبل کھلی تھی۔ افراتفری اور جلدی جلدی میں جس کے جوہاتھ لگا کھا کر رسم پوری کی۔ نزل اور فختل تو امی کی ایک دو آوازوں پر بلیک کہتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں مگر ٹیپو کو دس منٹ کی محنت کے بغیر اٹھانا ناممکن تھا لہذا وہ ٹھاٹھ سے ان پر الزام دھر کے کھانے پینے کی تمام حسرتیں پوری کر رہا تھا۔

”تین بچے ہیں اس کے۔ ماشاء اللہ جوان جہان۔“

”اچھا کیا تناسب ہے ان کا؟“ ٹیپو کی رگ معروضی پھڑکی۔ ”میرا مطلب ہے کتنے لڑکے سنگھ اور کتنی لڑکیاں سنگھ ہیں؟“ لڑکے اور لڑکی کے لیے یہ مخصوص اصلاح ان کی ذاتی تخلیق کردہ تھی۔

”اف گدھے! ڈھنگ سے بولا کرو۔ بھلا صغریٰ بھالی یہ سن لیں تو۔“ امی نے فختل سے ٹوکا۔

”امی گدھے ڈھنگ سے کب بولتے ہیں۔ ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے بولتے ہیں۔“ فختل نے شریر نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

”لیں جی۔ ہم نے تائی محترمہ کو بلھانے کا شہید تو نہیں لے رکھا۔“ کچھ کھسیا کر جھنجھلا کر وہ بولا تھا۔

”سب سے چھوٹی عائشہ ہے۔ اپنی نزل کی عمر کی ہوگی۔“ امی نے تفصیلات کی پٹاری کھولی۔

”اچھا۔“ ٹیپو کے لہجہ اور چہرے پر اشتیاق اٹھ آیا۔ ”ماشاء اللہ!“ امی کے گھورنے پر وہ جلدی سے

بولا۔

”اس سے بڑا وقاص ہے۔ یہی کوئی تمہارا ہم عمر ہی ہوگا۔“

”واہ!“ ٹیپو نے مسرت سے کہا۔ ”خوب گزرے گی جول بینکس گے دیوانے دو۔“

”اور اس سے بڑا وقار ہے۔ وہ تو تم سے کافی بڑا ہے۔“ امی تفصیلات کی زمخمل بند کر کے اٹھ کھڑی

ہوئیں۔ ”اب اشوا اور بچھلی گلی میں افطاری دے آؤ۔ فختل تم بھی آؤ پلیٹوں میں لگا دو سامان۔“ امی

نے بچن کے کھلے عقبی دروازے کا رخ کرتے ہوئے دونوں کو ان کی ڈیوٹی بتائی۔

”وقار بھائی کافی بڑا۔ دوسرے معنوں میں تمہارا بوجھ تو ہمارے سینے سے سرکا۔“

ٹیپو نے پر خیال انداز میں معنی خیز نظروں سے فختل کو تازے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی ایک دم

اور ٹائیاں صوفے کی پشت سے جدائی کے عذاب جمیل رہی ہیں اور میں..... میں نشست و برخاست کے شائستہ اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی تمک و دو میں آدھارہ گیا ہوں۔“

”اور میرے حسین بال تیل کے جوہر میں ڈبکیاں لگا کے اوپر سے دوہنے کا غلاف اوڑھ اوڑھ کر تباہ حال ہو چلے ہیں۔ مارے شرم کے بالکل کھوپڑی سے چپک گئے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنے سر پہ منا چٹ چٹیل شفاف میدان ہونے کا گمان ہوتا ہے۔“ ٹیپو نے اپنا در و نامہ ختم کیا تو نزل نے اپنا کھول لیا۔

”مجھے بھی اپنی بکس اور بیگ ڈانٹنگ نمیل کے بجائے الماری میں رکھنے پڑتے ہیں۔“ چھوٹے میاں عمران نے بھی اپنے در و نامے سے ایک اقتباس پیش کیا۔

”اور میں اوپر نیچے آرائش و جمال اور صفائیاں کر کے شفاف چم چم کرتے فرش میں اپنی شکل دیکھ دیکھ کر ادب چکی ہوں۔“ فختل کیوں کسی سے پیچھے رہتی۔ بیگم آفریدی اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں۔

”اللہ رے۔ یہ میری اولاد ہے۔ جی بھر کے روشن کرے گی اماں باوا کا نام۔ صغریٰ بھالی کے سامنے خاک ڈلو ا کے رہے گی میرے چوڑے میں۔“

”آپ نے بھی انہیں ہوا بنا دیا ہے۔ گویا بھالی صغریٰ نہیں بلکہ قیامت صغریٰ آرہی ہو۔“

”جیسے وہ تائی نہیں قصائی ہوں۔ ہماری تو تائی ذبح کرنے کی مشتاق۔“

فختل نے ٹیپو کی تائید کی۔ باہمی اختلافات اور جنگ و جدل اپنی جگہ مگر دوطرفہ مفادات پر ضرب پڑنے کی صورت میں دونوں ایک ہو جاتے تھے۔ امی نے دونوں کو کچا چبا جانے والی نظروں سے گھورا۔

دونوں نے معصومیت سے سر جھکا لیے۔

”اف کب سدھرو گے تم دونوں۔“ انہوں نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ ”لے کے چھوٹوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ بھلا سوچو تو صغریٰ بھالی کیا رائے قائم

کریں گی میرے متعلق کہ اولاد پیدا کی ہے یا بے نتھے تیل؟ تمہیں کیا معلوم کس قدر وضع قطع کی خاتون ہیں وہ۔ انتہا سے زیادہ صفائی پسند۔ کم گو۔ ہمدقت کام میں مگن۔ ادب آداب اور سلیقے طریقے والی۔

کچھ تو میرا بھرم رکھ لینا ان کے سامنے۔“ امی نے خصوصیات تائی صغریٰ کا بار بار کھینچا گیا نقشہ ایک بار پھر دہرایا۔

”اسی لیے تو ہم اپنی فطرت سے ہٹ کر نیک پروین اور دین محمد بنے ہوئے ہیں امی!“ فختل

منمنائی۔

لڑھک کر بیڑھیوں کے پاس کھسک گیا تھا ورنہ فاضل کا پوری قوت سے داغا گیا تر بوز کا اسکڈ میزائل اس کے سر پر آ کر پھوٹا۔



”جی کون؟“ شاہ بخت ہاتھ روم میں غسل کر رہا تھا۔ ڈور بیل مسلسل ڈھنائی سے چیخے جا رہی تھی۔ بالآخر کوئی چارہ کار نہ پا کر رہیجہ خود ہی گیٹ تک آئی تھی۔ بند گیٹ کے دوسری سمت براؤن چمک دار گھنے بالوں سے سجا خوشنما سر جھک رہا تھا۔ تھوڑی سی فراخ پیشانی بھی نظر آ رہی تھی۔ گیٹ کے نچلے خلا سے جھپٹتے دکتے پشاور چپل نے آنے والے کے مرد ہونے کی واضح نشاندہی کی تھی۔ پھر آواز نے اس کی صد فی صد تصدیق کر دی۔

”جی یہ اظہاری لے لیجیے۔ نشاط منزل سے۔“ وہ مترنم رسیلی آواز کی حلاوت اپنے اندر جذب کرتے ہوئے کھٹکھار کر بولا تھا۔

رہیجہ نے تذبذب کے عالم میں گیٹ کے اوپر سے جھپٹتے بالوں کے ڈھیر کو دیکھا۔ گیٹ کے اوپر لگی گرل اتنی اونچی تھی کہ وہ ایڑیاں اٹھا کر بھی باہر سے آئی کوئی چیز نہیں پکڑ سکتی تھی۔

”ایک منٹ ویٹ کیجیے گا۔“ بالآخر کسی نتیجے پر پہنچ کر وہ اندر لپکی۔ چابی سے لاک کھولا۔

”آواز ایسی سریلی ہے تو آواز والی کیسی ہوگی؟“ ٹیپو کی تجسس نگاہیں اوپر اٹھیں اور پھر جیسے واپس پلٹتا بھول گئیں۔ وہ بت بنا دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ مجسم معصومیت، مجسم رعنائی، مجسم سادگی۔ کیا تھا اس پری دس! اس پیکر زبا! اس دلنشین سراپے میں کہ اس کے دل کا ہر خلیہ لرزیدہ ہو گیا تھا۔ دھڑکنیں پہلی توڑ کر اس بت طناز کے قدموں میں لوٹنے کو پھل اٹھی تھیں۔

”جی لائیے۔“ کافی دیر تک اس کی سمت سے کوئی پیش دستی نہ ہونے پر رہیجہ نے بالآخر خود ہی کہا تھا پھر قدرے حیرانی سے اس کے چہرے کی سمت نگاہ دوڑائی۔ اس کی نکلا بازی صبح ثابت ہوئی۔ اس کا براؤن بالوں والا سرد کیکہ کر اس نے اندازہ لگایا تھا کہ ضرور اس بندے کی آنکھیں بھی براؤن ہوں گی مگر ان آنکھوں میں تحریر خمار آلود وارفنتی کیفیت اس کے لیے خاصی بوکھلا دینے والی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنی لابی پلکیں جھپکالیں۔ اس کی غزالی آنکھوں کی اتنی اس کے مڑگاں کی سناں سیدھی ٹیپو کے دل میں پیوست ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ پلیٹ خالی کر کے اپنی طرف سے اس میں کچھ بھرتی کر کے لے آئی۔

”ارے! یہ تکلف کیوں کیا آپ نے۔“ نگاہ سے اس کی آرتی اتارتے ہوئے وہ شائستگی سے

بولاً۔

”شکریہ آپ کا۔“ وہ آہستگی سے کہہ کر اندر کو ہو گئی۔ ٹیپو نے درز دیدہ نگاہ گیٹ سے جھپٹتے سراپے پر ڈالی پھر پانچ فٹی گلی عبور کر کے اپنے گھر کے عقبی دروازے سے اندر کی سمت بڑھ گیا۔ اس کی شرتی آنکھوں میں وہ دلفریب سراپا ہلکورے لے رہا تھا۔

نزاکت اور لطافت وہ کف پا تک کہ حیراں ہوں  
سمن، گل، نسرین، نسرین، دُر پر نیاں مغل

وہ حیرانگی کے عالم میں خود سے مخاطب تھا۔ کس قدر سنجیدہ و سادہ انداز تھا اس کا۔ کتنا شستہ اور شائستہ لہجہ تھا۔ فی زمانہ ایسا مجسمہ حسن و تمکنت کہاں مل سکتا ہے۔ وہ جذب کے عالم میں سوچ رہا تھا۔ بھئی آہ! آج محترم ٹیپو آفریدی بھی بے دل ہو گئے۔



”اسے کہتے ہیں اونچی دکان پھیکا پکوان۔“ ٹیپو نے شدید غیض و غضب کے عالم میں انکشاف کیا تھا۔

”اسے کہتے ہیں ڈھول کا پول کھلنا۔“ فاضل نے بھی دانت پیس کر جوش غضب کا اظہار کیا۔

”اسے کہتے ہیں کھوکھلا چننا باجے گھنا۔“ نزل نے بھی مصرعہ طرح لگایا۔

”اسے کہتے ہیں کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔“ عمران میاں کیوں نہ حصہ لیتے میدان جملہ بازی میں۔

”افوہ..... اب بس بھی کرو۔“ امی کھیائی ہوئی سی بولیں۔ ”اب مجھے کیا خبر تھی۔ ان پانچ سالوں میں صغریٰ آپا اتنی بدل جائیں گی۔“ وہ جھل ہو کر بولیں۔

”اتنی؟“ ٹیپو کا دل جل کر راکھ ہو گیا۔ ”آپ صرف اتنی کی بات کرتی ہیں؟ مرادوایا ہمیں اٹھک بیٹھک کروا کر واکے۔ دن رات تائی کی پر جلال پر نور پر ہیبت صورت نگاہوں میں گھومتی رہتی۔ سانس لیتے سوتے جاگتے آنے والے اندوہ ناک دنوں کا تصور ہولائے رکھتا۔ آپ نے ہمارا خون خشک کر کے رکھ دیا تھا۔“ وہ ہانپنے لگا۔

”اچھا بس ناں!“ امی شرمندہ سی جھنجھلا کر بولیں۔ ”چلو اسی بہانے تم لوگوں کو ڈھنگ تو آیا زندگی کا۔“

”اور ان کے رنگ ڈھنگ ملاحظہ کیے ہیں آپ نے۔ وہ تائی صغریٰ کے ”نوناہوں“ کے؟“ فاضل آگ بگولہ ہو رہی تھی۔

تائی معدائے اہل و عیال قطعی اس سے مختلف تھیں۔ امی کی ساری تصویر کشی پر پانی پھر گیا تھا۔ آج صبح وہ تشریف لائی تھیں۔ انہیں دیکھ کر سب کو جھٹکا سا لگا۔ جدید طرز کا فینسی سا شلوار کرتا پہنے، ٹشو کا دوپٹا گلے میں ڈالے، رنگے ہوئے سرخ بوب کٹ بالوں کے ہمراہ ڈھیرم ڈھیر جیولری اور میک اپ سے جڑیں سراپا۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا تائی محترمہ کا یہ انداز۔ ابھی پانچ چھ سال پہلے تایا جان کی وفات پر امی کو سید گئی تھیں۔ کچھ عرصے بعد وقار کو قطر میں جاب مل گئی تو ساری فیملی ادھر شفٹ ہو گئی۔ اب طویل عرصے بعد وطن واپس آئے تھے۔ پانچ سالوں میں پانچ صدیوں کا فرق سمٹ گیا تھا۔ بیگم آفریدی تو دم بخود رہ گئی تھیں۔ بچوں کو تو انہوں نے صرف قصے ہی سنائے تھے مگر خود وہ تو صغریٰ بھابی کو برسوں سے جانتی تھیں۔ شادی کے ابتدائی سات سال ان کے ہمراہ گزارے تھے۔ پھر آفریدی صاحب کی پوسٹنگ پنڈی ہو گئی۔ یہیں گھر بنا لیا اور پھر جیسے کوئٹہ سے بالکل کٹ ہی گئے اور ان کی اولاد الگ اپنی اپنی جگہ ایک عجوبہ تھی۔

عاشی بی انتہا کی ہونق ڈری سہی چڑیا کی مانند بھاری سی چادر میں ملبوس ماں کے شانے کے پیچھے چھپی لگی بیٹھی تھی۔ اس کی یتیم وحشت زدہ صورت دیکھ کر دل میں بے اختیار ترس اور رحم کا جذبہ ابھرتا تھا۔ دوسرے لمحے ماں بیٹی کو ایک ساتھ دیکھ کر بندہ محضے میں پڑ جاتا تھا کہ آیا جی بھر کر تہقہ لگائے یا دھاڑیں مار اس تضاد کے احتزاج پر ماتم کرے۔

سب سے بڑا وقار۔ انتہا سے زیادہ روڈ ہتھے سے اکھڑ جانے والا مخاطب کو کاٹ کھانے کو دوڑنے والا۔ انتہا سے زیادہ سفاک اور بے رحم تاثرات سے سب سے چہرے والا۔ اس کی سلوٹ زدہ پیشانی پر جمال ہے جو بلوں کی ترتیب یا تعداد میں ان بارہ گھنٹوں میں کوئی فرق پڑا ہو بلکہ نزل نے تو ہر گھنٹے میں پڑنے والے بلوں کے اضافے کا ریکارڈ بنالیا تھا۔

درمیان کا وقاص البتہ کچھ معقول تھا لیکن نارمل بہر حال وہ بھی نہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر منہ پھاڑ کر بے تحاشا ہنستا۔ ہنستے ہوئے اس کے منہ کا پورا غار کھل جاتا تھا جس سے کبھی کبھی شدت شادمانی کے باعث تھوک کے فوارے پھوٹ پڑتے۔ پھر اس کا لہجہ بہت پاٹ دار اور ساعت میں چبھنے والا تھا۔ کچھ ایسا ہی لب و لہجہ خود تائی صغریٰ کا بھی تھا۔

ٹیپو تو ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ”یار شنو! یہ اپنے رشتے دار ہی ہیں ناں۔“ وہ ہر اسماں ہو کر پوچھ رہا تھا۔ ”میرا وجد ان کہتا ہے میرے نہ کبھی مگر تمہارے رشتے دار ضرور لگتے ہیں۔“ شفتل نے سنجیدگی سے مذاق کیا۔ اندر سے وہ بھی بہت مایوس اور دل گرفتہ ہوئی تھی۔

”مجھے تو مینٹل ہاسپٹل سے بھاگی ہوئی کوئی فیملی لگتی ہے۔“ عمران نے خامسے سوچ بچار کے بعد اپنا زیر پیش کیا۔ جواب میں امی نے گھر کا۔

”اے لو۔ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبجان اللہ۔ جاؤ جا کر اپنے بھائیوں کو ان کا لرا دکھاؤ۔“

”ویسے اصولاً تو انہیں پاگل خانے کا رستہ دکھانا چاہیے۔ کیوں؟“ شفتل نے پر خیال انداز میں ٹیپو سے کہا۔

”شنو! اب تم مجھ سے پٹ جاؤ گی۔“ امی ناراض ہونے لگیں۔ ”چلو جا کر نزل کے ساتھ ٹیبل لگواؤ۔ ریٹیپو! تم بازار سے کوک کا ایک کریٹ لے آؤ۔“ انہوں نے سب کو کام پر لگا دیا۔



”ربیعہ! مجھے اوپر چائے پہنچا دینا۔“ شاہ بخت کہہ کر ٹیرس کی سمت بڑھ گیا۔ نشاط منزل کا ٹیرس سب معمول رنگ، روشنی اور خوشبو کی تمام تر لطافتوں اور رونقوں سے معمور تھا البتہ تعداد اور تناسب میں نیرت انگیز طور پر اضافہ ہو چکا تھا۔

”کیا ان کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ کب آئے؟ مجھے تو خبر ہی نہ ہوئی۔“ وہ متحیر سا رہ گیا۔ مالانکہ چپکلے ایک ماہ سے اس گھر کا عقی بن گئی اور ٹیرس اس کی نظروں کے فوکس میں رہا تھا۔ شروع شروع میں تو محض اتفاق نگاہ اٹھ جایا کرتی تھی پھر رفتہ رفتہ نشاط منزل کی رونقیں ہنگامے اس کے معمولات اور لچسپیوں کا جزو بنتے گئے۔ یوں لگتا یہ سب نظارے اس کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ ایک دن اگر ٹیرس پر نہ آتا تو دل نامعلوم سی خلش اور خالی پن کا شکار ہو جاتا۔ یہ شہزیہ کرائے کا گھر ایک ماہ قبل ان کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ ایک حادثے میں ان کے والدین جاں بحق ہو گئے۔ باپ کوئی وسیع و عریض جائیداد چھوڑ کر نہیں مرا تھا۔ بس اتنا تھا کہ اس نے ایم ایس سی کر لیا اور ربیعہ کا انٹر ہو گیا۔ نوکری کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ بڑی تک دو دو اور طویل انتظار کے بعد بالآخر پنڈی میں ایک معقول جاب مل گئی۔ لاہور میں اکیلی بہن کو چھوڑنا ممکن نہ تھا لہذا کالج سے پنڈی مائیگریشن کرائی۔ لاہور کا مکان کرائے پر چڑھایا اور پنڈی شفٹ ہو گئے۔ یہاں نہ کوئی جان پہچان کا بندہ تھا نہ دوست آشنا۔ اجنبی شہر کی اجنبی رہ گزر پرانی خوبصورت یادوں کی راکھ کریدتی۔ دل و جان کو زخم زخم کر دیتی۔ وہ تو بہر حال مرد تھا مگر ربیعہ شروع شروع میں یہاں کی تنہائی، اجنبیت اور ماحول سے بہت وحشت زدہ ہو گئی تھی۔

مختل اس سنگین صورت والے مرد کو چائے پیش کر رہی تھی۔ بڑے خوشگوار سے انداز میں۔ شاہ  
بخت بڑے زور سے چونکا۔ ٹیرس کے دونوں بلب بلب رہے تھے۔ تمام اہل خانہ مع مہمانانِ گرامی  
افکار و ذہن کے بعد کھلے آسمان تلے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چاروں بہن بھائیوں میں  
سب معمولِ نوک جھونک چل رہی تھی۔ کوئی بھی سامنے متوجہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی حرکت کو معیوب جانتے  
ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ نشاط منزل کے ٹیرس کی ریٹنگ آہنی دھات پلشڈ نقاشی کے نازک کام سے  
آراستہ محض سجاوٹ کا کام دیتی تھی لہذا بیٹھ کر بھی ٹیرس کا سارا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ ان کے ہاں کی  
ریٹنگ البتہ ایسی تھی کہ نشاط منزل والے اپنے ہاں سے بیٹھے بیٹھے نہیں جھانک سکتے تھے۔  
اس اکھر سے مرد نے چائے پینے سے انکار کر دیا تھا۔ سو مختل ماں کی ہدایت پر کافی بنا کے لے  
آئی۔

”خیریت ہی ہے مگر آپ کہاں کھوئے ہوئے ہیں۔“ اس نے بھائی کا اتر اتر اے چمین سا چہرہ اور آنکھوں کی مایوس کن کیفیت ملاحظہ کرتے ہوئے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کا تھکا تھکا انداز کسی ذہنی تناؤ کی غمازی کر رہا تھا مگر ہزار اس کے پوچھنے پر بھی وہ ٹال گیا۔



سرسری سی نگاہ ڈال کر وہ گلی میں کھڑے لڑکے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کی سانسیں اٹکنے لگیں۔ افسر عام تذلیل و رسوائی کی داستان کا آغاز ہو چکا تھا۔ کیا سوچ رہی ہوگی وہ اور کس کس سے ذکر کرے گی؟



دکھا کر اک جھلک دل کو نہایت کر گیا بے کل  
آج کل ٹیپو کی زبان پر نظیر اکبر آبادی کے اسی مصرعے کا مترنم درو تھا۔

”افوہ! کیا نظیر صاحب یہی مصرعہ کہہ کر گزر گئے تھے۔“ تو اتار سے ایک ہی فقرے کا بار بار اعادہ  
فصل کی سماعت پر گراں گزرنے لگا تھا۔

”ہرگز نہیں۔“ ٹیپو مخمور آنکھیں کھول کر دھیرے سے مسکرایا۔ ”وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ  
جب ایسا حسن مجھو کا ہو دل تاب بھلا کیوں کر لاوے  
وہ کھڑا چاند کا کلڑا سا جو دیکھ پری کو غش آوے

”یہ اپنے ٹیپو آفریدی صاحب ہی ہیں ناں!“ فصل نے حیرانی سے زل سے دریافت کیا۔ ”بخدا  
ایسا دھیمے سروں میں جتنا ساز اور ایسی شائستہ بیانی کا مظاہرہ پہلی دفعہ میرے سامنے ہوا ہے۔“

ٹیپو اس کا طنز پی کر بدستور دل نشین خیالات میں کھویا رہا۔ اس کی نگاہ میں دل میں دھڑکنوں میں  
تحلیل میں بس ایک چہرہ بس گیا تھا۔ سادہ سنجیدہ، معصوم، شائستہ پر وقار۔ اس کی اک اک ادا نے ہزار بار  
ہزار بار وہ چہرہ میں چشم تصور میں جلوہ گری کر کے حشر پکایا تھا۔

”تم نے بنا دیا ہے کیا سے کیا مجھے۔“ وہ ایک نئی ترنگ سے گنگنا نے لگا۔ فصل کی نگاہوں میں کل  
دو پہر کا منظر روشن ہو گیا۔ بتادوں اسے کہ تمہاری منزل کھوٹی ہے مگر نہیں؟ اس نے دماغ کی تجویز خود  
ہی رد کر دی۔ تصدیق بہر حال ضروری ہے۔ اسی لمحے آندھی طوفان کی رفتار سے عمران عقبی صحن میں  
داخل ہوا۔

”تائی عید کا رڈ خریدنے بازار جا رہی ہیں جس جس نے جانا ہوتا رہا ہو جائے۔“

”ہرا۔ تائی کے ساتھ شاپنگ۔ وہ بھی عید کا رڈ رکے۔“ ٹیپو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ فصل نے بھی  
دروازے کی جانب دوڑ لگانے میں دیر نہیں کی۔ تھوڑی دیر میں سوائے وقار اور بیگم آفریدی کے سب  
لدے لدائے شاپنگ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔



”بھائی کارڈ والے! ہمیں وہ والے کارڈ دکھاؤ جو بہت بیانی فول ہوں۔“ کاسنی کلر کارٹھی لہجہ  
اں ہاتھوں میں سنبھالے سرخ بڑا سا بیگ شانے پر ڈالے۔ سرخ رنگے ہوئے بوب کٹ بالوں  
، سبز جھریوں سے بھرے (جو میک اپ کے انٹری پن کے باعث مزید نمایاں ہو رہی تھیں)  
بے پرتنگین شیشوں کی عینک لگائے اپنی طرف سے وہ بڑی چیز بنی ہوئی تھیں۔ الگ تھلک کونے پر  
چہ کے لیے مناسب سا عید کا رڈ منتخب کرتے شاہ بخت نے کراری سی قدرے الہڑی آوازن کر بے  
نیار پلٹ کر دیکھا۔ بے ساختہ لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ پورا شرارتی ٹولہ مع اپنے مہمانوں  
لے اسٹال کے قریب ایسا تودہ تھا۔

”تائی جان! بلڈی فول تو آپ کے گھر پہ ہی بہتر ہے ہیں۔ آپ بیوٹی فیل پر ہی اکتفا کر لیجیے۔“  
بی تگ دود کے بعد اپنے اندر اچلتے قہقہے کو دبا کر ٹیپو نے جیسے بڑی دردمندی سے مشورہ دیا تھا۔  
دکاندار نے سراٹھا کر بڑی مضحکہ خیز نگاہوں سے بڑی بی کو دیکھا تھا۔ وہ تاک چڑھائے سارے  
کارڈز رینجکٹ کیے جا رہی تھیں۔  
”ہونہ! مومے یہ تو ذرا بھی پارٹی نہیں۔“

”تائی کا مطلب ہے۔ آپ کے ہاں پر بی کارڈ نہیں ہیں۔“

دکاندار کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں زل نے اطمینان سے تائی کی اصطلاح کی وضاحت کی  
تھی۔ شاہ بخت کو حقیقتاً اپنی ہنسی دبانے کے لیے بڑی محنت کرتا پڑی۔ بڑی تگ دود کے بعد اللہ اللہ  
کر کے انہوں نے تین کارڈز خریدے۔ دو سعودیہ میں مقیم اپنے بھائیوں کے لیے اور ایک عاشی بی کی  
متوقع و مجوزہ سسرال کے لیے۔ آخری عید کا رڈ بڑی چھانی کے بعد انہوں نے پسند کیا تھا۔ بقول ان  
کے اس کی پچھر بہت بیانی فول ہے۔ پہلے پہل ٹیپو نے اندر کی انگریزی میں لکھی عبارت پڑھ کر اعتراض  
کیا مگر پھر فصل کے اشارے پر کچھ سوچ کے چپ ہو رہا۔ فصل اور زل نے تائی کے اس انتخاب کی جی  
بھر کے تعریف کی۔ زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ رہا وقاص تو اسے ماں کو بے وقوف بنانے کی  
اسکیم کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ اسی میں خوش منہ پھاڑ کے قہقہے لگا رہا تھا کہ چلو ایک انجوائے منٹ سہی۔



”اور یہ لائی ہوں میں عاشی کے سسرال پوسٹ کرنے کو۔“ گھر آ کر بیگم آفریدی اور وقار کو  
دکھاتے ہوئے تائی بھد تاز بولی تھیں۔ امی نے پڑھ کر جیٹھانی انداز میں جیٹھائی کو دیکھا۔ وقار کی  
پیشانی کی لکیروں میں اضافہ ہو گیا۔

”یہ کیسا..... اٹھالائی ہیں امی! دیکھ تو لیتیں۔“ وہ ناگواری سے بولا۔

”اے لو۔ اچھی طرح دیکھ بھال کے ہی تولائی ہوں۔ دوا دھر مجھے۔“ انہوں نے خفگی سے کارڈ جھٹ لیا۔ وہ تو داد و تحسن کے ڈمگروں کی منتظر تھیں۔ کھول کر بذات خود معائنہ کیا۔ سنبھلے انگریزی حروف پر مشتمل اس لمبی عبارت کو قہقہے انداز میں کھنگالا۔

”اے شغوبی! کیا بتلایا تھا تم نے اس کا مطلب؟“

”تائی اس کا مطلب ہے بہت زیادہ عید مبارک۔“ اس نے کن انگلیوں سے وقار کے مگڑے چہرے کو دیکھتے ہوئے سادگی سے جواب دیا۔ تائی کچھ مطمئن نہ ہوئیں۔

”پر یہ تو بہت لمبی عبارت ہے۔“ وہ سنبھری حروف کو یوں تک رہی تھیں جیسے کھوج لگانا چاہتی ہوں۔

”تو اس کا مطلب ہے تائی کو بہت لمبی، بہت میٹھی، بہت پیاری عید مبارک ہو۔“ ٹیپو نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے متانت سے ان کی تسلی کر دی۔ تائی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

”بھابی یہ کارڈ آپ عاشری کے سسرال روانہ کریں گی۔ یہ تو قطعی نامناسب ہے۔“ اپنی اولاد کی شرارت پر نالاں امی نے قدرے ہچکچا کر انہیں مخاطب کیا۔

”تمہیں زیادہ پتا ہے؟ بس کرو تم۔“ تائی نے ناراضگی سے انہیں دیکھا۔ ”اب اس کے اوپر لکھوں کیا؟ تم لوگ ذرا مجھے گائیڈ کرو۔“ تائی ان کی سمت متوجہ ہو کر کسی نوعمر لڑکی سے اشتیاق سے بولی تھیں۔

”کوئی خوبصورت شعر بتاؤ مجھے۔“

”بالکل بالکل تائی! میں بتاتا ہوں آپ کو۔“ ٹیپو آنکھوں میں شرارت بھرے تائی کے ہمراہ بیٹھ گیا۔

”تائی! یہ والا کیسے رہے گا۔“

ہری ہری ڈالیوں پہ آگیا بور ہے

عید مناؤں کیسے ساجن میرا دور ہے

فختل نے لپک کے تائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مشورہ دیا تھا۔ ”قسم سے اس عبارت کو چار چاند لگا دے گا۔“

”ہٹو شریر۔“ تائی شرما کر ہنس دیں۔ وقاص نے منہ پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔ حسب عادت۔ نزل اور ٹیپو نے اشاروں سے فختل کی پیٹھ چھسکی کہ ”صحیح جارہی ہو“ عاشری بی تو اپنے سسرال کے ذکر پر ہی لاج سے سمٹ کر محفل سے کوچ فرما چکی تھیں۔ امی چائے بنانے کے لیے روانہ ہو چکی تھیں۔ سو بہن بھائیوں کو

لھلھکیٹے کا پورا پورا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ وقار نے تملٹائی ہوئی نگاہ فختل پر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل لیا۔

”ویسے تائی! یہ کارڈ آپ اپنی کسی محبوب ہستی کو دے دیں۔“ ٹیپو نے معنی خیز نگاہ فختل پر ڈال کر نبجیدگی سے تائی کو مشورہ دیا۔ فختل اس کی شرارت پر مسکرا دی۔ محبوب کو بڑا چبا کر زور دے کر ادا کیا تھا۔

”پر تائی جان تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ چچ چچ“ فختل نے انفوس سے سر ہلایا۔

”تو کیا ہوا۔ تائی جاتے ہوئے ساتھ لے جائیے گا یہ کارڈ۔ ایسی کیا بات ہے۔“ ٹیپو نے جیسے تائی کو حوصلہ دیا۔

اک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ چائے میز پر رکھتے ہوئے امی نے غصے سے انہیں گھورا۔

”اللہ سلامت رکھے بھابی کو۔ شرم تو نہیں آتی۔“ وہ جیٹھانی کے سامنے شرمندہ ہوئی جارہی تھیں۔

”کیسی ناہنجار اولاد ہے۔ ان کے منہ پر ان کی موت کی باتیں کر رہی ہے۔“

تائی لاکھ بے وقوف سبھی مگر کچھ نہ کچھ فہم تو رکھتی تھیں۔ انہیں اندازہ ہو چلا تھا کہ کس شان سے وہ بے وقوف بنائی گئی ہیں۔

”اے مجھے گھوٹنا رہے ہیں تمہارے بچے۔“ وہ جیسے بڑے صدمے سے بولیں۔ ”لوڈ راتم پڑھ کے سناؤ“ کیا مطلب ہے اس کا۔ ”انہوں نے کارڈ کے اندر لکھی عبارت دیو رانی کو پڑھنے کے لیے دکھائی۔

”اس کا اردو ترجمہ ہے۔ میرے دل کو مسکراتے لیوں سے چھوؤ۔“ امی نے جیسے ہار کر بالآخر پڑھ دیا۔

ان کا چہرہ قدرے تپ گیا تھا۔ اف کس قدر بکواس جملہ تھا۔ تائی کے چہرے پر زلزلے کے تمام آثار ہویدا ہو گئے۔ ٹیپو اور فختل سب سے پہلے دروازے کی سمت لپکے تھے۔ ان کے پیچھے باقی سب سر پٹ بھاگتے ہوئے فختل کو ریڈور کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ ارد گرد گنگا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

”تم میری ماں کو بے وقوف بنا رہی تھیں؟“ پھولے پھولے سانس درست کرتے ہوئے جونہی اس نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ یکخت اس کا ہاتھ ایک مضبوط کھر درے ہاتھ میں آگیا۔ لہجہ انتہائی درشت اور تند تھا۔ وہ سنائے میں آگئی۔ ”کس نے حق دیا ہے تمہیں ایک معصوم عورت کو درغلانے کا۔“

”جی۔“ اس نے سوکھے لیوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے اسٹگمین تاثرات ملاحظہ کیے۔ ”نیں۔ تائی اور معصوم..... اور جی میں انہیں درغلارہی تھی۔ بھلا کا ہے کو۔“ وہ دل

ہی دل میں وقار کے سفید جھوٹ پر ششدر تھی۔ حیرت تو اسے اس کی جسارت پر بھی ہو رہی تھی۔ کس قدر استحقاق انداز میں اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

”دیکھیے جی! آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم تو یونہی ذرا چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔“ اس نے شائستگی سے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ آزاد کرایا اور پھر وہاں سے چپیت ہونے میں دیر نہیں لگائی۔



”آ..... آپ کو میرا فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟“ وہ رو دینے کو تھی۔ جواب میں اک زوردار قہقہہ گونجا۔

”اجی۔ مہینوں سوئی کے لیے چرواہا بن گیا تھا۔ فرہاد نے اپنی شیریں کے لیے دودھ کی نہر کھود ڈالی تھی۔ بچوں نے سستی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ شہزادہ سلیم نے تاج و تخت ٹھکرا دیے۔ تو کیا ہم آپ کی خاطر آپ کے عشق میں۔ فون نمبر بھی معلوم نہ کر پاتے۔ ویسے اتنی خوفزدہ کیوں ہو گئی ہیں؟ ارے بابا ہم تو تمہارے اپنے ہیں۔“ وہ کمینہ پوری طرح اس کی ہر اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”میرے اللہ!“ ربیعہ نے لرز کر فون بٹخ دیا۔ ”اف کیا کروں میں۔“ وہ سر تاپا کانپ رہی تھی۔ دل پسلیاں تو ذکر باہر نکلنے کو تھا۔ معاملہ کس قدر سنگین ہو چکا تھا۔ مرتش قدموں سے اوپر ٹیس پر آگئی جیسے فون والے کمرے ہی سے کہیں وہ خبیث برآمد ہو جائے گا۔ ”اف“ زور سے آنکھیں میچ کے اس نے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اسی لمحے کاغذی پتھر زور سے آ کر اس کے قدموں میں گرا۔ وہ زور سے اچھل پڑی۔ وہ ہر طرف سے اسے گھیرنے کے چکر میں تھا۔ مارے دہشت اور بے بسی کے اس کے آنسو نکل آئے۔ اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ اس پتھر کو اٹھا کر کہیں ادھر ادھر کر ڈیتی اور دوسرے ہی لمحے جیسے اس کا سانس بند ہونے لگا۔ ایک کے بعد دوسرا کاغذی پتھر بوگن ویلیا کی تیل سے الجھتا ہوا آ کر گر رہا تھا۔

”ظہر و ذرا۔“ کہنے انسان..... کیا کر رہے ہو تم؟“ اک کرخت کڑکتی ہوئی زنانہ آواز پر گلی میں منتظر موٹنجیس سنوارتے لڑکے نے اوپر دیکھا اور جیسے سنائے میں آ گیا۔

”وہ۔ جی۔ وہ میں۔“ لڑکا قدرے گھٹکھٹا کر آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ ”وہ جی میری پتنگ“ فکرا دھر آ گری تھی۔ تو۔“ اس کے چٹکے چھوٹ گئے تھے۔

اری پتنگ نہیں خبیث انسان! تمہاری شامت تمہیں ادھر لاتی ہے۔ ظہر و ذرا میں بلاتی ہوں

ٹیپو کو اور امی کو بھیجتی ہوں تمہارے گھر مرع تمہارے کاغذی پیامبروں کے۔ تمہارے مولانا والد صاحب کو تمہاری عشقیہ وارداتوں کی خبر ہوگی تو دیکھنا جو انجام ہوگا وہ سارا غلہ دیکھے گا۔ کیا خیال ہے۔ دو تین سال پہلے والا واقعہ فراموش کر گئے۔“ وہ ریٹنگ پر دونوں ہاتھ جمائے بڑے اطمینان سے استہزاءیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ لہجے میں سختی، طنز اور تسخر کے ساتھ ساتھ بے پناہ مضبوطی اور اعتماد تھا۔ ہیر و صاحب منت سماجت کرنے لگے۔

”بس جی۔ چھوڑیں جی۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ وہ لجاجت سے کہہ کر مڑنے لگا۔

”ظہر و ذرا اپنے دلیپ کمار صاحب!“ پیچھے سے آواز آئی۔ ”یہ اپنے پتھر ہمراہ لیتے جاؤ۔ کسی دوسرے محلے میں آزما لیتا۔ سسڑا یہ دونوں پتھر اس کے منہ پر مارو۔“ وہ ربیعہ سے مخاطب ہوئی۔ ربیعہ نے لرزتے ہاتھوں سے دونوں پتھر نیچے پھینک دیے۔ وہ کھیانا سا ہو کر انہیں اٹھا کر جیب میں ڈالنے لگا۔ ”اور ہاں۔ اب اس محلے میں نظر آئے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ فٹنل نے دمکی آمیز لہجے میں خجالت سے لبریز چہرے لیے شرمندہ قدموں سے جاتے ہوئے دلیپ کمار سے مخاطب ہو کر کہا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد لڑکے نے مڑ کر دیکھا۔ فٹنل کو ہنوز ٹیس پر ایسا تادہ دیکھ کر اس نے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور سر پٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ فٹنل ہاتھ جھاڑ کر ہنستی ہوئی اندر چلی گئی۔ آنکھوں میں شکر کے آنسو لیے رندھے ہوئے گلے سے ربیعہ نے اسے پکارنا چاہا مگر اس اثنا میں وہ دروازہ پار کر چکی تھی۔

”اوہ گاڈ۔“ اس نے طویل سانس لے کر کرسی کی پشت پر سر رکھ دیا۔ کس طرح جان اور آن بچائی تھی اس نے اس کی۔ وہ ممنونیت کے جذبات سے لبریز ہو کر سوچ رہی تھی۔ فٹنل کا پاٹ داڑگر جتا ہوا انداز تصور میں در آیا اور ساتھ ہی بھیگی ملی بنے اس ہیر و صاحب کی درگت یاد آ گئی۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”سارا طرہ بھسم ہو گیا محترم کا۔ کس طرح خون خشک کر رکھا تھا میرا۔ اعصاب شل کر ڈالے تھے۔ مگر وہ اس سے اتنا مرعوب کیوں ہو گیا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی پسینے چھونٹنے لگے تھے اور اس کا لہجہ بھی کچھ۔ ارے ہاں وہ کہہ تو رہی تھی کہ پچھلے دو تین سال پہلے کا واقعہ فراموش کر گئے؟“ وہ گتھی سلجھا رہی تھی حالیہ واقعے کی۔

”اچھا چھوڑو۔ کل سے کالج جائیں گے۔ وہیں ان سے پوچھ لوں گی اور شکریہ بھی ادا کر دوں گی۔“

اس نے سرشاری سے سوچ کر خود کو تسلی دی۔ اتنا تو اسے علم ہو ہی چکا تھا کہ وہ اسی کے کالج میں

پڑھتی تھی۔

”شفواتی بے وقوف نہیں ہے جو صورت حال کو نہ سنبھال سکے۔ پھر وہ کوئی غیر تو نہیں ہیں۔“ امی، ٹیپو کی رائے سن کر برا سامنہ بنا کر جوابا کہا۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ ٹیپو کندھے اچکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔  
”پھر فٹنل! تمہاری کیا رائے ہے۔ مجھے فائنلی بتاؤ۔ بھابی نے فون کا تانا باندا ہوا ہے جواب نہ کے لیے۔“

امی کی بات پر فٹنل نے نظراٹھا کر بغور ان کا چہرہ جانچا۔ ان کے تاثرات سے واضح تھا کہ وہ اس شے کی زبردست حامی تھیں اور اس کی جانب سے یقیناً ہاں کی متنی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی پھر چہرہ امود کر کہنے لگی۔  
”آپ جو کچھ بھی کیجیے گا میرے فائل ایگزٹام کے بعد۔“

وہ باہر نکل گئی تھی اگر کوئی خوشی نہیں تھی تو کوئی دکھ بھی نہ تھا۔ بس اک خالی پن کا احساس ہو رہا تھا۔  
ار کا چہرہ تخیل کی وادی میں ابھرا۔ تانتا، غنیش وغضب کے تمام رنگوں سے مزین بے مروت سا راز۔ بے رخی اور بد مزاجی کا حامل رویہ۔

”چلو مسٹر ویکھ لیں گے تمہیں۔ ہم اپنا نظرف اپنائیں گے تم اپنا قہر۔“ وہ کچھ سوچ کر مطمئن ہو گئی۔



”سنیے۔ وہ آپ بی ایس سی فائل کی فٹنل آفریدی کو جانتی ہیں؟“ نور تھہا ایر کی ایک لڑکی کو روک کر اس نے قدرے جھجک کر پوچھا تھا۔ وہ ابھی کالج کے ماحول اور اسٹوڈنٹس کے مزاج سے واقفیت اصل نہیں کر سکی تھی۔ ہنوز خود کو اپنے آپ میں سیٹ کے رکھتی۔ محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر قدم ٹٹاتی۔ لڑکی نے مڑ کر سر تاپا سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غایت درجہ حیرت تھی۔

”بھئی۔ انہیں کون نہیں جانتا ہوگا۔ پریذیڈنٹ ہیں یونین کی۔“ وہ اپنی اعلیٰ پر شرمندہ سی ہو گئی۔  
”جی۔ میرا مطلب ہے۔ ابھی۔ اس وقت کہاں مل سکتی ہیں۔“ اس نے بے قراری سے کہا۔ ”یا ان کا کون سا پیریڈ فری ہوتا ہے۔ کچھ پتا ہے آپ کو؟“

”اس وقت؟“ لڑکی نے اپنی رست و آج پر نگاہ دوڑائی۔ ”ویسے تو وہ ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔“ وہ گھڑی کی سوئی کی رفتار ملاحظہ کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”اس وقت شاید یونین کے آفس میں ہوں گی۔“ بتا کر وہ آگے بڑھ گئی۔ ربیچہ کوریڈور عبور کرتی آفس کی طرف لپکی۔

اطلاع تو درست تھی مگر موقع محل کوئی نہیں تھا۔ وہ دو تین اساتذہ اور پھر یونین کے دوسرے ممبران



قدرے تذبذب کے عالم میں بے بسی سے فٹنل نے انہیں دیکھا۔

”امی! میں کیا رائے دوں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔

”آپ خود دانا دینا ہیں۔ تجربہ کار ہیں جیسے آپ کہیں۔“ اس نے سر جھکا لیا۔ امی نے عمیق نگاہوں سے بیٹی کے کچھ بے چین سے کچھ خفا سے تاثرات نوٹ کیے۔ وہ بائیں پیر کے انگوٹھے سے قالین کا کوتا کرید رہی تھی۔ پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔

”اب کروں بھی کیا؟“ امی نے اس سے زیادہ خود کو تادیل پیش کی۔  
”تمہارے پاپا کا بھی اصرار ہے کہ بھابی کی درخواست قبول کر لیں۔ کس قدر رشتیں کر رہی تھیں۔ یاد نہیں ریلوے اسٹیشن پر رخصت ہوتے وقت بھی بدستور اصرار کیے جا رہی تھیں۔ تمہارے پاپا کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس طرح دونوں خاندان ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے۔ فاصلے کم ہوں گے پھر انہیں وقار کی پر سنائی پسند آئی ہے البتہ انہوں نے کہا ہے تمہاری مرضی پوچھے بغیر ہم بھابی کو کوئی رسپانس نہیں دیں گے۔“

”امی! میرے خیال میں یہ رشتہ کچھ بے جوڑ سا ہے۔“ ٹیپو نے سنجیدگی سے ماں کو اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

”وقار بھائی اور شنو کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”شادی کے بعد مرد و عورت دونوں بدل جاتے ہیں۔ یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔“ امی نے بغیر نظر اٹھائے کہا۔

”ابتدا سے جو عادات پروان چڑھتی ہیں جو مزاج اور شخصیت تشکیل پاتی ہے وہ آگے جا کر نہیں بدلتی اور بدلے بھی تو کتنی حد تک؟ ان کا رویہ کس قدر روکھا پھیکا تو ہیں آمیز اور مغرورانہ ہے۔ یہ تو آپ کے سامنے کی بات ہے۔“ ٹیپو نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”شنوان کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو پائے گی۔ ہم لوگوں کو آپ نے بہت کھلا بڑا روشن پرسکون ماحول دیا ہے۔ انسان کو انسان سے مربوط رکھنے کا ہنر سکھایا ہے۔ ایسے شفاف ماحول سے کٹ کر اس پر آگندہ طبع خاندان میں یہ کیسے ضم ہو سکے گی؟ نہیں امی ان لوگوں کا مزاج ہم سے میل نہیں کھاتا۔“ ٹیپو بدستور اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ ”میری نظر میں یہ کوئی مستحسن اقدام نہیں ہوگا۔“



میں گہری بیٹھی تھی۔ ”چلو اس پیریڈ کے بعد سہی۔“ اس نے مایوسی کو بھگاتے ہوئے سوچا۔

پھر وقتاً فوقتاً ہر پیریڈ میں کوریڈور اسٹاف روم ڈیپارٹمنٹس کالج گراؤنڈ ہال اور کلرک روم وغیرہ میں جھانکتی چکر لگاتی رہی۔ ہر جگہ وہ مل جاتی تھی مگر کسی دوسرے سے بات کرتی اور یہ جرأت وہ خود میں نہیں پاتی تھی کہ براہ راست سب کے سامنے مخاطب کرے۔ کلاسز آف ہونے کے بعد دل گرفتگی کے عالم میں وہ بس اسٹینڈ کے پاس آئی۔ اپنے مطلوبہ روٹ کی بس میں شخص ٹھنسا کے کھڑے ہونے کی جگہ ڈھونڈی۔ بسیں چلنے کو تیار آخری تین بی ہارن دے رہی تھیں۔ پہلے پہل تو اتنے رش میں اسے اپنا دم گھٹنا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ کبھی کالج یا اسکول بس کی عادی نہیں رہی تھی۔ ہمیشہ ابو جان یا بخت بھائی پک ایڈ ڈراپ کرتے تھے مگر اب صورت حال مختلف تھی۔

”ہے لڑکی! ادھر آ جاؤ۔“ دفعتاً کسی نے پیچھے سے اس کا دوپٹا کھینچتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ قدرے بوکھلائے گھبرائے انداز میں اور پھر جیسے ساکت رہ گئی۔

”آپ!“ خوشی سے چھلکتے لہجے میں اس کے قریب کھسکتی ہوئی ساتھ بیٹھ گئی جہاں پہلے فختل کا بیگ دھرا تھا۔

”تھینکس۔ میں آپ کو پورے دو ہفتوں سے ڈھونڈ رہی تھی۔ کہاں تھیں آپ؟“ وہ بے تاب سے دریافت کر رہی تھی۔ ”مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ آپ نے اتنے بڑے جنجال سے میری جان چھڑا دی۔“

وہ بغیر سانس لیے بولے جارہی تھی مبادا پھر کوئی فختل کو اپنے میں انگیج کر لے۔

”بھئی میری متنگی کا سلسلہ تھا اس لیے چھٹی پہ تھی۔“ اڑتے بالوں کو سمیٹتے ہوئے اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ ربیعہ نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”اتنے بے نیاز سے انداز میں اتنی اہم خبر؟“ کوئی شرم یا جھجک یا دھیرج پن نہیں تھا اس کے انداز میں۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ ”ہاں وہ میں کل بازار گیا تھا اس لیے۔“ اس کا ارادہ تو تھا فختل کو اس تعلق کی نسبت سے شوخ سے انداز میں چیخنے کا مگر اس کا لاپرواہانہ سا انداز دیکھ کر ملتوی کر دیا۔

”آ۔ آپ۔ کیا جانتی تھیں اس فنڈے کو؟“ اس نے نظریں جھکا کر دھڑکتے دل سے آغاز کیا۔ ”ارے بھئی اسے کون نہیں جانتا۔ عشق اور مشک کی طرح بدقاشی بھی چھپائے نہیں چھپتی۔“ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے اس نے واقعہ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

”سہ حال اہم کسی قسم کے اندیشے کو دل میں جگہ نہ دو۔“

اس نے بے تکلفانہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”وہ آئندہ تمہارے سائے کو بھی چھونے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اگر تم پہلے دن سے ہی خوفزدہ ہونے کے بجائے اس کی طبیعت صاف کر دیتیں تو وہ لفظ کبھی دوبارہ ادھر نہ آتا۔ اس قسم کے اسٹریٹ ہیز و مقابل کے ماتھے پر پڑتے بل دیکھ کر اس کا سخت لہجہ سن کر ہی پانی ہو جاتے ہیں۔“ فختل بیگ سے نیل کٹر نکال کر ناخن کاٹنے لگی۔ ”پھر وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا ہے۔ ایک دفعہ میرا فون نمبر کہیں سے مل گیا اسے۔ لے کر تنگ کر مارا۔ میں نے کیا کیا۔ اس کے گھر کا پتا نوٹ کیا۔ باپ کا نام پڑھا اور ڈائریکٹری سے نمبر کھنگال کر ساری داستان اس کے باپ کو کہہ سنائی۔ شام کو امی اس کی ماں کے ہاں گئیں۔ ٹیپو نے مار مار کر اس کا بھر کس نکال دیا۔ دیکھا تھا اس دن کیسے میری شکل دیکھ کر بدک کے بھاگا تھا۔ بزدل۔“ اس نے ہونٹ سکڑ کے کہا۔ ربیعہ اس کے پر اعتماد لہجے اس کے پرسکون اور قدرے بے نیاز سے انداز اس کے چہرے اور آنکھوں سے ہویدا مضبوطی اور پر حکمت تاثرات سے بہت متاثر ہوئی۔

”کبھی آنا ہمارے ہاں بھئی۔“ اسٹاپ پر اترتے ہوئے فختل نے اسے دعوت دی۔

”جی ضرور۔“ اس کے لہجے میں خلوص کی خوشبو محسوس کر کے ربیعہ نے مسکرا کر وعدہ کر لیا۔ بلکہ اگلے ہفتے سہ پہر کو وعدہ پورا کرنے کے لیے وہ سچ سچ چلی آئی۔

عقبی دروازہ ٹیپو نے کھولا تھا۔

”جی وہ مجھے۔ فختل سے ملتا ہے۔“ جانے کیوں وہ گھبرا سی گئی تھی۔ وہ بھنورا سی بھوری آنکھیں جیسے اس کے چہرے پر گڑ کر رہ گئی تھیں۔ نظروں کی تیش سے اس کے پسینے چھوٹنے لگے۔ وہ ایک تک اسے گھورے جارہا تھا۔ شعلہ فشاں رخساروں پر خمدار پلکوں کا رقص ٹیپو کا کل ضبط و قرار لوٹنے لیے جارہا تھا۔ اس کا دلنشین سراپا اس کے ہوش و حواس جھین کر لے گیا۔ وہ ایک تک پاگلوں کی طرح اسے تک رہا تھا۔

”وہ۔ میں۔“ ربیعہ کے اوسان خطا ہونے لگے۔ ہاتھ ملتے ہوئے پھنسے پھنسے گلے سے کہا۔

”اوہ۔ آئیے پلیز۔“ ٹیپو بھی جیسے ہوش میں آ گیا۔

راستہ چھوڑ کر اندر آنے کی دعوت دی۔ ربیعہ بمشکل اپنے اڑے ہوئے حواس مجتمع کر کے اندر کی سمت بڑھی تھی۔

ٹیگم آفریدی نے بہت خوش اخلاقی سے اس کی پذیرائی کی۔

”جاؤ ٹیپو! شنو کو جگاؤ جا کر۔“

ای نے بظاہر ٹیپ ریکارڈ کے اندرونی پرزوں کی صفائی میں مگن ایک کونے پر بیٹھے ٹیپ سے کہا جو باطن پوری طرح ان کی باتوں پر کان لگائے متوجہ تھا۔ ساتھ میں اڑتی پڑتی نگاہ ربیعہ کے دلفریب کھڑے پر بھی ڈال لیتا۔

”وہ امی۔ میں۔ اور اسے اٹھاؤں۔“ اس نے گڑبڑا کر ماں کو دیکھا۔ پھر کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”میں واضح طور پر معذرت کا طالب ہوں۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں محترمہ پہلا فائر ہائی ہیل والی جوتی کا داغی ہیں۔ میرے سر پر تو دیے بھی یہی چار بال رہ گئے ہیں۔“ اس نے اپنے گھنے چمکدار براؤن بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے قطعیت سے کہا۔

”افوہ! امی جھنجھلا گئیں۔“ جاؤ عمران تم۔“

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق عمران میاں ہوم ورک چھوڑ کر حکم کی تعمیل میں اٹھے۔ محض پانچ منٹ بعد ان کی لڑخیز خیز چیخ سے سارا گھر گونج اٹھا۔

”الہی خیر۔ یہ کیا ہوا۔“ ربیعہ نے دہل کر دھڑ دھڑ کرتے دل پر ہاتھ رکھا۔

”وہی جس سے بچنے کے لیے میں نے معذرت چاہی تھی۔“ ٹیپو نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

”آف جاؤ نزل تم۔“ انہوں نے بزیوں کی گوڑی میں تندی سے مصروف نزل سے کہا اور خود عمران کی خستہ حالی ملاحظہ کرنے ادھر لپکیں۔ تھوڑی دیر میں ماتھے پر گومڑ بجائے وہ بھی ہائے وائے کرتی واپس آ گئی۔

”امی! دیکھ لیجیہ میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔“

عمران اور نزل کی حالت زار ملاحظہ کرتے ہوئے ٹیپو نے خوفزدہ ہو کر ماں کو دیکھا۔ وہ زچ ہو کر خود ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”کیا فحشل روزا سی طرح اٹھتی ہیں؟“ وہ ہراساں ہو کر پوچھ رہی تھی۔

”نہیں جی۔ دراصل دن کو جب وہ سوتی ہیں تو اپنی مرضی سے پانچ بجے اٹھتی ہیں۔ اس سے پہلے اگر انہیں اٹھانے کی کوشش کی جائے تو اٹھانے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔“ ماتھے کا گومڑ سہلاتے ہوئے نزل نے وقتی طور پر آہوں کراہوں کا سلسلہ منقطع کر کے جواب دیا تھا۔

امی کی چندرہ منٹ کی جانفشانی سے کی گئی کوششوں کے نتیجے میں وہ اس کے سامنے تھی۔ بڑے

فریش خوشگوار اور مطمئن انداز میں۔ کوئی دیکھ کر قیامت تک تسلیم نہ کر پاتا کہ چند ساعت قبل ہونے والی خوریزی میں اس کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔

ربیعہ کے جانے کے بعد ٹیپو نے جی بھر کے فحشل کے لئے لیے۔

”یہ ڈھنگ ہے۔ کون سا دستور ہے یہ۔ گدھے کی طرح پڑی اینڈ تی رہتی ہیں۔ محترمہ۔ کوئی بھلے

انتظار کی سولی پہ لٹکا ادھ موا ہو جائے۔“ وہ چین بجیں ہو کر کہہ رہا تھا۔

”اگلے گھر جائیں گی تو چار چوٹ کی مار کھائیں گی۔ اچھا ہے۔ وقار بھائی سے تمہارا پالا پڑا ہے۔

درست کر دیں گے تمہیں بد عادتوں سمیت۔“ وہ سگ کر بڑبڑا رہا تھا۔

”تم کیوں تاؤ کھا رہے ہو۔ ہیں۔“ فحشل نے اطمینان سے کہتے ہوئے اسے سرتاپا دیکھا۔

”تمہارا کام تو نکل گیا ہے ناں۔ تمہیں کیا مطلب میرے معاملات سے؟“ اسے شان سے ڈپٹ

کر وہ امی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”میرا خیال ہے اس کے لیے بھی کوئی کھوٹا تلاش کر ہی لیں۔ ویسے یہ

ربیعہ کیسی لگی آپ کو؟ کیا خیال ہے آپ کا اس کے بارے میں؟“

”اوہ تمہارے منہ میں کتنی شکر۔“ ٹیپو تو گویا نہال ہو گیا۔ بس نہیں چل رہا تھا ابھی بلائیں لے ڈالے

اس کی۔ کس قدر من پسند موضوع چھیڑا تھا اس نے۔ وہ ماں کی رائے جاننے کو پوری طرح ہمدن گوش

ہو گیا۔



اس سے پہلے چھ جوں مینہ برسنے والا محاورہ اردو کمپوزیشن میں پڑھا تھا۔ آج اس کا عملی مظاہرہ بھی

دیکھ لیا۔ لگتا ہے سچ اللہ میاں چھان بھر بھر کراٹ رہا ہے۔“ اس نے ایک نظر تر بتر لباس پر ڈالی پھر

برہم سی ہو کر آسمان کو دیکھا۔

”اللہ! آج تو کوئی قلمی سچویشن بھی نمودار نہ ہونے کی قسم کھائے بیٹھی ہے۔ مجال ہے جو ایک بھی

گاڑی والا گزرا ہو۔“ اس نے کوفت سے سر جھٹکا۔ اس کوفت کا سبب سوچ سوچ کو وہ کھول رہی تھی۔

سراسر میری اپنی کوتاہی ہے۔

پہرے دے کر ٹھیک بارہ بجے ہال سے نکل کر وہ بس اسٹینڈ کی سمت ہی بڑھی تھی۔ بس نے ساڑھے

بارہ بجے روانہ ہونا تھا۔ ان کے فائل کے ایگزٹ ہور ہے تھے۔ باقی سب کلاسز کی چھٹیاں تھیں۔ سو

سارے شہر کے اسٹاپ کی لڑکیوں کو پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ذمہ داری ایک بس کے سپرد تھی۔ ابھی

اسٹاف روم کے آگے سے گزر رہی تھی کہ مسز شمع انچارج یونین نے آواز دے کر بلا لیا۔ کانو وکیشن کے

ہیں فاضل۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔ اس نے بلا حیل و حجت۔ گاڑی میں سوار ہو کے بڑی ہمت دکھائی تھی اور اب سوچ رہی تھی کچھ ایسا غلط بھی نہیں کیا اندھا اعتماد کر کے۔ بے شک دو بدقسمی ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر ربیعہ کے مزاج اور طبیعت کو ملحوظ خاطر رکھ کر اس نے اس کے بھائی کی پیشکش قبول کی تھی۔ شاہ بخت نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا۔ آنا نانا ایک خیال فاضل کے دماغ میں در آیا۔

”آپ کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے یہاں؟“ اس نے طریقے سے بات شروع کی۔ ”میرا مطلب ہے کوئی بزرگ شخصیت؟“

”نہیں۔“ شاہ بخت نے قدرے حیران ہو کر جواب دیا۔ یہ سوال اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

”اس کا مطلب ہے۔ ربیعہ کے سلسلے میں کوئی بات ہو تو براہ راست آپ سے کرنا ہوگی۔“ اس نے کسی نتیجے پر پہنچ کر کہا۔

”ربیعہ کے سلسلے میں؟“ وہ زور سے چونکا۔ ”مگر کیا بات؟“ اس کی حیرت حد سے سوا تھی۔

”کیا آپ نے ربیعہ کی شادی نہیں کرنی؟“ اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال جڑ دیا۔

”اوہ۔ تو یہ بات ہے۔“ وہ سمجھ گیا تھا۔ ٹیپو گویا اس کے تصور میں آ کھڑا ہوا۔

”یہیں روک دیجئے گا پلیز۔“ گھر کے قریب کے مین روڈ پر اس نے یہ غلت کہا۔ بریک لگاتے ہوئے شاہ بخت کے ہونٹوں پر اک پر اسرار تبسم چل اٹھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس کی مسکراہٹ کا مطلب اخذ کرتے ہوئے فاضل نے پورے اعتماد اور سنجیدگی سے کہا۔ ”میری فیملی کو میرے کردار پر میرے عمل پر میری شخصیت پر پورا بھروسہ اور اعتبار ہے۔ مگر گلی کے گھروں کی کھلی کھڑکیوں سے جھانکتے ہر چہرے کو اعتبار نہ آپ دلا سکتے ہیں نہ میں۔“ وہ گاڑی سے اتر گئی۔

”آپ کا بے حد شکریہ۔“

کہہ کر تیز تیز قدموں سے گلی میں داخل ہو گئی۔

اس سے بے خبر کہ دونگا ہیں اس کے ہر قدم پر ہمارے ہر تھیں۔ اس کے معدوم ہوتے سرائے کو اپنے اندر جذب کر رہی تھیں۔



”کس کا کارڈ ہے بھی؟“ ربیعہ کو سفید دعوتی کارڈ الٹ پلٹ کرتے دیکھ کر شاہ بخت نے دریافت کیا۔

سلسلے میں اسے ممبران یونین کے فرائض کی لسٹ گنوائے لگیں۔ پھر دیگر تفصیلات میں وقت کٹنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ مگو خلاصی کر کے جب اسٹینڈ پر پہنچی تو بس نکل چکی تھی۔ سارے اسٹاپس سے ہو کر واپس آنے میں کم از کم سوا گھنٹہ ضرور درکار تھا۔ آسمان پر کالی بدلیاں نقش و نگار بنا رہی تھیں۔ غضب کا جس تھا۔ پورا کالج سنسان پڑا تھا۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ بس ڈرائیور دوبارہ واپس آ کر نئے سرے سے ڈیوٹی بھگتارنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔ بہر حال اس کا کچھ قصور نہیں تھا۔ روانگی کا ٹائم فکس تھا۔ وہ رہ گئی تھی تو اپنی لا پرواہی کے باعث۔

کچھ سوچ کر اس نے پبلک بس اسٹاپ کی سمت جانے کی ٹھان لی۔ ابھی راہ میں ہی تھی کہ بارش نے آن لیا۔ کوئی چارہ کار نہ پا کر مزید سفر ملتوی کرتے ہوئے سڑک کے کنارے ایک پیئر تلے کھڑی ہو گئی۔ ارد گرد وحشت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فاضل نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ دفعتاً ایک کروڑا اس کے قریب آرکی۔ فلمی پنچویشن کے عین مطابق گاڑی والے نے تیزی سے پچھلا دروازہ کھول دیا۔

”آئیے۔“ برستی بو چھاڑ میں وہ ہنسی و ہنسی رہ گئی۔ ”تشریف لائیے پلیز۔ اس طرح آپ کا یہاں کھڑا ہونا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔“ شیشہ نیچے کرتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے اس پر اک نگاہ ڈال کر کہا تھا۔ لہجہ قطعی پن لیے ہوئے تھا۔ فاضل نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بے اختیار اطمینان کی سانس لیتے ہوئے برق رفتاری سے اندر براجمان ہو گئی۔ یہ سامنے والا پڑوسی تھا۔ ربیعہ کا بھائی۔ شاہ بخت۔ اندر کے گرم خوشگوار ماحول میں اپنی الجھی لٹیں پیچھے کرتے ہوئے ایک لمحے کو خود پر نگاہ کی۔ ذہن میں شاہ بخت کا کہا ہوا فقرہ نکرایا اور وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ حقیقتاً بھی وہ سرتاپا شرابور تھی۔ سفید سوتی لباس بھیگ کر بدن سے چپک رہا تھا۔ بڑا سا کاشن کا دوپٹا بھی گیلیا ہو کر اپنا فرض نبھانے سے معذور ہو گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے سٹ کر سامنے دیکھا۔ وہ باوقار سنجیدگی و متانت لیے نظریں وڈا اسکرین پر جمائے ڈرائیونگ میں مگن تھا۔ ایک بار بھی بیک مرر اس پر فوکس کرنے کی کوشش نہیں کی۔

”آپ غالباً کالج سے آ رہی تھیں۔ مگر ربیعہ تو کہہ رہی تھی سروریکشن ہیں آج کل۔“ کافی دیر بعد اس نے سوال کیا۔ نظریں بدستور سامنے مرکوز تھیں۔ اس کا لہجہ بھاری اور گہمیر سا تھا۔ اک عجیب دلکش سا چادر لیے ہوئے۔

”ہاں تھراڈ ایر والوں کو بلکہ باقی سب کو چھٹیاں ہیں۔ میرے بی۔ ایس۔ سی کے ایگرام ہو رہے

”نشاط منزل سے آیا ہے۔“ وہ کارڈ کی عبارت پڑھ رہی تھی۔ ”اور جناب یہ سلسلہ شادی خانہ آبادی دختر نیک اختر آنرہ فٹنل آفریدی کی۔“ وہ خوشگوار انداز میں بتا رہی تھی۔ ”زبردست بہت لطف آئے گا اتنے عرصے بعد۔“ مسکراتی نگاہ بھائی پر ڈال کر تائید حاصل کرنا چاہی تو حیران رہ گئی۔ شاہ بخت کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں اک بے چین سی بے کل سی وحشت بھر گئی تھی۔

”کیا ہوا بھائی جان۔ خیریت؟“ اس کا بازو تھام کر ربیعہ نے حیرانی سے پوچھا۔

”آں۔ ہاں۔ خیریت ہی ہے۔“ اس کا لہجہ بہت پڑخوردہ اور تھکا تھکا سا تھا۔ جانے کس بارگراں نے اسے اتنا نڈھال کر دیا تھا۔ ربیعہ کچھ بھی اخذ نہ کر پائی۔

”وہ آپ پرسوں کہہ رہے تھے ایک خوبصورت سی مزے کی بات بتائیں گے؟“ ربیعہ نے بھائی کی آشفٹ شغلی میں بدلنے کے لیے موضوع سخن بدل ڈالا۔

”یونہی کہا تھا۔“ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں دھیرے سے کہا۔ ”اب وہ خوبصورت مزے کی بات زہریلے بگولوں تلے مدفون ہو گئی ہے۔ اب تو صرف دل کو یہ سمجھانا باقی ہے کہ۔“

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برس گئیں

دل بے خبر میری بات سن اسے بھول جا

وہ بڑی تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ ربیعہ بحیرت میں غوطہ زن ہلتے پردے کو دیکھتی رہ گئی۔

”انہیں کیا ہوا؟“ اس کے دل میں کھدبھد ہو رہی تھی۔ ”کہیں یہ شادی تو۔ اودھ۔“ وہ اپنی نکتہ رسائی پر خود ہی انگشت بدنداں رہ گئی۔ انتہا کو چھو تاخیر رفتہ رفتہ دم پڑتا گیا۔ سارے لہجے ریشم ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے۔



شادی کے بعد عورت جسمانی لحاظ سے تو بدلتی ہی ہے ذہنی اور شخصی لحاظ سے بھی بدل جاتی ہے۔

بلند بانگ قہقہہ شادی کے بعد ہنسی میں بدل جاتے ہیں۔

ہنسی مسکراہٹ میں ڈھل جاتی ہے۔

مسکراہٹ اک خوشگوار تاثر میں سمٹ جاتی ہے۔

اور خوشگوار تاثر محض سر ہلا کر اثبات لہنی میں جواب دینے کی حد تک محدود ہو جاتا ہے۔

شاید ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا اور حد درجہ جھٹا رومی کا مظاہرہ کرنا ہی نئی نویلی دلہن کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے والدین کی تربیت، عزیزوں کی پیار بھری تنبیہ اور خاندان کا وقار

ت آبرو کا احساس جاگزیں ہوتا ہے۔ لڑکی کا تجربہ اور عمر چاہے کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو شادی کے روہ خود بخود نصاب زندگی پڑھ لیتی ہے۔

شادی کے اس بندھن میں دونوں فریق ایک دوسرے کی آسودگی اور تکمیل کے ضامن ٹھہرتے ہیں۔ تکمیل کا یہ فطری ربط تو ان کے مابین بھی استوار ہو چکا تھا مگر آسودگی..... آسودگی شاید دونوں میں سے کسی کے نصیب کے کے افتخار پر نہیں جگمگاتی تھی۔ جانے اس میں کس کا دوش تھا۔ اک تکلف اک لرزہ اک سپاٹ اونچی دیواری حائل محسوس ہوتی تھی دونوں کے بیچ۔ بہر حال فٹنل کا کافی حد تک مطمئن فی۔ اس نے تو یوں بھی کوئی ہوش ربا گھٹان ٹھیل نہیں سجا یا تھا۔ باعتبار ہونکتہ رس ہو اور دوستانہ پنائیت سے پیش آئے۔

”آپ کے لیے چائے لاؤں وقار؟“ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے خوشگوار سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔ وقار نے سر اٹھا کر بغور اس کا چہرہ مٹولا۔

”نہیں۔“ آہستگی سے کہہ کر وہ اخبار میں گم ہو گیا تھا۔ اس سے قطعی بے نیاز کہ اس کے بیڑوم کے رومان پر در ماحول میں اک رنگین وجود کا اضافہ ہو چکا ہے۔ وہ دھیرج سے قدم اٹھاتی اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ وقار نے نگاہ اٹھا کر ناگواری سے دیکھا البتہ بولا کچھ نہیں۔ شیشے کی رنگین چوڑیوں کی جھنکار یہاں سے وہاں فضا میں کھنک اٹھی تھی۔

”چھوڑیے بھی۔ اتنے آفت موسم میں کس بور کام میں لگے ہوئے ہیں۔ آئیے گھومنے چلیں۔ میں نے تو ابھی تک باہر سے کوئٹہ دیکھا بھی نہیں۔“ ناز بھری ادا سے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر فٹنل نے مسکرا کر کہا۔

وقار نے ایک سنگین برقاب نگاہ اس پر ڈالی۔

”میں اپنی ذاتیات میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔“ سرد لہجے میں اک بے رحم سی تنبیہ چھپی ہوئی تھی اس نے پھر سے اخبار پھیل کر پڑھنا شروع کر دیا۔

فٹنل اپنی اہانت پر ایک لمحے کو دم بخود رہ گئی۔ سراسیمہ ہو کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوپیسے کے کاغذ کے ٹکڑے کے آگے اس کی لاکھوں کروڑوں کی بے بہا تادریستی اس کے نزدیک گویا دو کوڑی کی حیثیت بھی نہ رکھتی تھی۔ اس کی اتار پر کاری ضرب پڑی۔ کچھ سوچ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

رات گئے شب کے تاریک سنائے میں جب دوبار فطری جذبوں سے مغلوب ہو کر اس کا کوئل گداز لطیف وجود اپنے حصار میں لینے کو بڑھو تو وہ شکوہ کیے بنانہ رہ سکی۔



”یاد ہے؟“ آپ نے دو پہر کو کس بری طرح مجھے ہرٹ کیا تھا۔ بہت سنگدل ہیں آپ!“  
”تمہارا ہی ہوں اب تو۔ صحیح کر لینا۔“ اس نے مدہوش سے لہجے میں سرگوشی کی تھی۔ فحشل کا انگ  
انگ سرشار ہو گیا۔



”واہ بھیا! بہن سے تو خیر کیا شکایت ہے۔ تم بھی ماں کو بھول گئے شادی کے بعد؟“ طنز یہ ہنسی لیے  
تائی نے دریافت کیا تھا۔ فحشل ایک لمحے کو چوری بن گئی۔  
”کیا بات کرتی ہیں امی! مجھ سے یہ توقع ہے آپ کو؟“ وہ ماں کے گرد بازو کا حصار باندھتے  
قطیعت سے بولا۔ ”اور ہاں ڈاکٹر کے ہاں گئی تھیں آپ؟“  
”تو میری فکر میں نہ گھلا کر میرے چاند۔“ منٹا کالا ڈیپارگو پائل کر بیٹھے لگا۔  
”اس گھر میں عورت عزت و توجہ کی حقدار ہے تو پہلے میری ماں اور بہن ہیں۔ میں ان کے ساتھ کسی  
قسم کی زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔ سمجھیں تم!“ کمرے میں آ کر وہ شعلہ بارنگا ہوں سے اسے گھور رہا  
تھا۔

”تو میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ ”مجھ پر خفا کیوں ہو رہے ہیں۔ میں تو خود ان کا بہت  
احترام کرتی ہوں۔ ہمیں تو شروع سے ہی امی پاپا نے یہ بات عملی طور پر سمجھا دی تھی۔“  
”آئی نو اٹ ویل!“ وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔ ”میری ماں کا جو احترام تمہارے گھر میں تم سمیت  
تمہاری فیملی نے پیش کیا تھا وہ میرے حافطے میں محفوظ ہے۔“ وہ بہت تلخ ہو رہا تھا۔  
”چھوڑیے بھی۔ کیا بیکار کی باتیں لے بیٹھے۔ آفس کو دیر ہو رہی ہے۔“ اس نے ماحول کا تناؤ دور  
کرنے کے لیے بات بدل دی۔

”بیکار باتیں نہیں ہیں یہ۔“ وہ سختی سے بولا۔ ”بلکہ کان کھول کر سن لو۔ امی کے حضور کی محنتی تمہاری  
ایک معمولی گستاخی پر میں تمہاری جان لینے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔“  
فحشل سن سی کھڑی رہ گئی۔ جانے کیوں ماں کے معاملے میں وہ اتنا حساس تھا۔ بھلا یہ کوئی بات  
تھی۔ ہو کیا جاتا ہے انہیں؟ وہ اس کے رنگ بدلنے والے رویوں پر ششدر تھی۔



”ادھر آؤ عاشی! میرے پاس۔“ فحشل نے نرمی سے پکارا۔ ”یہاں بیٹھو۔“ اس نے پکڑ کر اپنے  
- قریب بٹھالیا۔

”یہ کیا مجھول ساحلیہ بنا رکھا ہے تم نے۔ ہیں؟“ اس نے سر تاپا بدرنگ سی مٹیا لے رنگ کی چادر اور  
ب وغریب طرز کے کرتے شلوار میں ملبوس ہوئی بنی عاشی کو دیکھا جو حسب معمول اس کی توجہ اور نرم  
تاری کے آگے حواس باختہ ہوئی جا رہی تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہنسیوں احمقانہ انداز  
، اچکائے نروس سی پلکیں جھپکاتے اپنی طرف سے بہت اعتماد اور سکون کا مظاہرہ کر رہی تھی۔  
ملاہٹ چھپانے کے لیے ہاتھ کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ فحشل کو اس پر بڑا ترس آتا۔ وہ اس کا مسئلہ  
تھ گئی تھی۔ شاید اب تک کسی نے موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اسے اپنی شخصیت اجاگر کرنے آگے بڑھ کر  
ل کرنے اور اپنی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے کا۔

اسے اس بابت خبر نہ تھی کہ اس کی ہم عمر لڑکیاں کیسا طرز عمل اپناتی ہیں۔ کیسے رہتی ہیں۔ کیسے خواب  
بستی ہیں۔ (اس کام کے لیے اس کی اماں جو بہت تھیں) یہی وجہ تھی کہ وہ ”لڑکیوں“ سے میل ملاپ  
کے دوران بھی اس طرح گھبرا لجا جاتی تھی جیسے اس کے مخاطب بھاری بھر کمردانہ شخصیات ہوں۔ فحشل  
ل ہی دل میں خاصی حیران اور فکر مند بھی تھی۔

”ارے کیسے گزرے گی بھی تمہاری آگے جا کے؟ کسی لڑکی ہو۔ نہ تمہاری پاس پڑوس میں کوئی  
بھی سہیلی ہے۔ نہ اپنے عزیز واقارب سے گھلتی ملتی ہو۔ نہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ طریقہ ہے۔ یا! یہ تو  
نہارے لیے بہت نقصان دہ ہے۔“

اس کا ہاتھ تھا مے وہ سچائی بے نقاب کر رہی تھی۔  
”دیکھو اپنے اندر دوسروں کا سامنا کرنے کی جرأت پیدا کرو۔ خداوند قدوس نے تمہیں گویائی دی  
ہے۔ ایک نعمت عظمیٰ عطا فرمائی ہے۔ بجھی اس کو خوبصورتی سے نزاکت و لطافت اور اعتماد سے بروئے  
کار لاؤ۔ یقین مانو انسان محض لہجے آنکھوں اور انداز کے اعتماد سے سونہندوں کو جیت سکتا ہے۔“  
”رہنے دو بی بی! ہمیں اپنی بیٹی کو منہ پھٹ اور بے لگام نہیں بنانا۔ تم یہ سبق اپنے بہن بھائیوں کے  
لیے ہی رکھ چھوڑو تو ہم پر کرم ہوگا۔“

تائی کی ناراض ناراض آواز پر فحشل حیرت سے بت بن گئی۔ وہ تو بہت غلوں سے درد مندی سے  
سمجھا رہی تھی۔ اسے زندگی کے رنگ ڈھنگ شیب و فراز سے آگاہ کر رہی تھی بلکہ دل میں اس کی  
شخصیت بنانے کا عزم صمیم باندھے بیٹھی تھی اور ”بہن بھائیوں کے لیے رکھ چھوڑو“ اس طنز یہ قہرے پر  
وہ ششدر رہ گئی۔

کیا یہ وہی تائی ہیں جو دن رات ہمیں اپنے زبزیں اعزازات سے نوازا کرتی تھیں؟

”ہاں بھئی شاباش آدمی کو اسی طرح بن سنور کے یک سک سے ٹپ ٹاپ سے رہنا چاہیے۔“  
 ”بھئی یہ کون سا ہیرا سا نکل ہے۔ یہ کچھ سوٹ نہیں کر رہا تم پر۔ میری مانو چلو میرے ساتھ ”بیانی پالر۔“ میں تمہارا بودا بنوا کر لاتی ہوں۔“ وہ بڑے خلوص بڑی دردمندانہ رازداری سے مشورہ و تبصرہ نشر کرتیں۔

اسے کیا کہا جاتا ہے ”چراغ تلے اندھیرا“ یا پھر یہ بات اس کے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔  
 ”تائی! میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ اسے اللہ رکھے بھرے پرے گھر میں جاتا ہے بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ ہر رنگ کا ہر طرز کا ہر مزاج کا بندہ وہاں ہوگا۔ اگر یہی حال رہا تو اس کے لیے بہت مسئلہ ہو جائے گا۔“ اس نے بڑے سلیقے سے پراعتماد انداز میں وضاحت کی۔ اسی دم دروازے پر نگاہ پڑی وہ اضطراب کی کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کب سے کھڑا تھا وہ۔  
 ”پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ۔ ابھی چند دن پہلے میں نے کیا کہا تھا تم سے۔ یاد ہے؟“ وہ اندر آ گیا۔  
 بڑے خطرناک تیور لیے۔ فحشل اندر ہی اندر کانپ سی گئی۔

”دقار! میں نے ان کے حضور کوئی گستاخی نہیں کی اور نہ ہی ایسا سوچ سکتی ہوں۔“ اس نے اپنی بدحواسی پر قابو پاتے ہوئے سنبھل کر کہا۔ (میں نے کیا کیا ہے جو خوف زدہ ہو رہی ہوں)  
 ”ناں بھئی! تم اپنا علم اپنے پاس تالے میں بند کر کے رکھو۔ ہم جیسے جاہل پاگل ہیں ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔“ بیٹے کی مضبوط قلعہ جیسی ہستی کے ہوتے ہوئے انہیں کاہے کی جھجک غم۔ لا جواب کر دیے جانے کا خدشہ ہوتا۔ بڑے جتانے والے انداز میں بظاہر بہت انکساری سے بولیں۔ لہجے کا تجاہل عروج پر تھا۔ جانتی تھیں اب بیٹا غضب کے آسمان سے جا کر اترے گا اور ہوا بھی یہی۔ وہ بلا کے غضب ناک تاثرات سمیت اس کی سمت بڑھا تھا۔

”تم ہمارا مذاق اڑاتی ہو۔ بڑا گمان ہے تمہیں اپنی اعلیٰ تعلیم کا۔ شہری طرز زندگی کا۔ تہذیب و تمدن؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا قریب آیا اور دوسرے لمحے فحشل کے رخسار پر بھرپور طمانچہ اپنا نشان چھوڑ گیا۔

”ارے کیوں الجھ بڑے تم۔“ تائی آگ لگا کے تماشا دیکھ کے گویا اب مطمئن ہو گئی تھیں۔ بڑی ہمدردی اور جیسے کب قدر فحشگی سے بیٹے کو لٹاڑا۔ پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”چھوڑو بیٹی! آؤ اندر اب۔ تم بھی ذرا زبان قابو میں رکھا کرو۔ مرد کے آگے اونچی آواز میں بات نہیں کرتے۔ اس کی مردانگی اور غرور پر ضرب پڑتی ہے۔ غالباً یہ تمہاری امی نے نہیں بتایا تمہیں!“

جب نیت کھری ہو۔ شعور و لاشعور دونوں آمادگی و سپردگی سے وجدان کا لائحہ عمل تسلیم کر لیں۔  
 دل کا تھال سچائی و سادگی کے موتیوں سے بھرا ہو۔ ہر ہر جنبش ہر ہر ادا ہر سانس پاکیزگی، سنجیدگی و گفتگو کا مظہر ہو۔

احترام انسانیت، تقاضائے بشریت، رضائے الہی کے زریں اسرار و مردوں اصول و ضوابط پالنے سے متاکی آغوش اور پدرانہ شفقت نے ازیر کر دیے ہوں۔

ایسے خود اعتماد و وسیع القلب، شریف النفس، شان استغنائی رکھنے والے وجود پہ کیا گزرتی ہے جب اس سے ہیر تک بدگمانی کے چھینٹوں سے نہلا دیا جاتا ہے۔ جب اس کی روح کانٹوں میں رگیدی جاتی ہے۔

بنا تصور بلا جواز بغیر وضاحت کے۔

فحشل پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا تھا جہاں وہ حد درجہ رنجیدہ تھی۔ وہاں بے انتہا متعجب بھی تھی۔ اسے ران کا کسی زمانے میں کیا گیا بے لاگ تبصرہ یاد آ گیا۔ ”مجھے تو یہ مینٹل ہاسپٹل سے بھاگی ہوئی کوئی بلی لگتی ہے۔“

فحشل کو چار ماہ ہو چلے تھے اس خاندان میں شرعی طور پر ضم ہوئے مگر ربط میل جول بے تکلفی، ہم ہنگی، دہنی قربت ہر محاذ پر اسے پسپا ہونا پڑا تھا۔ فیملی کے دیگر ارکان سے تو خیر کیا واقفیت ہوتی اسے تو پنے سر کے سائیں کی بھی خاک سمجھ نہ آئی تھی۔ وہی اس کے پٹے نہ پڑا تھا جانے کہاں کہاں کی کب کی بیزار یوں، تمنیوں اور انتقام میں گندھ گیا تھا وقار کا وجود۔ بسا اوقات فحشل کو تعجب ہوتا کیا یہ شخص حس طیف سے قطعی کورا ہے؟

چوڑیوں کی مدھر جھکاؤ لہجہ کا لوچ دار ریشم، نگاہ کی خفیف بجلیاں، لطافت و نزاکت، نزہت و گفتگو سے گندھا سراپا، کھلکھلا تا وارفہ و دیوتہ پر سکون انداز، ہر ہر ادا سے ٹپکتا وفا و ایقان کا مظہر منہ بولتا ثبوت۔ کچھ بھی تو اس کے پتھر لیے اعصاب پر جھرنے نہیں بہا تا تھا۔

کیسا شخص تھا وہ۔ الجھا الجھا، نکھرا ٹوٹا، خود سے خفا۔ سارے زمانے سے خوف زدہ۔ اس خوف اور سراپہ کی کو بظاہر اس نے بلند گرد چدار آواز اور سنگین و سرد تاثرات تلے چھپا لیا تھا۔ خود پہ ماسک چڑھا لیا تھا۔

مکروہ راز پانچ گئی تھی اور غالباً یہی وقار کی آسان تک اونچی انا کے لیے تازیانہ تھا۔

”کیسی بستی ہے یہ۔“ لان کے گھپ اندھیرے میں بیٹھی وہ ادھر ادھر بھاگتی دوڑتی، آزادی سے

ڈیرہ جناتی خلعت اور خامشی سے پوچھ رہی تھی۔

بصارتوں کے یقین سے عاری۔ ساعتوں کی لغزشوں پہ قیامت کا اعتبار رکھنے والی۔ پریشان حال خود اپنا پتا ڈھونڈتی ہوئی، حواس باختہ، چلن سے لگی۔ نقابوں میں بند، انا کے گھوڑے پر سوار ہو کے اپنی ہستی مٹا ڈالنے والی۔



”خالہ! میں پچھلے چھ ماہ سے عذاب جھیل رہی ہوں۔ اب تھک ہار کے آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ تو حسین فیملی کے شبستان کے رموز سے بھی آگاہ ہوں گی۔ کچھ بتلایئے مجھے۔ کوئی جگنو، کوئی تپلی، کوئی رستہ۔ کچھ تو بھر رہنمائی عطا کیجیے۔“ اس نے دل کھول دیا تھا۔

حاجرہ خالہ تائی کے عزیزوں میں سے تھیں۔ روز کا آنا جانا لگا رہتا۔ ایک یہی واحد ہستی تھی جو فضل کو بہت با اعتبار اور شعور و فہم کے زیور سے آراستہ محسوس ہوتی۔ قریبی اسکول میں سینڈ ہیڈ مسٹر لیس بھی تھیں۔ یقیناً کوئی شطرنج کا مہرہ اس کی جیت کے لیے منتخب کرنے کا مشورہ دے سکتی تھیں۔ سو وہ عرض مدعا لے کر ان کے گھر آئی تھی۔ صاف صاف سب کچھ بتلا دیا تھا۔

”جو کچھ ان کے ساتھ ہوا اس واقعے کا جوابی رد عمل یہی ہوتا تھا۔ یہ بات باعث تعجب نہیں ہوتی تھی اگر یہ اس کے شوگر نہ ہو جاتے۔“ حاجرہ خالہ نے بہت سکون سے کہنا شروع کیا۔ فضل نے الجھن بھری نظروں سے انہیں دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

”سیدھی سی بات ہے بیٹا! جو شخص ساری عمر پانی کی ایک ایک بوند کے لیے ہزار بار ترسا ہو اس کے سامنے یکا یک میٹھے دودھ کی نہریں رواں ہو جائیں تو کیا آپ اس سے صبر و کھلیب، ضبط و قرا، حوصلگی کی توقع کر سکتے ہیں۔ صغریٰ آپ نے ساری عمر اپنی ہستی ثابت کرنے میں پھونک ڈالی۔ میاں کے دل میں گھر کرنے، اس کے گھر میں جگہ بنانے، ساس کی سیوا کر کے قدم جمانے اور مندوں کی خوشامد سے ماحول بنانے میں راکھ ہو گئیں۔ تمہیں خبر ہے تمہارے تایا مرحوم کسی فلمی پری سے شادی کے زبردست خواہش مند تھے۔“ خالہ نے اپنی دانست میں دھماکا کیا۔

”نہیں۔“ وہ اچھل پڑی۔ ”کہاں تیا۔ کہاں یہ مقام اللہ اللہ۔“ وہ منہ کھولے حیرانی سے خالہ! منہ بکنے لگی۔

”پھر کیا ہوا خالہ؟“ تجسس اور معاملے کی پراسراریت نے اسے اپنا مسئلہ بھلا دیا تھا۔

اراتو کچھ کھا کے مرجاؤں گی اور تمہارے سر چڑھے گی میری موت۔ انہوں نے گھبرا کر ہتھیرا ڈال دیا اور صغریٰ آپا کو بیہ لائے مگر انسانی دل ایسی تاویلوں سے کب بھلتا ہے۔ دونوں کے درمیان لوں کو تعلیم اور جہالت کے فرق نے مریدان کرنا قابل عبور بنا دیا۔ حسین بھائی اپنے زمانے کے بے عالم فاضل لائق فائق تھے جب کہ صغریٰ آپا اپنا نام لکھنے پڑھنے کی حد تک بھی تعلیم سے کوری۔ حسین بھائی نے ڈاکٹریت کی ہوئی تھی۔

تم یقین نہیں کرو گی پورے دو سال تک انہوں نے محاورہ تا بھی صغریٰ آپا کو ہاتھ نہیں لگایا۔“ فضل کا مارے حیرت کے دل بند ہونے لگا۔ کیسے کیسے انکشافات ہو رہے تھے۔

”کیا تائی شروع سے ہی ایسی تھیں۔ میرا مطلب ہے اتنی ماڈرن اور.....“ فضل نے بے تابی سے سوال داغا۔

”ارے نہیں۔ کہاں بھلا۔“ خالہ نے پر زور لہجے میں تردید کی۔ ”ان کو تو ہم چھوٹی موٹی اور بی بکل لے نام سے چھیڑا کرتے تھے۔ جس طرح کی عانت نہیں ہے۔ ہو بہو صغریٰ آپا اسی کی تصویر تھیں۔ ارے سے مسکینی، مظلومیت اور بدحواسی کے تاثرات اس طرح ٹپک ٹپک کر مخاطب کے قلب پر وار کرتے کہ وہ بے ساختہ جیب میں ہاتھ ڈال کر امداد پر مائل ہو جائے۔ حسین بھائی ان کی شخصیت پر دل کھول کے طنز کے تیر چلاتے۔ جھنجھلا جھنجھلا کر آگ بگولہ ہو کر انہیں زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کو کہتے مگر وہ بے چاری کیا کرتیں انہیں گائیڈ کرنے کو کون بیٹھا تھا۔

اور جو تضحیک آمیز انداز میں بدلنے پر اصرار کرتا وہ خود اپنی طرف سے کوئی رہنما درپچہ واندہ کرتا۔ یتیم انہیں خوش رکھنے اور آسودگی فراہم کرنے کے لیے صغریٰ بھائی خود کو مزید ذرہ خاک بناتی گئیں۔ باجست سے، وحشت زدہ ہو کر، منت سماجت سے، قدموں میں لوٹ کر ہر طرح پیا من بھانے کی سعی کرتیں۔ حسین بھائی جیسا لطیف و پرکیف حسن جمال رکھنے والا مہذب طرح دار اعلیٰ تعلیم یافتہ بندہ مزید چڑتا۔ ان پر برستا، کھولتا۔

گھر میں دوست احباب کی گھریلو محفل جتنی تو بھائی کو بی ہو کر نے کا ڈھنگ نہ آتا۔ باہر ہمراہ لے کر جاتے تو اپنی گھبراہٹ کے سبب منجھکے خیز حرکت کرتی تھیں۔ گھر آئے مہمان سے خوش آمدیدی الفاظ کہتے پسینوں میں نہا جاتیں۔ کسی کے روبرو عرض مدعا کا ہنر تعلیم کی کمی نے نہ بخشا۔ ماں ان کی پیدائش کے وقت ہی فوت ہوئی تھی۔ ساس خود ان پڑھ تھیں وہ پڑھے لکھے، اونچی ناک والے خیر غصے والے بیٹے کے قلبی مطالبات



خصوصاً بیوی کے واسطے کیا جان پاتیں۔ صغریٰ آپا کی زندگی کی رہی سہی خوشیاں بھی تذلیل و توہین کے اثناء سمندر میں ڈوبتی چلی گئیں۔ کیونکہ حسین بھائی کے ضبط کا پیمانہ رفتہ رفتہ چھلکنے لگا تھا۔ سرعام ان کی کوتاہی پر برہمی کا مظاہرہ کرتے۔ بھری محفل میں ان کی اتانے آگینے پکنا چور کر دیتے۔ چند جذباتی و فطری تقاضوں کے نتیجے میں اولاد کا سکھ صغریٰ آپا کی محروم جمہولی میں آن پڑا مگر حسین بھائی قطعی بے نیاز رہے۔

ان کی نازک مزاجی کے سبب آخر دم تک صغریٰ آپا ان کے معیار پر پورا نہ اتر سکیں۔ اولاد دے بارہا اپنی آنکھوں کے سامنے باپ کے گرجتے برستے تیور اور جواب میں مظلوم ماں کے اشک ندامت بہتے دیکھے۔ فطری بات تھی۔ اولاد ماں سے زیادہ قریب ہوتی گئی۔ لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں تو شاید حسین بھائی نے کچھ دلچسپی دکھائی تھی مگر لڑکی سے قطعی بیگانہ رہے۔ شاید اس کی صورت میں انہیں صغریٰ آپا جھلکتی محسوس ہوتی تھیں۔ نتیجتاً عاشی کی جیسے ان سے بن پڑا اپنی فطرت کے مطابق شخصیت بنا دی۔ میٹرک پرائیویٹ کرایا کہ صغریٰ آپا کا خیال تھا زمانے کی ہوا ان کی بچی کو بگاڑ دے گی۔ پھر ستم تو یہ تھا کہ اس سانچے کی مجرم بھی ان کی اپنی ہستی ٹھہرائی جاتی۔ حسین بھائی نے کبھی توجہ نہیں دی، مرکز نہیں دیکھا کہ اولاد کس حال میں ہے اور اس پر گھریلو چٹش کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ آج ان کی اولاد جو ٹوٹی پھوٹی شخصیتوں کی مالک ہے تو اس کا سارا دوش میاں بیوی کے ازواجی غیریت سے لبریز تعلقات کو جاتا ہے۔“ حاجرہ خالہ تو اترے بولتی ہوئی سانس لینے کو رکیں۔

ایک ایک کر کے ساری ابھی گرہیں کھلتی جا رہی تھیں۔

”پھر یہ یکا یک تبدیلی کیوں آئی تائی کے مزاج میں؟“ وہ بے چینی سے مٹھیاں بھینچ کر پوچھ رہی تھی۔

”صغریٰ آپا نے ساری عہد بھر گزاری۔ اپنی اتان کو کچل کر اپنی ذات کو ذلیل کر کے خود کو پستیوں میں دفن کر کے بالآخر تمہارے تایا کے ”مطلوبہ معیار“ تک پہنچنے کا راستہ انہیں مل ہی گیا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ حسین بھائی کے انتقال کے بعد وہ گویا ایک طویل مدت کی محرومی، ٹھکوری اور جبر و اذیت کے حصار سے آزاد ہوئی تھیں وہ بھی اور ان کی اولاد بھی۔ حسین بھائی نے زندگی بھر انہیں ماں، اعتماد اور بھرپور استحقاق سے اپنے ساتھ ساتھ اپنے گھر کے کسی اختیار کو بھی برتنے کا حق نہیں دیا تھا۔ ان کی نظر میں صغریٰ آپا کم عقل، جاہل اور احمق خاتون تھیں۔ اب جب آزادی نصیب ہوئی تو غیر ارادی طور پر ان میں خود کو منوانے اپنی شخصیت میں ”نکھار“ پیدا کرنے کا خیال آیا۔ زندگی میں نہ سہی موت

بعد سہی، وہ شوہر کے ”مطلوبہ معیار“ تک پہنچ گئی تھیں۔ پھر وہ انسان تھیں انسان وہ جو بے توقیری کی ناپہنائیوں میں بھی اپنی ساکھ برقرار رکھنے کا احساس پیدا کیے رکھتا ہے۔

پس اپنی خودی اپنی ذات کا غرور بحال کرنے کے لیے اولاد سمیت وہ اگلے بونگے احمقانہ طرز ما اور مضحکہ خیز قدم اٹھانے لگیں۔ اب ان کی آواز محض اپنی نگاہ کی کڑکتی بجلیوں سے دبا دینے والا ٹی نہیں تھا۔ اب انہیں ہر قدم پر شرمندگی و خجالت سے دوچار کرنے والا موجود نہیں تھا۔ اندر سے اٹھتی بن آمیز صداؤں سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ اندھا دھند ہر وہ روش اپنانے لگیں جو ان کے خیال۔ بساط کے مطابق انہیں ٹھکرائے جانے اور محروم رکھنے کا سبب بنتی تھی۔ ماں اپنی اتان کے جنگلوں میں لگنے لگی اور اولاد اپنے من چاہے رستوں پر گامزن ہو گئی۔“

خالہ نے مفصل تمام حالات کہہ سنائے۔ فٹل نے طویل سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا



دقار کے اس سے اتنے بے زار اور بے اعتبار رویے کا سبب سمجھ میں آ گیا۔ وہ در پردہ اس کی شخصیت کی چمکتی دکتی روشن ضیاء پاش اعتماد کی کرنوں اس کے بے ساختہ دے پروا انداز اور اس کے سادہ و شگفتہ لڑنے لڑنے سے مرعوب تھا۔ فٹل کی بھرپور آراستہ شخصیت اسے کم مانگی اور محرومی کا چھٹا ہوا احساس لاتی تھی۔

جب وہ اس سے نرمی کا برتاؤ کرتا اسے اپنے باپ کا ماں سے طرز عمل یاد آ جاتا۔ ماں کی بے توقیری اور تذلیل کنپیوں میں آگ بھردیتی۔ اپنے حقیقی جذبات کو پس پشت ڈالنے پر مجبور کر دیتی۔

اور تائی کا رویہ اتنا غاصمانہ کیوں تھا یہ بھی فٹل پر کھل گیا۔ انہوں نے اتنی ترسی ہوئی اتنی محروم اور تائی کا رویہ اتنا غاصمانہ کیوں تھا یہ بھی فٹل پر کھل گیا۔ انہوں نے اتنی ترسی ہوئی اتنی محروم محبت و توجہ سے خالی زندگی بسر کی تھی۔ اب وہ اپنے سامنے ایک آسودہ مطمئن پر اعتماد و جیت کا دم لیے عورت کو برداشت کرنے کی ہمت نہ پاتی تھیں۔ ہر آن اذیت میں رہتیں کہ اگر وہ بھی ایسا ہی طرز عمل اپنائیں تو سر کا سامنے آخری لمحے تک ان سے ناخوش اور بے زار ہرگز نہ رہتا۔ انہیں فٹل کی شخصیت بہت چھائی ہوئی بہت بھرپور محسوس ہوتی اور انہیں یاد آ جاتا وہی منظر جب جب تایا کے مہمان دوستوں کی بیویاں بھی اسی طرح لطافت و نزاکت اور مہذبانہ لطیف لب و لہجہ کا مظاہرہ کر کے اپنے میاں کے احباب سے توصیف و ستائش وصول کرتیں اور خود وہ ہونٹیں ڈری سہی بوکھلائی ہوئی میاں کی برہمی طبع کا باعث بنتیں۔



فصل کے وجود میں ایک نیا عزم طول ہو گیا۔ اس خاندان کو اپنی شناخت لوٹانے کا۔ خود شناسی کا ہنر سکھانے کا۔ وہ بڑے مستحکم قدموں سے خالہ کے گھر سے روانہ ہوئی تھی۔

”افوہ وقار! ابھی اب چھوڑ بھی دیں پیچھا اس کتاب کا۔“ بڑے دلنشین تبسم سے اس نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ وقار نے ماتھے پر ہل ڈال کر ہنسیں اچکاتے ہوئے سر و نظروں سے اسے دیکھا اور پھر بے زاری سے سر جھٹک کر اپنے سابقہ کام میں مشغول ہو گیا۔ فصل کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے قریب آئی اور بڑے دلنریب انداز میں سر کو خم دے کر بولی۔

”اونہ! کیا سمجھتے ہیں صاحب! ناک بھوں چڑھا کے منہ سجا کے ماتھے پہ لکیریں ڈال کے آدمی بہت حسین لگتا ہے۔“

اس نے وقار کی پیشانی پر گرے بال نزاکت سے اپنی مخروطی انگلیوں سے پرے کیے۔ اک ایسا لطیف سائل تھا جو چتر میں شکاف ڈال دیتا مگر شاید وقار حسین چتر سے بھی کچھ آگے کی چیز تھا جس پر اس قسم کی لطیف و پر کیف شوخیوں کا مطلق اثر نہیں ہوتا تھا۔

”مانا کہ غصے کا مونو گرام ربخ مبارک پر سجانا آپ کے لیے بے حد ضروری ہے مگر آپ کو شش تو کر سکتے ہیں ہنسا مسکرانا کچھ ایسا دقیق اور پیچیدہ عمل بھی نہیں ہے۔ آخر انسان ہی اسے سرانجام دیتے ہیں۔ یقین نہیں آتا تو میری طرف دیکھ لیجئے بلکہ مجھ سے سکھ لیں۔ دیکھیں یوں۔“ شرارت سے جھگڑائی خوب صورت آنکھیں لیے بڑے شری سے انداز میں اس نے اپنے گلابی لب پھیلائے تھے۔

دوسرے ہی لمحے ایک بھر پور طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔

”بازاری عورتوں کی طرح میرے سامنے فنکاری دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سمجھیں!“ وہ غرا کر بولا تھا۔ فصل نے سائیں سائیں کرتے کانوں پر سے بال ہٹاتے ہوئے متمنا تا گال سنبھلایا۔ نہیں۔ یہی وقت تو امتحان کا ہے۔

”وقار!“ بڑی جسارت سے اس نے وقار کا بازو تھام لیا اور بڑے عام سے انداز میں مسکرا کر بولی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ”اٹ اٹاٹ فیر۔“ دیکھیں جب میاں بیوی میں نوبت مار پیٹ اور تشدد تک پہنچ جاتی ہے تو رشتے کا سارا حسن ساری نزاکت تباہ ہو جاتی ہے۔ حاکم و محکوم کا تعلق استوار ہو جاتا ہے جب کہ شوہر اور بیوی کے درمیان اک دوستانہ سا باعتبار ادب و محترم سا بے تکلف سا ربط رہتا چاہیے۔ اسی خصوصیت کے حامل شادی شدہ جوڑے کو ”کامیاب“ اور ”سرخرو“ قرار دیا جاتا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ.....“

”میں نہیں چاہتا کچھ۔ دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔“ وہ ہانپ کر بولا اور اپنے آپ کو چھڑاتا دوسری طرف مڑ گیا۔

فصل کے لطیف احساسات کو بڑے زور کا دھچکا لگا۔ اس کے توباب نے بھی کبھی اتنے بد صورت لفاظ سے اس کی اہانت نہیں کی تھی۔ اتنے تحقیر و تنفر میں ڈوبے انداز سے نہیں جھڑکا تھا۔ ہمیشہ ایک محترم ماحوب صورت سا احترام پیش نظر رکھا تھا۔ بہر حال اس نے ہمت نہ ہاری اور تیزی سے اس کے ستے میں آگئی۔

”وقار! یوں سچائیوں سے منہ موڑ کر تو آپ خود کو دوہری اذیت میں مبتلا کر رہے ہیں۔ کبھی تو میری بات سن لیں۔ دیکھیں ہم ایک خوشگوار زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ پورے اعتماد و محبت اور احترام کے ساتھ۔ کسی عہد رفتہ کے دل دکھا دینے والے خوابوں اور خدشوں سے بے نیاز۔“ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے درد سے بڑے یقین سے خلوص سے کہہ رہی تھی۔

وقار نے ایک لمحے کو سرائٹا کر بغور اس کا چہرہ دیکھا جہاں صرف اور صرف سچائی کی تحریر ثبت تھی۔ پھر جانے کیا ہوا۔ کون سی لہر اندر سے ابھری اور وہ دیوانہ وار اس پر پل پڑا۔ لاتوں گھونسوں مکوں سے اس کو دھنک کے رکھ دیا۔

”میری بات نہیں سنی تھی۔ کیا کہا تھا میں نے کہ دفع ہو جاؤ۔“ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

”میری حکم عدولی کرتی ہو۔ مجھ سے زبان درازی کرتی ہو احمق جاہل عورت۔ مجھے پڑھاتی ہو؟ حیثیت کیا ہے تمہاری۔ ہیں؟ تم ہو کیا چیز؟“

عالمی تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ وہی الفاظ وہی انداز اور وہی مردوزن کا قصہ واقعات اور حالات بدل گئے تھے تو کیا ہوا مزارع تو نہیں بدلتا ناں۔ وراثت نہیں لیا گیا عورت سے نفرت و بیزاری اور تو جین کا احساس تو ختم نہیں ہو سکتا ناں۔



”کچھ تصور اس میں خودامی کا بھی ہے بابا جان کو ہم سے دور کرنے میں ٹھیک ہے ان کا رویہ بہت ناروا اور گریز پاتھا۔ وہ ہم سے قریب نہیں رہتے مگر امی ایسا کرنے کی سعی تو کر سکتی تھیں۔ شاید فاصلے کم ہو جاتے۔“ دھیمے لہجے میں وقار صر سوا ہو کر کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پہلی دفعہ شعور و فہم اور سنجیدگی کے عکس دیکھے تھے فصل نے۔

”بابا کی ایک خاص عادت تھی جب بھی ہم میں سے کوئی شرارت یا گستاخی کرتا وہ ہمیں ڈانٹنے کے

بجائے امی پر برس پڑتے، طنز سے چھلنی کر دیتے، امی اپنی شامت اعمال سے بچنے کے لیے جونہی بابا آتے ہمیں ادھر ادھر کر دیتیں۔ ان کے سامنے نہ آنے دیتیں۔ مبادا ہم سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو انہیں ناگوار خاطر گزرے، اگر کبھی ان کا سامنا ہوتا بھی تو ہم ماں کے ڈراووں پر سب سے خاموش رہ جاتے۔ امی ہمارے ایک معمولی سے فعل پر بھی بطور تنبیہ بابا سے شکایت کرنے کی دھمکی دیتیں۔ انہوں نے بابا کو ایسے دہشت ناک روگٹے کھڑے کر دینے والے پر جلال روپ میں پیش کیا تھا کہ ہم ان کا سامنے کرنے سے خود ہی کترانے لگتے۔ ان کے مقابل ہماری تھر تھری چھوٹ جاتی۔ اوسان خطا ہو جاتے۔ اپنا مدعا بیان کرنا کوہ گراں سر کرنے کے مترادف محسوس ہوتا۔ یوں مجرم بنے حواس باختہ سے ان کے آگے سر جھکائے کھڑے ہوتے جیسے کوئی سنگین واردات میں ملوث کسی قبیح جرم کا مرتکب شخص کسی جاہل و پر جلال فرماں روا کے دربار میں پیش ہو رہا ہو۔ ہماری جائز بنیادی ضرورتیں ماں کے ذریعے ان تک پہنچتیں اور ان کے احکام کی وصولی بھی ماں کے ذریعے ہمیں پہنچتی۔ اس دوری کی دیوار نے باپ سے ہمیں اور باپ کو ہم سے بدگمان بلکہ متنفر کر دیا۔“ وقاص ہاتھ مستلزامی سے اعتراف کر رہا تھا۔

ماں کے جرم کا۔

”یہی وجہ تھی کہ جب ”آزادی“ ملی تو ہم سب نے خود کو تباہ کر لیا۔ بے پناہ بے تحاشا یا دوسرے لفظوں میں اپنے بچپن اور لڑکپن کی محرومیوں، ترساہٹ اور بے بسی کو چھپانے کے لیے ہم نے اپنی اپنی مرضی کے لبادے اوڑھ لیے اپنی شخصیتوں پہ۔“ اس کا حزن یہ مضحکہ مناجاز اس کے لہجے کی سچائی کا مظہر تھا۔

فصل کے اندر ایلٹے بھڑکتے توہین کے انگاروں پر پھر جیسے چھینے سے پڑ گئے۔ ”کوئی بات نہیں۔ میں آہستہ آہستہ اس کے اندر سے سارا زہر نکال دوں گی۔ اس کی وحشتوں کو روشنی کی شانتی سے لبریز کر دوں گی۔ کیا ہوا جو میرا وجود اس کے اندر کی آگ باہر نکالنے کے لیے ”نشانا“ بن رہا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں خود کو تسلی دے رہی تھی۔ نئے سرے سے ”مضبوط“ کر رہی تھی۔ پھر امن کی فاختہ کا روپ دھار رہی تھی۔

مگر شاید فلک کو اس کی اتنی برداشت اتنی جاذبیت قلب کچھ بھائی نہیں تھی۔ حالات سنورنے کے بجائے بگاڑ و انتشار کی طرف مزید تیزی سے گامزن ہوتے گئے۔

اس رات بھی اس کے نیلوں نیل مضروب جسم کو رات کی اتھاہ تاریکی میں اپنے قریب کر کے نفس کی آگ بجھانے کے لیے مضبوط آہنی بازوؤں کا حصار تانا، تو اس کا رواں رواں اور تذلیل کے احساس

سے شعلہ فشاں ہو گیا۔

”میں کیوں ہر روز کی اہانت اور زد و کوب کے بعد ہر رات اپنا آپ بنا احتجاج کیے اس کے حوالے کر دیتی ہوں۔ اس کی فطری آگ بجھانے کے لیے اتنا ناک والا ہے تو کیوں بے بس ہو جاتا ہے۔ اس سے؟ اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ دن میں ایک اپنا نیت آمیز نگاہ بھی مجھ پر ڈال لے کہ اس سے اس کی خودی مجروح ہوتی ہے اس کی نام نہاد اپنی کاپول کھل جاتا ہے۔ یہ عمل اس کی ”کمزوری“ کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لیے۔ وہ میرے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔ حالانکہ میاں بیوی میں محبت و یگانگت کا بھرپور مظاہرہ کمزوری کی نہیں اعلاظرفی اور بلند کرداری کا غماز ہوتا ہے۔ اس مقدس نورانی رشتے کو انتقام تشدد اور جنسی تسکین کے جذلوں سے مربوط کر دینا مردانگی تو نہیں کہلاتا؟“ اس کا ذہن برجستگی سے دلیل دے رہا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے ہونٹ بھیجتے ہوئے اس کے بازو ہٹا دیے اور دوسری سمت کروٹ بدل لی۔ وہ جانتی تھی اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ زبردستی بہ زعم خود اس کی سمت بڑھ کر ”فتح“ کرتا کہ دل میں چور رکھنے والے بہادری کے اعزاز سے سدا محروم رہتے ہیں۔

ایک ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ۔ دو ہفتے۔ اس کے بعد وقار کے ممبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ”رات“ کا غصہ بھی اس کے متغمانہ انداز میں شامل ہو جاتا۔ عجیب عجیب طرح سے اسے ذہنی کچوکے بھی لگانے لگا۔ براہ راست اس بات کو تو وہ شاید کبھی بھی کہنے کی جسارت نہ کرتا۔ وہی مخصوص جھکنڈے جو مرد ازل سے عورت کا غرور اور دل توڑنے کے لیے اختیار کرتا آیا ہے۔ بے وفائی کا الزام، شک و شبہات، جسمانی و ذہنی کارکردگی پر طنز، تمسخر اور ہر فعل پر شدید غصہ۔

انا سے بے حال ہوتا شخص مزید پھرتا گیا۔ غیض کا طوفان ابل کر فرزاگی کی تمام حدود کو اس کرتا گیا۔ جھنجھلاہٹ، ترساہٹ، انتقام اور بے بسی عروج پر پہنچ کر اس کی تمام ذہنی توانائیاں مفلوج کرتی گئی۔ اور بالآخر بصارت و سماعت کا ہر عصبی خلیہ ”آؤٹ آف آرڈر“ ہو گیا اور صرف اور صرف گویائی کی حیات دیوانہ وار ہونٹوں کی مہر توڑتی ہوئی ابل پڑیں۔ اور اُن سے وہ الفاظ ادا ہوئے جسے سننے سے پہلے ہر عورت مرنا پسند کرتی ہے۔



منیر اب مان بھی لے تو مقدر کی حقیقت کو جو ہے وہ بھی ضروری ہے جو گزرا وہ بھی ضروری تھا

شفقتوں کے خزیئے لٹانے والا باپ دکھ کا ہر ریشہ ہر کچی اپنی رگ جان میں سمو لینے والی ماں جان نچھاور کرنے والا ذہنی و جذباتی پریشانیاں بنانے والا بھائی جان نچھاور کرنے والی بہن اپنی مصمصیت اور شغنی طبع سے دل بہلانے کے ہزار جتن کرنے والا چھوٹا بھائی ہر ہر طرح سے درد بنانے خد متیں کرنے والی بھائی سب اپنے عمل سے اپنے قول سے اسے یہی یاد کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس دن بھی ربیعہ اس کی دلہن اور دلجوئی کے حیلوں میں الجھی ہوئی تھی تو وہ تھکے تھکے انداز میں مسکرائی۔

”ربیعہ! تم لوگ کیا سمجھتے ہو مجھے نہیں خبر کہ حقیقت تسلیم کیے بنا کوئی چارہ نہیں۔۔؟ میں جانتی ہوں تقدیر کا لکھا مٹانے پر نہ میں قادر ہوں نہ تم لوگ۔ میں روایتی پچھتاوے یا ملال اور رنجیدگی سے دوچار نہیں ہوں۔ میں تو صرف حیران ہوں ربیعہ اس بات پر کہ میں نے تو آج تک نادانستہ بھی کسی کا دل نہیں دکھایا کسی کی آنکھ کے آنسو خواہ مجھے بے چین کر دیتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو اپنے بدترین دشمن کے بد انجام کی دعا بھی نہ کی تھی کبھی پھر میرے ساتھ اتنا عظیم ظلم؟ اتنا زبردست نقصان؟ خود اپنی نگاہ میں مگر ادینے والی تذلیل میرا مقدر کیوں ٹھہری؟ کیا اتنی اہانت ایسی جان لیوا توہین کی مستحق تھی میری ذات؟“

اس نے استفہامیہ انداز میں متاسف و غمگین صورت لیے ربیعہ کو دیکھا۔ ربیعہ نے آہستگی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی نگاہوں میں غایت درجہ کا خلوص اور اپنائیت کی چمک تھی۔

”نہیں فختل جی! آپ کی ذات تو بہت قیمتی بہت اعلیٰ بہت نایاب ہے۔ مگر کچھ جوہری گوہر نایاب کی پرکھ نہیں رکھتے ان کے اتاڑی پن سے خود ان کا اپنا نقصان ہوتا ہے اس سے ہیرے کی قیمت دلکشی اور نایابی پر تو کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے ناں۔“ وہ بڑے سجاوے اظہار محبت کر رہی تھی۔

آنسوؤں سے لبریز نگاہیں اٹھاتے ہوئے فختل نے اس کی سمت دیکھا۔ کچھ لمحے یونہی بے خیالی میں بکتی رہی پھر آنسوؤں کو پلکوں کی باڑھ کے پیچھے دھکیل کر بڑی کوشش کے بعد مسکرائی جیسے اچانک دم جھم برسات میں دھوپ نکل آئے اور پھر سر ہلا کر ربیعہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تپتپانے لگی۔

”سنیے وہ آپ سے ایک بات کرنا تھی۔“ اسی رات ربیعہ بیڈ پر نیم دراز ٹیپو کے پہلو میں تک کر بیٹھی ہوئی محتاط انداز میں کہہ رہی تھی۔

ٹیپو نے آہستگی سے نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا پھر دھیرے سے مسکرا کر اس کا موی ہاتھ تھام

لیا۔

”تو کیا ہمارے درمیان پردہ ہے؟ اب تو تمام حجاب دور ہو چکے ہیں۔ بلکہ یار ہم تو روز اول سے مشتاق ہیں آپ کے منہ سے جھڑتے پھول چنے کو۔ کیسے اور بے شک ساری رات ساری عمر کہتی رہیے۔ ہم جب تک دم میں دم ہے سنتے جائیں گے۔ موت آگئی تو ملک الموت سے اجازت پا کر ٹیپو ریکارڈ رکھوا جائیں گے آپ کے پاس۔“

”افوہ۔ بات سمجھ کر کہاں سے کہاں لے گئے۔“

”اب تو سارے افسانے ساری داستانیں ایک ہی وجود تک رسائی پاتی ہیں۔“ ایک وارفتہ نظر اس پر ڈال کر ٹیپو نے ایسی از خود رنگی میں دھیرے سے اسے اپنے بہت قریب کر لیا تھا۔

”مجھے دراصل فختل جی کے متعلق بات کرنا تھی لیکن ڈرتی ہوں کہیں آپ کو بری نہ لگے۔ اصولاً تو امی سے کرنی چاہیے تھی مگر ہمت نہیں پڑی۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات بلکہ بہت بڑی بات کا معاملہ ہے۔“ وہ سچ سچ اپنے مدعا کے لیے ماحول استوار کرنے لگی۔

”تم اب ہماری فیملی کا ایک اہم فرد ہو۔ ہمارے اپنوں میں سے ہو۔ اور تمہیں پورا حق حاصل ہے ہمارے ہر معاملے ہر مسئلے پر رائے دینے اسے سلجھانے کا۔ ٹیپو نے ”عملاً“ اسے اپنائیت و قربت کا یقین دلایا۔

”فختل جی کی عدت پوری ہو چکی ہے۔ پاپا اور امی ان کے مستقبل کے لیے فکر مند ہیں۔“ ربیعہ کو کچھ تسلی ہوئی ٹیپو کے رویے سے تو کھل کر دھیسے سے کہنے لگی۔ ”اس سلسلے میں اگر کوئی پرپوزل پیش کروں تو کیا آپ قبول کریں گے؟“ اس نے بہت جھجک کر دھڑکتے دل سے کہہ کر اس کی صورت دیکھی۔ ٹیپو کے چہرے پر تحیر ثبت ہو گیا۔

”وائے ناٹ یار۔ مگر تم کس کا پرپوزل پیش کرو گی اور اتنی جلد تمہیں خیال کیسے آ گیا۔“ وہ حیران نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”ساننے کی بات ہے اگر آپ سمجھیں تو۔“ ربیعہ نے اس کے گریبان کے ٹٹنوں سے کھینچتے ہوئے ایک لٹلے کو اس کی صورت دیکھی۔

”میرا بہت ہی قریبی بہت گہرا خونی رشتہ۔“

وہ کہہ کر رکی۔ ٹیپو ایک دم نظریں گھما کر ٹھٹھک کر اُسے گھورنے لگا۔

”کیوں؟ اگر آپ کو میری بات میری جسارت ناگوار گزری ہے تو۔“ دل ہی دل میں سہم کر اس

نے ڈرتے ہوئے کہا۔ نیو گہری سانس لے کر اٹھ بیٹھا اور پر خیال نظروں سے اس کی سمت دیکھنے لگا۔  
 ”ربیعہ! ایک طلاق یافتہ بہن کا گھر سامنے کے لیے بھائی ہر ذات رنگ و نسل اور عمر کے سوالیوں کو خوش آمدید کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس میں ناگواری یا خفگی کا کہیں سے کوئی پہلو نہیں نکلتا۔“ وہ بہت ملائمت بہت روانی سے کہہ رہا تھا۔ حقیقتاً اسے ربیعہ کی سادہ فطرت، اس کی معصوم خیالی پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔  
 ”خاموش اس لیے ہوا ہوں کہ تمہارا پردہ پوزل میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ دوسری سب سے اہم بات یہ کہ آیا اس میں بخت بھائی کی دلی رضامندی شامل ہے؟ کیا وہ ایسا چاہتے ہیں یا محض تمہاری خواہش ہے؟“

اس کے لیے تو ربیعہ کا یہ پیغام گویا بہاروں کا حسین سند یہ تھا۔ شاہ بخت جیسا بردبار باشعور، حلیم الطبع، بادقار انداز اور سچ کا مالک شخص اپنی مستحکم معاشی پوزیشن سمیت فختل کے لیے موزوں ترین بندہ تھا۔ صحیح معنوں میں اس کے مزاج اور فطرت سے ہم آہنگ۔ ربیعہ نے اس سوال پر متذبذب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”بات یہ ہے کہ.....“ وہ ہچکچا کر ایک لمحے کو رکھی۔

”پتا نہیں آپ کو کیسا لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ تائی کی طرف سے سلسلہ شروع ہونے سے بھی پہلے بخت بھائی مجھے آپ کی طرف بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر شاید وہ مقدر کے سکندر نہ تھے۔ ہمیں کچھ دیر ہو گئی یہ بات چھیڑنے میں اور تب تک فختل جی کو کوئی اور جیت چکا تھا۔ بہر حال..... دو سالوں کے اس گپ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یقین مانیے وہ آج بھی اولین ایام کے جذبات کے ہمراہ فختل جی کو اپنے گھر کا اجالا بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی مرضی نہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ اس کے لہجے میں یقین بول رہا تھا۔

ای اور پاپا کو یہ بات پتا چلی تو بے اختیار سر ہنسو دھو گئے۔ اتنا اچھا اتنا نیک ایسا عالی ظرف داماد مل رہا تھا انہیں۔ ان کے سر سے تو جیسے بھاری چٹان سرک گئی تھی۔

فختل کے سامنے قصہ کھلا تو اس نے صاف اکار کر دیا۔ ”امی آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ بے جوڑ رشتوں سے کبھی حسبِ تمنا نتائج برآمد نہیں ہوتے“ آپ پھر اسی غلطی کا اعادہ کر رہی ہیں؟ خدا کے لیے اب مجھے بخش دیں۔ آپ نزل کی فکر کریں۔“ اس نے جیسے بہت برا مان کر کہا تھا۔

”فختل جی! خود ہی ہمیں یاد کر اتی ہیں کہ آپ روایتی لڑکیوں کی طرح احساسِ جرم اور بے بسی کا شکار نہیں ہیں اس ”سامنے“ پر خود ہی پھر اسی روایتی طرز کی ضد پراڑی ہوئی ہیں۔ دوسری شادی کہاں

سے ”انہونی“ ہو گئی۔“

ربیعہ اس کا مزاج سمجھ گئی تھی اس لیے اس کی ذہنی سوچ کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے اپنی طرف سے گویا کاری دار کیا تھا۔

”میں دوسری شادی کے خلاف نہیں ہوں۔“ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ پیدا ہو چکا تھا۔ ”مگر ایک تو اتنی جلدی؟ قدرتی بات ہے میں ذہنی طور پر خود کو آمادہ نہیں کر سکتی اور دوسری بڑی اور قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ یہ رشتہ مجھے قطعی قبول نہیں۔“ اس نے دو ٹوک کہا۔ ربیعہ دل ہی دل میں از حد پریشان ہو گئی۔  
 ”مگر کیوں؟ بخت بھائی کیا بہت برے ہیں؟“ مضطرب سا ہو کر اس نے بے چینی سے اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے پوچھا۔

”ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔“ فختل کا لہجہ دھیمپڑ گیا۔ ”بلکہ میں ان کے لائق نہیں ہوں۔ وقار حسین سے رشتہ اس لیے بے جوڑ تھا کہ وہ ذہنی طور سے پس ماندہ شخص تھا اور..... اور تمہارے بھائی سے اس لیے کہ ہماری ”ظاہری کیفیات“ قطعی مختلف ہیں۔ وہ تو کسی بھی بہت اچھی لڑکی کی پہلی پسند بن سکتے ہیں اور اس کا پورا حق رکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے جیسی عورت کے لیے کسی ٹھکرائے ہوئے یا ”بھگتائے“ ہوئے (رٹو دے) بندے کا رشتہ ہی موزوں ہو سکتا ہے اور یہی لائحہ عمل مناسب ترین ہوگا۔“ اس نے بڑے بے رحم اور سفاکانہ انداز میں فراخ دلی سے سچائی افشا کی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ ربیعہ نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”بھائی کے لیے سچ کے ان دو سالوں کی روداد سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ اتنے کم ظرف ہرگز نہیں ہیں۔ آپ جس کی چاہے قسم لے لیجیے ان سے۔ وہ زندگی کے کسی موڑ پر آپ کے ماضی کے حوالے سے کوئی تکلیف دہ ذکر نہیں چیخیں گے۔ وہ بالکل بھی ایسے نہیں ہیں فختل جی! آپ میرا یقین کریں۔“

”اچھا ہوں گے۔“ اس کے لہجے میں بے زاری عود کر آ گئی۔ وہ کچھ جھنجھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مگر میری طرف سے معذرت۔ البتہ میں بھابی تلاش کرنے میں تمہارے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ اوکے!“

ربیعہ اس کے قطعی اور واضح انکار پر بھونچکا بیٹھی دیران نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔



وہ اس وقت عقیبی محن میں بڑے زور و شور سے کرلیے اور کدو کی بیلوں کی گھوڑی کرنے میں مگن تھی۔ تخت کے ایک سمت دھیمے سروں میں ریکارڈر پڑا بج رہا تھا۔ سامنے کچن کے کھلے دروازے سے چائے



کے پانی کے اگلنے کی آواز پر وہ کھربا ہاتھ میں لیے لیے اٹھی ہی تھی کہ عقیقی آہنی دروازے پر دستک ہوئی۔  
 ”جی۔“ ایک ہاتھ میں کھربا لیے دوسرے سے لباس درست کرتی وہ دروازے کی سمت بڑھی تھی۔  
 پھر ٹھٹھک کر رہ گئی۔

”السلام علیکم!“ شاہ بخت نے سنجیدگی سے اس کی سمت دیکھ کر کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ تشریف لائے۔ ”قدرے تذبذب کے بعد اس نے راستہ دے دیا۔ وہ دھیمی چال چلتا ہوا صحن کے بیچ آکھڑا ہوا۔

”باقی لوگ نظر نہیں آ رہے؟“ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔  
 ”جی۔ وہ ربیعہ اور امی تو عید کی شاہنگ کے لیے گئے ہیں اور ٹیپو اور عمران ”کبرا“ خریدنے گئے ہیں۔ نزل اور پر سورہی ہے اور پاپا آفس میں ہیں۔“ اس نے فردا فردا سب کی ”حالیہ پوزیشن“ بتلائی۔  
 اس نے ابھی تک اسے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

”اچھا۔“ اس نے مدہم لہجے میں کہا۔ ”پھر میں چلتا ہوں۔“ کچھ توقف کے بعد وہ ست رفتاری سے واپسی کے لیے مڑا۔ اس نے جس طرح دونوں انداز میں سب لوگوں کی عدم موجودگی کی خبر دی تھی ظاہر ہے اس سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ میاں پھٹا کھاؤ۔  
 ”او نہیں پلیز تشریف رکھیے۔“

شفٹل کو اپنی بداخلاقی اور بے مروتی پر جیسے خود ہی شرمندگی ہوئی۔ ”آپ یہاں تشریف رکھیے۔ میں ابھی دو منٹ میں آئی۔“

تخت کے پاس پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ سرعت سے کچن کی سمت بڑھی۔  
 تھوڑی دیر بعد ٹرے میں دو کپ اور کچھ چمچ وغیرہ سجا کے لے آئی۔ اسے چائے پکڑا کر وہ آہستگی سے تخت کے کونے پر بیٹھ گئی اپنا کپ سنبھال کر۔ شاہ بخت کی پیشانی پر ٹھکر کا جال بچھا ہوا تھا۔

”آپ نے ٹکلف کیا۔“ خیالوں کی وادی سے ابھر کر وہ چونکا۔ شفٹل نے محسوس کیا جیسے وہ ذہنی طور پر غیر حاضر سا تھا۔ ”شفٹل!“ کافی دیر تک سر جھکائے چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے شاہ بخت نے اپنی نشست بدلتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ اس کا لہجہ بڑا فیصلہ کن سا تھا جیسے بڑے غور و خوض کے بعد اسے مخاطب کرنے کا ارادہ باندھا ہو، شفٹل نے چونک کر اس کی سمت دیکھا لبتہ بولی کچھ نہیں۔ شاہ بخت کے لہجے کا غیر معمولی پن اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔

”آپ کے انکار کی وجہ مجھ تک پہنچ گئی ہے۔ ٹھیک ہے یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے میں کسی لحاظ سے کسی حق

کے تحت آپ پر کوئی دباؤ ڈال کر اس فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست دائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔  
 لیکن میں اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں مجھے رجحیکٹ کرنے کا جو جواز آپ نے بتلایا ہے اگر واقعتاً آپ کے انکار کی یہی وجہ ہے تو میرے خیال میں یہ کوئی ٹھوس یا ناقابل تردید وجہ نہیں ہے۔ یہ کوئی فارمولہ نہیں ہے کہ دو فریق ٹھکرائے ہوئے یا جھگڑائے ہوئے ہوں۔ وہی خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر سکتے ہیں اور اگر دونوں میں سے ایک فریق کنوارا ہو تو بندھن پائیدار ثابت نہیں ہوگا۔“

”یہ فارمولہ بے شک نہیں ہے، مگر یہ واضح اور اٹل حقیقت ضرور ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا تھا۔  
 ”یہ حقیقت نہیں حقیقت کا ایک رخ ہے۔“ اس نے تحمل سے اس کی بات کو بے سکون لہجے میں کہا۔  
 ”دور کیوں جائیے۔ میں آپ کو خود اپنے گھر کی مثال دیتا ہوں۔ ہماری امی کی وفات کے بعد ہمارے والد نے مطلقہ خاتون سے شادی کی تھی مگر دونوں ایک دوسرے کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے پچھلے ٹکے ادا کرنے میں لگے رہے۔ ان کی آپس کی ناچاقی کا واضح ثبوت اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ ان کی شادی کے دس سال بعد ان کی حادثاتی موت تک گھر میں کسی نئے بہن بھائی کا اضافہ نہیں ہوا۔“  
 شفٹل ششدر سی ان کی شکل دیکھتی رہ گئی یہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع انکشاف تھا۔ تاہم اس کو جتنی حیرانی ہوئی تھی اس کا دس فیصد بھی اس کے چہرے سے مترشح نہیں تھا۔ خاموشی سے اس کے اگلے جملے کے انتظار میں بیٹھی اپنے ناخن دیکھنے لگی۔ اس کے انداز سے واضح تھا کہ وہ قائل بہر حال نہیں ہوئی تھی۔  
 ”میں یہ نہیں کہتا کہ ایک فریق کے کنوارے ہونے سے صورت حال بہت خوشگوار ہو جاتی ہے۔ ایسی بات بھی نہیں ہے۔ یہ ہمارے محلے کے ہی شیخ صاحب کی فیملی اس حقیقت کی واضح تردید کرتی ہے۔ ان کی بیگم کنواری تھیں جبکہ خود وہ ایک کو بھگتا چکے تھے۔ آپ دیکھ لیجئے دن رات جتنے فساد اور ہنگامے ان کے ہاں ہوتے ہیں پورا محلہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ ان کی بیگم بات بات پر پہلی بیوی کے حوالے سے انہیں کچھ کے لگا کے سلگاتی رہتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے حلق تک شاکی ہیں۔“

شاہ بخت روانی سے کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں بہت وقار، ظہر اور مدبرانہ سی چنگی تھی۔  
 ”میرا خیال ہے آپ پر کھل گیا ہوگا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دونوں کی ”ظاہری کیفیت“ کیا ہے۔ یہ عہد و فاداری بشرط استواری اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے لیے کتنے ایثار، خلوص اور برداشت سے کام لے سکتے ہیں۔ باقی کیفیات ثانوی اہمیت رکھتی ہیں۔“ اس کے لہجے میں غایت درجے کا اعتماد، استحکام اور متانت تھی۔ ”اب آپ کا کیا فیصلہ ہے؟“ بالا خروہ کھڑا ہو کر اس کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

فصل نے جزیز ہو کر ایک لمحے کو بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ سچائی، سوس اور بردباری کے رنوں۔ مزین چہرہ۔ اس کی شفاف چمک دار انگاہوں سے ارد گرد جیسے روشنی سی بکھر رہی تھی۔ ان متین، دلکش آنکھوں میں عہد فردا کے دلغریب خواب اور محبتوں کے چراغ روشن تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ کچھ جھنجھلائی گئی۔ شاید اپنی کم مائیگی کے احساس سے۔

”پلیز شاہ بخت۔“ وہ کسی قدر بے بسی سے بولی۔ ”دیکھیے میں خود تلاش کر دوں گی“ آپ کو بہت اچھی سی آپ کے مزاج کے مطابق لڑکی۔ اس قصے کو چھوڑیے بلکہ بھول جائیے۔“

اس کی آنکھوں میں اودیے امید کے دیپ بچھ سے گئے کتنی دیر اس کی سمت دیکھتے رہنے کے بعد وہ شگفتگی کے عالم میں وہ پڑ مردہ سا واپس پلٹا۔ تجھی ربیعہ اور امی وغیرہ اندر داخل ہوئے۔

”اف اتنا رشتہ تھا کہ کیا بتاؤں کس مصیبت سے فراغت ملی ہے۔“ امی تخت پر بیٹھی ہوئی ہانپ کر کہہ رہی تھیں۔ دونوں کے چہرے پسینے سے شرابور تھے۔ فصل جھٹ اسکو انکس بنالائی۔ امی شاہ بخت کو بازار آنکھوں دیکھا حال“ بتا رہی تھیں۔

”وہ نیچا اور عمران نہیں پلٹے اپنی“ ”مہم“ سر کر کے؟“ فصل نے پوچھا۔

”آ رہے ہیں۔ سارے محلے کو سنا تے۔ تماشا دکھاتے ہوئے کہ ہم نے دو بکرے لیے ہیں۔ رات میں دو سو بندوں کو لکر ماریں، ٹھیلوں، چھابڑیوں سے ٹکرائے، بسوں گاڑیوں کے آگے پیچھے لپکے۔ کوئی ایک تماشا لگایا ہے۔“

امی بڑے مصروف سے انداز میں کوفت سے کہہ رہی تھیں۔ تجھی ان لوگوں کا نزول ہوا۔ اس طرز کہ ٹیپوں میاں وہ جارحانہ عزائم رکھنے والے صحت مند بکروں کو رسی سے بمشکل کھینچنے ایزی چوٹی کا زور لگے کے بمشکل صحن تک لا رہے تھے اور ان سے پانچ فٹ پیچھے عمران پتلی سی شاخ ہاتھ میں لیے منہ سے لایعنی خوف زدہ آوازیں نکالتے، تھکے ماندے سے خراماں خراماں تعریف لا رہے تھے۔

”ارے یہاں کیوں لے آئے انہیں ساری بزیوں کا تاس مار دیں گے۔“ امی نے پکار کر کہا۔ لگتا تھا شاید بکروں نے بھی یہ بات سن لی تھی۔ جونہی ہریالی دیکھی رسی تڑا کر سر پٹ بھاگے، اور کیاریوں کو پامال کرتے لپ لپ منہ مارنے لگے۔ آن کی آن میں میدان صاف کر دیا۔ امی کے ہزار شکار کرنے کے باوجود ٹیپو بکروں کے ساتھ ساتھ عمران پر بھی گرم ہو رہا تھا۔

”بچھ دیا تھا۔ میرے ساتھ بڑا پہلوان۔ مرمر کے ایک بکرے کی رسی پکڑی۔ وہ بدک کر بھاگا تو یہ محترم بھی ساتھ لڑھکتے گئے۔ دونوں ریس لگاتے لگاتے جانے کہاں غروب ہو گئے۔ اتنی خواری کے بعد

ن ڈھونڈا۔ اور یہ کالے دھبوں والا تو پورا ”محمد علی“ ہے بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے۔ محمد علی تو بے رہ دو ہاتھوں سے باکسنگ کرتا تھا یہ چاروں بچے جھاڑ کر سر بازار پل پڑا مجھ پر۔ یہ بھورے بالوں والا اشرف انفس لگ رہا ہے ناں آپ کو۔ مگر آپ اس کی صورت پر نہ جائیے گا میں روڈ کے بچوں سچ دوڑن کے سامنے بے جابانہ پاپ میوزک بجا کر خود ہی اس پر تھرک رہا تھا۔ بے شرم کو خواتین سے بھی باند آئی۔ اور گستاخ تو بلا کا ہے۔ بے ادب نے ایسا سنگ کھدو یا بچارے عمران کی پہلی میں۔ ہائے

عمران میاں نے جو ہمدردی کا اہلتا ہوا چشمہ رواں دیکھا تو اسے بھی اپنی صعوبت رفتہ یاد آ گئی۔ پہلی ہاتھ رکھ کر بھان بھان کر کے رونے لگا۔

”بس کرو یا ر۔ بکرے برا مان جائیں گے۔“ آنکھیں ملتے ہوئے نزل بھی ادھر ہی آ گئی۔ میوزک کے دلدادہ بکرے کی اتفاقیہ نظر اس پر پڑی۔ اس کے ہرے رنگ کے کپڑے دیکھ کر شاید اسے بھی ہری ری سو جھنے لگی۔ ایک نعرہ مستانہ لگا کر نزل کی طرف دوڑا اس سے پہلے کہ بھاؤ کے لیے وہ کچھ کرتی۔۔۔ بکرے میاں کی بھرپور مکر اس کے پہلو میں لگی۔ وہ ایک دلخراش، فلک شکاف چیخ مار کے وہیں ڈھیر ہو گئی۔ پونے بہ سرعت بکرے کو کھینچ کر پرے کیا۔ ربیعہ اور فصل نزل کی سمت بڑھ کر اسے سنبھالنے لگیں۔

”اب آپ بھی بس کریں ناں۔ بکرے برا مان جائیں گے۔“ عمران میاں نے دھواں دھار روتی کراہتی نزل کو دیکھ کر مگر بڑے لہجے میں گویا بدلہ چکایا تھا۔ بکرے میاں ٹیپو کے ہاتھوں بے قابو ہو کر موٹر سائیکل کی سمت بڑھے، ایک نظر اس قوی بیکل بدہیت سی چیز کو بے زاری سے دیکھا، پھر بے کار جان کر ٹھٹھ سے ٹکر مار کر اگلی ہیڈ لائٹ توڑ ڈالی۔

”افوہ۔ آپ نے بھی کن کو بچھ دیا“ بکرے خریدنے محترم اپنے جیسے ”تخریبی و تجربی“ مزاج والے بکرے جن لائے کسی نیک شہرت کے شریف صورت بندے کو بھیجتا چاہے تھا اس کام کے لیے۔“ فصل نے تنک کر صاف ٹیپو پر چوٹ کی تھی۔ چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق تخریب کاری میں مگن بکرے کے کان کھڑے ہو گئے۔ محترم کو شاید اپنی بے عزتی کچھ بھائی نہیں۔ منہ اٹھا کے فصل کی سمت لپکے۔ وہ بے ساختہ تخت کے قریب کھڑے شاہ بخت کے پیچھے ہو گئی۔

اپنی بے اختیارانہ ہونٹوں پہ در آنے والی مسکراہٹ دباتے ہوئے شاہ بخت آگے بڑھا اور پھرتی سے منچلے بکرے کو پکڑ لیا۔ دونوں کو پکڑ کر دیوار کے ساتھ فاصلے سے ٹھوکے گئے کھونٹوں پر باندھ دیا۔ تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔

”توبہ۔ کس قدر اکھڑ مزاج ہیں یہ غیبت۔“ دانت کچکا کر ٹپو نے اپنے ”شیروں“ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جواب کھونٹے سے بندھ کر معصومیت و مظلومیت کے ٹیکے بٹے ہوئے تھے۔

”ربیعہ تلے میں پانی لے آؤ ان کے لیے۔“

ربیعہ نے برتن لا کر قدرے فاصلے پر رکھ دیا۔ بکرے کچھ پس و پیش سے کام لے رہے تھے۔

”پی لو۔ پی لو۔ بھائی۔“ ٹپو نے ان کے پاس جا کر ان کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے چھا

دی

جس قدر پینا ہو پانی پی لو ان کے ہاتھ سے

آب جنت تو بہت ہوگا یہ پانی پھر کہاں

اس نے بڑے برجستہ سے انداز میں بر محل شعر پڑھا تھا۔ اک فرما ٹی قہقہہ بلند ہوا۔

”گلتا ہے“ کلیات نظیر اکبر آبادی“ تم نے واقعاً گھول کے پی لی ہے۔“ فاضل نے ہنستے ہوئے فقر

کسا۔

”کچھ اور سنو گی؟“ اس کے ہاتھ بدستور بکروں کا بدن سہلا رہے تھے۔ ”کیا خوب کہتے ہیں نظر

بھائی کہ

بے درو ستم گز بے پرواہ بے گل چنچل چٹکلی سی

دل سخت قیامت پھر سا اور باتیں نرم رسی سی

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی بہت خوب کہتے ہیں نظیر۔“ کن انکھوں سے فاضل کا

سمت دیکھتے ہوئے شاہ بخت نے دھیمے انداز میں کہا تھا۔ یکا یک فاضل کو کچھ دیر پہلے کی اپنی بے ساختہ

پناہ لینے والی حرکت یاد آگئی۔ وہ خفیف سی ہو کر چائے کے بہانے کھسک لی۔



جاتی ہوئی شام کی غنشی شفق رنگ شعائیں ”نشاط منزل“ کے عقبی محن کو روشنیوں سے نہلا رہی تھیں۔

ٹپو اور عمران بکروں کی ”ٹہل سیدا“ میں گن تھے نزل اپنے پسندیدہ کام یعنی پیچی کچی سبزیوں کی گوڈ

کر رہی تھی۔ فاضل تخت پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ ربیعہ صبح سے اپنے ”میکے“ گئی ہوئی تھی آخر وہاں بھی

”بقر عید“ کا کچھ اہتمام کرتا تھا۔ امی کچن میں ہانڈی کے لیے مسالا بھون رہی تھیں۔

”ٹپو! تم نے قصائی سے اچھی طرح معاملہ طے کر لیا تھا ناں۔“ انہوں نے کھلے دروازے پر کارنگائی۔

”جی ہاں بے فکر رہیے اس نے اطمینان دلایا ہے کہ ”سورے سرگی دے“ ”نوراں میراں دے وقت

ن آؤں گا سب سے پہلے تہاڑے بکرے کا ٹوں گا بس ”سامان شان“ تیار رکھیو۔ معہ پانچ سو روپوں کے۔“

”ہیں۔ پانچ سو روپے۔“ امی حیرت سے بت بن گئیں۔ ”یہ تو ایک بکرے کی قیمت خرید کا پانچواں حصہ بنتا ہے۔ کیا وہ سونے کی چھری سے ذبح کرے گا؟“ انہوں نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر برہمی اور حیرت کا ملامت اظہار کیا۔

”جانے دیجئے امی!“ سبزی کا ”قلع قلع“ کرتے ہوئے فاضل نے بے پروائی سے کہا۔ ”یہی تو ان کے سیزن ہوتا ہے کبائی کا۔ بقر عید اصل میں آتی ہی قصائیوں اور بھکاریوں کے لیے ہے۔ دونوں کے ارے تیار ہو جاتے ہیں۔“ وہ محن کی ٹونٹی گھول کے سبزی دھو رہی تھی۔

”اے لڑکی! جاؤ میری زوجہ محترمہ کو لے آؤ ”میکے“ سے۔“ ٹپو بکروں کا سنگھار کرنے میں مصروف غا۔

”کس پر جاؤں اور لے کر آؤں۔“ فاضل نے فکر مندی کا اظہار کیا۔

”ہوائی جہاز لے جاؤ یا پھر ٹینک تمہاری مرضی ہے۔“ ٹپو نے حد درجہ سادگی سے مشورہ دیا۔

”مجھے ذرا جلدی ہے۔ میرا خیال ہے ”ایف سکس ٹین“ لے جاتی ہوں۔“ وہ عقبی دروازے کی سمت دھستے ہوئے بولی تھی۔

”ربیعہ۔۔۔ ربیعہ بھی تشریف لے آئے۔ آپ کے سرال میں آپ کی سخت ضرورت محسوس کی جا۔۔۔۔۔“

کھلے دروازے سے بے دھڑک داخل ہو کر جونہی وہ اندر آئی۔ صوفے پر بے تکلفانہ نیم دراز سرگرت کے دھوکے کے مرغولوں میں گم شاہ بخت پر نظر پڑتے ہی اس کی زبان اور قدم دونوں کو بریک لگ گئے۔

”شیخ صاحب کے ہاں گئی ہے کل کے لیے ان کی ”ماسی“ کو بک کرانے کے لیے۔ آئیے تشریف رکھیے۔“ نشست درست کرتے ہوئے اس نے ربیعہ کی عدم موجودگی کی رپورٹ دیتے ہوئے پذیرائی کے لیے کرسی کی سمت اشارہ کیا۔

”نہیں۔ میں چلتی ہوں۔“ وہ یکنخت واپسی کے لیے پلٹی۔

”فاضل!“ اک بھاری رعب دار آواز نے اس کے قدم میخ کی طرح زمین پر گاڑ دیے۔ وہ رک گئی مگر پلٹی نہیں۔ شاہ بخت ڈگ بھر کر اس کے مقابل آن کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال

دیں۔" میرا وجود آپ کے لیے ہزار خنجر و بے زاری کا سبب سبھی مگر آپ اتنے عرصے بعد پہلی دفعہ میرے گھر آئی ہیں۔ اور کچھ نہ سبھی ربیعہ کی سسرالی رشتہ دار ہونے کے ناتے آپ کی مہمان نوازی آپ کا حق بنتا ہے اور میری ذمہ داری۔"

اس کے ناراض ناراض سے روٹھے لہجے کی کاٹ دل ہی دل میں اسے شرمندہ کر گئی۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے شاہ بخت۔ میں آپ سے خائف یا بے زار نہیں ہوں۔" اس نے نگاہ کتر کر کہا۔

"آپ بہت اچھے اور شریف انسان ہیں۔"

"تو کیا۔"

ہم باوقاف تھے اس لیے نظروں سے گر گئے

شاید تمہیں تلاش کسی بے وفا کی تھی

اس نے بڑی برجستگی بڑے سجاوے لطیف سے انداز میں شکایت کی تھی۔ وہ خفت سے سرخ پڑ گئی۔ اور کچھ نہ سوچا تو جواب ہو کر دروازے کی سمت بڑھی۔ "میں چلتی ہوں۔" اس کے دوبارہ روکنے سے قبل وہ دروازہ پار کر چکی تھی۔

گھر آ کر کتنی ہی دیر وہ خالی الذہنی کے عالم میں محن میں ٹپکتی رہی۔ تصور میں امی کا پر زور اصرار۔ ٹیپا کے مضبوط دلائل۔ ربیعہ کا التجائیہ انداز اور زمل اور عمران کے خوش خوش چہرے در آتے رہے۔ وہ سب مل کر اسے اپنی "اڑی" توڑنے پر مجبور کر رہے تھے۔ وقار کی مرتبہ میں سب نے ایک سے بڑھ کر ایک شکایت آمیز تبصرہ کیا تھا مگر اب کے سب "ایک" ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ خود اس کی خودی اس کا من بھی بڑھ بڑھ کر اسے "ہموار" کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ ٹپکتے ٹپکتے معاً اس کی نگاہ اوپر اٹھی۔ اس کے بڑھتے قدموں کو جیسے زمین نے پکڑ لیا۔ وہ دم بخود رہ گئی ریٹنگ سے ٹیک لگائے جانے کب سے وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔



"افوہ۔ یہ حضرت قصائی صاحب آ خر کب تشریف لائیں گے۔" ٹیپو آتش زیر پاہور ہا تھا۔ نونج چکے ہیں۔" وہ اتر اترامند اور بگڑا بگڑا موڈ لیے ماں سے کہہ رہا تھا۔ "عالی حضرت کا ابھی "نورال پراں" کا وقت نہیں آیا۔"

"شرم کرو کچھ۔" امی ناراض ہوئیں۔ "کیوں نیت خراب کر رہے ہو۔ کون سا آٹھ پہر کا روزہ رکھ رہے تم نے۔"

اس نے قربانی کی نیت سے روزہ رکھا تھا۔ دوسری قربانی کے لیے پاپا نے نیت باندھی تھی۔ اتنے سے وقت کے لیے ٹیپو کا بے چینی سے برا حال ہو رہا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے قصائی آیا۔ ذبح کی رسم ادا ہوئی کام کے لیے بلائی گئی "ماسی" کے ہمراہ ربیعہ اور فختل کچن سنبھال چکی تھیں۔ امی ختم کی شیرینی بھجوا اور وصول کر رہی تھیں۔ نزل گوشت کی بو اور صورت دونوں سے الراجک تھی۔ صبح سے کمرہ بند کر کے بیٹھی موسیقی سن رہی تھی۔

"یار۔ اب تو بچ مچ مچلی ہونے لگی ہے، تم دونوں کو اس حلیے میں دیکھ دیکھ کر۔" ٹیپو بیرونی کام بننا کر اندر آیا۔ اور ناک بھوں چڑھا کر بولا۔

دونوں سر سے پیر تک پسینے میں شرابور تھیں۔ گوشت اور خون کی خوشبو جیسے ان میں رچ بس گئی تھی۔ سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے، گوشت کی ڈشز پر ختم وغیرہ دلا کر احباب اور فقرا اور مساکین کو دعوت کے لیے بلایا جا چکا تھا۔ ٹیپو اور عمران گوشت دینے دلانے کے چکروں میں گھن چکر بنے ہوئے تھے۔ آنے والے اور والیوں کو پاپا اور امی ریسو کر رہے تھے۔

"اچھا ہری اپ ناؤ۔ ہمارا کام خلاص۔ اب بجلی سے زیادہ تیزی سے چنچ کرو۔ سب مل کے چلتے ہیں لمبی ڈرائیو پر۔ سیر و تفریح کریں گے، گھومیں گے، عیش کریں گے، گائیں گے، جھومیں گے، ناچیں گے۔" "بس، بس، بس۔" فختل نے ہاتھ روک کر اس کے "سر" توڑ دیے۔ "اب جاگ جاؤ۔ یہاں جواتا آنا جانا لگا ہوا ہے ان کو کون دیکھے گا؟"

"امی اور پاپا سنبھال لیں گے۔ بس تم کھسکنا۔" ٹیپو نے زبردستی اسے واش روم کی سمت دھکیلا۔ ساداسے آسمانی سوتی شلوار قمیص پر سوتی دوپٹہ لیے وہ بڑی سادگی سے تیار ہو کر دروازہ کھول کر زینے کی سمت بڑھی ہی تھی کہ ٹھٹھک کر رک جانا پڑا۔

زینے کے اختتام پر تھوڑے فاصلے کے ساتھ میز کے بند دروازے سے پشت لٹکائے وہ غالباً اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بہت سکون اور تحمل کے ساتھ۔

"عید مبارک ہو۔" فختل کو کچھ تو کہنا تھا۔

"عید کے معنی خوشی کے ہوتے ہیں اور میری عید ابھی نہیں ہوئی۔" فختل نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا، لہجے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت ثبت تھی۔ وہ سر جھکا کر اپنے ہاتھ دیکھنے لگی۔

"فختل! میں آج آپ کو کچھ بتانے آیا ہوں۔" وہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ "میرا ارادہ تھا یہ



اعتراف آپ کو اپنے گھر لاکے اپنا بھرپور استحقاق استعمال کرتے ہوئے کسی بہت خوب صورت خوشبو خوشبو ماحول میں کہوں گا مگر بہر حال سنئے۔“ اس نے..... اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے قطعی لہجہ میں کہا۔ ”آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا ارادہ میرا آج کا نہیں ہے اس کی اساس اسی وقت رکھ دی گئی تھی جب میں نے پہلی بار آپ کو اپنے نئے گھر کے میسر سے دیکھا۔ یہ تقدیر کے کھیل تھے کہ مجھے عرض مدعا میں تاخیر ہو گئی اور آپ وقار حسین کے نصیب کا تارا بن گئیں۔“

اس کے چہرے سے ہویدا خیرت کے آثار شاہ بخت کو عجیب سی شادمانی اور سرشاری کی کیفیت میں جتا کر رہے تھے۔

”فختل! میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کے عشق میں میں رانجھے، مجنوں، فرہاد یا مہینوال کا شاگرد رشید بن گیا تھا اور اس حالت کو پہنچ گیا تھا جس میں ہر کھنی کی آواز ناتواں لیلیٰ کے گلے کی گھنٹیوں کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ نہیں۔ میں نے آپ سے ایسی ہی محبت کی ہے جیسی کہ میرے جیسا بندہ کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ اقرار میں نہیں کروں گا اور نہ ہی کر سکتا ہوں البتہ میں آپ کو ایک یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں بطور شریک زندگی آپ کو با اعتبار باوقار اور شفاف ساتھ فراہم کروں گا۔ میرا یقین کریں۔“ وہ یقین کیوں نہ کرتی شاہ بخت کے پراعتماد لہجے کی گہیرتا اس کے روشن پر خلوص آنکھوں سے پلکتے وارفتہ شعلے اس کے شفاف کھرے چہرے کے بولتے رنگ..... سب کے سب مل کر اسے یقین دلارہے تھے۔ اس کے برقاب جذبول کو اپنی آنچ دے کر پگھلا رہے تھے۔

”فختل آؤ..... کتاب زندگی کا آغاز خوشگوار باب سے کریں۔“ اپنی چوڑی مضبوط ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا کر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا کہہ رہا تھا۔ فختل نے گہرا کر پلکوں کی باڑھ گرائی اور بچکانہ سی بے ساختگی سے دونوں ہاتھ پشت کی طرف لے گئی۔

شاہ بخت شرارت سے ہنس دیا اور ازراہ شرارت ایک لمحے کو دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے چھو کر ہاتھ ہٹا لیے۔ اس کا چہرہ مارے حجاب کے آتشیں ہو گیا۔ شاہ بخت سرشاری سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں..... اب کہو عید مبارک!“

# خواتین ڈائجسٹ میں قسط وار چھپنے والے خوبصورت ناول



Price Rs: 150



Price Rs: 250



Price Rs: 150



Price Rs: 150



Price Rs: 150



Price Rs: 200



Price Rs: 150



Price Rs: 150



Price Rs: 150



Price Rs: 150



Price Rs: 400



Price Rs: 150



Price Rs: 300



Price Rs: 150



Price Rs: 150



Price Rs: 150

خواتین ڈائجسٹ  
اردو بازار کراچی